مقتل میں محبت

اعجاز منگی

پاران ايم ايڇ پنهور انسٽيٽيوٽ آف سنڌ اسٽڊيز، ڄامشورو-

مقتل میں محبت

(اخباری کالموں سے انتخاب)

اعجاز منگی



تمام حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب کا نام: مقتل میں محبت
مصنف: اعجاز منگی
صنف: اخباری کالم
مرتب: مسرور پیرزادہ
پہلی اشاعت: فروری 2018ء
ٹائٹل ڈزائننگ: محمد دانش
کمپیوٹر لے آؤٹ: ندیم احمد سولنگی
پبلشر: امبر پبلیکیشن، کراچی
رابطہ: amberpublications805@gmail.com
فون: 0334-3615403

قیمت: 500.00روپے

Title: Maqtal men Muhabbat
Writer: Aijaz Mangi
Subject: Columns
Compiler: Masroor Pirzado
First Edition: February 2018
Title Designing: Muhammad Danish
Computer Layout: Nadeem Ahmed Solangi
Publisher: Amber Publications, Karachi
amberpublications805@gmail.com
0334-3615403

Price: Rs. 500.00

انتساب

انیتا

کے

نام

فہرست

اقلیم سخن تیری قلم رو سے نہ جائے

اب تو یاد بھی نہیں کب کی بات ہے۔ مہ و سال وقت کی گردش میں گم ہو گئے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اعجاز منگی پہلی ملاقات میں ہی دل میں اتر گئے۔ شائستہ اطوار۔ خاندانی رکھ رکھاؤ اور بے پناہ مطالعے نے انہیں ایسا دھیما لہجہ عطا کیا ہے جو پہلی ملاقات میں ہی دل موہ لیتا ہے۔

سندھ شاید اب واحد معاشرہ ہے جس نے ادب، شاعری اور صحافت کو ایک جگہ اکٹھا کر رکھا ہے۔ سندھی صحافت میں آپ کو ادیب ملیں گے یا شاعر اور سندھی ادب میں آپ کو صحافی ملیں گے یا کالم نویس۔ شاید یہ شیخ ایاز کا اثر ہے۔ جو بے مثال ادیب شاعر اور صحافی تھے اور جنہوں نے ساٹھ برس تک سندھی ادب کے آسمان پر چاندنی بکھیری اور بعد میں آنے والوں کے لیے منارۂ نور بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھی زبان اور قارئین کا کینوس شیخ ایاز کے لیے بہت چھوٹا ہے۔ وہ عالمی سطح کے ادیب اور دانشور تھے۔ لیکن سندھ سے تعلق نے انہیں زمان و مکان کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی قید میں بھی محبوس کر دیا۔ لیکن ان کی محبت دیکھئے وہ سندھ کے پانی میں برف کی ڈلی کی طرح گھلتے رہے۔ سارا سندھو میٹھا کر دیا۔ لیکن خود کو بھول گئے۔ عمر کی آخری برسوں میں البتہ وہ اپنے نظریات سے تائب ہو کر اسلام سے رجوع کر چکے تھے اور ملنے والوں سے کھلم کھلا غلطی کا اعتراف کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ وہ قرآن حکیم کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ یہ بڑے آدمی ہونے کی نشانی تھی اور توبہ قبول

ہونے کی بشارت بھی۔ شیخ ایاز نے سندھ کی جس نسل کو متاثر کیا۔ اعجاز اس کا سب سے تابناک ستارہ ہیں۔

ممکن ہے بعض دوست اس سے اختلاف کریں لیکن میری نظر میں اعجاز نے اپنے بعد آنے والی پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ ان کی سوچ اور قلم کی جولانی ایک سچے، کھرے اور دردمند شخص کی کتھا ہے۔ اعجاز ایک بے مثال قلمکار ہیں مگر عجیب بات ہے کہ وہ لکھتے نہیں مصوری کرتے ہیں۔ ان کا قلم لفظ نہیں اگلتا۔ تصویریں بناتا ہے۔ رنگ برنگی تصویریں۔ میلی کچیلی تصویریں۔ ملگجی اداس تصویریں۔ موتی جیسے جگمگاتے چہرے۔ درد سے بلکتے بچے۔ سنہری دھوپ اور دھانی سائے۔ غربت کی گہری لکیریں ماتھے پہ سجائے محنت کش بوڑھے۔ برسات کے موسم میں جھولے پر پینگیں لیتی وارفتہ لڑکیاں۔ دور دیس میں گم ہونے والوں کی اداس سرمئی یادیں۔ ہم تم کو نہیں بھولے۔ زندگی کی تلخی کو گھونٹ گھونٹ پینے والے نڈھال عوام۔ یخ بستہ کمروں میں قوم کی قسمت کے پانسے پھینکنے والے جواری۔ اعجاز قلم نہیں پکڑتے۔ برش تھامتے ہیں اور جس طرح کی چاہتے ہیں تصویریں بناتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک۔ ایک کے بعد دوسری۔ وہ افلاطون کی طرح خیالی یوٹوپیا نہیں دکھاتے۔ لیکن جس دنیا کی خواہش کرتے ہیں۔ پڑھنے والے کا دل کرتا ہے کہ کاش دنیا ایسی ہی ہوتی۔ کولمبیا کے بے مثل ادیب مارکیز پر تنقید نگاروں نے ایک عجیب الزام لگایا تھا۔ الزام یہ تھا کہ شخص الفاظ سے سحر طاری کرتا ہے۔ اسکی تحریر کا نقص ہے کہ قاری کو ایک خیال سنہری طلسماتی دنیا میں لے جاتا ہے۔ مارکیز کے چاہنے والے آج تک فیصلہ نہیں کرپائے کہ یہ تنقید تھی یا تعریف تنقیص۔ اعجاز کی تحریر میں آپ کو وہ ساری علامتیں نظر آئیں گی جو ایک جادوگر کے منتر میں ہوتی ہیں۔ سچی بات ہے کہ صحافت کی سفاکی بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی بلکہ صحافت اور کالم نویسی کو بہلا پھسلا کر وہ اپنی ڈگر پر لے آئے ہیں۔

اعجاز کے چاہنے والے لاکھوں میں ہیں۔ شاید اپنے معاشرے میں سب سے زیادہ چاہنے والوں کو گھیرا انہیں کے گرد ہے۔ لیکن اس شہرت اور محبت نے انہیں مزید

نرمی اور شائستگی عطا کی ہے۔ وہ جتنے بڑے قلم کار ہیں۔ اتنے ہی اچھے انسان بھی۔ محبت، عزت، دلسوزی اور دلداری سے بھرے ہوئے۔ ایک ایسے شخص جن کے مطالعے نے ان کی شخصیت کو جاذبیت اور ذہن کو روشنی عطا کردی ہے۔ یہ مطالعہ، معاشرے کا بھی ہے۔ انسانوں کا بھی۔ کتابوں کا بھی ہے۔ رویوں کا بھی۔ وہ صرف مطالعے سے نہیں سیکھتے۔ مشاہدے سے بھی جلا پاتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے کہ انہوں نے کس سے زیادہ سیکھا؟ اور یہ بھی کہ انہیں سکھانے والوں کی فہرست کتنی لمبی ہے؟ چاند ستاروں سے لے کر سندھ کے ریگ زاروں تک۔ محمود درویش سے لے کر نزار قابانی تک۔ ارسطو سے لے کر ایلیٹ تک۔ یونانی دیوتاؤں سے لے کر شیخ ایاز تک۔ فطرت اور حقیقت کے سارے مظاہر ان کے استاد ہیں یا دوست۔ اب ایسا آدمی نہیں سیکھے گا تو کیا ہم آپ سیکھیں گے؟

آج کل اخباری صحافت میں عموماً اور ٹیلی ویژن مافیا میں خصوصاً رونمائی کے لیے علم و ادب سے لگاؤ اولڈ اسکول کا کانٹوں بھرا راستہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آپ چرب زبان ہوں۔ بدتمیزی میں مہارت رکھتے ہوں۔ بی جمالو بن سکتے ہوں۔ بھس میں چنگاری ڈالنے پر خوش ہوتے ہوں۔ اور کسی نہ کسی ایجنڈے کو پیسے لے کر آگے بڑھانے کے شوقین ہوں تو آپ سے اچھا صحافی کوئی نہیں۔ اینکر اب بینکر ہیں اور ٹھنکر اب زنگر۔ آج کے صحافی کی سب سے بری خوبی یہ ہے کہ گھنٹوں بولتا رہے یا صفحوں لکھتا رہے۔ مطلب کچھ نہیں نکلتا۔ آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے۔ مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا۔ وہ زمانے لد گئے جب صحافی کہتے تھے کہ موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا۔ اب تو قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں ہے۔ اور ہر دیکھنے والا اس کی بزم سے پریشان ہے۔ لیکن اعجاز اس صف کے صحافی ہیں، جس کا ذوق بیاباں ماندگی سے کم نہیں ہوتا اور جو ہر آزمائش پر نعرہ مارتے ہیں کہ جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر۔ غالب اور اعجاز میں البتہ ایک فرق ہے۔ غالب کو شکایت کہ حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا۔ لیکن اعجاز کا معاملہ ہے کہ حسن کو توجہ میں جرأت آزما پایا۔

بارہا اور بار بار۔۔۔۔ اور کیوں نہ ہو۔ وہ اپنی تحریر کی طرح وجیہہ اور خوشنما ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے تصادم پر ان کی نظریں اور نیت دونوں جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ کردار پاکیزہ ہو تو تحریر شفاف جھرنے کی طرح بہتی ہے۔ ان کے اعجاز رقم ہونے میں صاحب کردار ہونے کا بہت ہاتھ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتے۔ اس سے آگے۔ حد اب۔

رفیق افغان

21-10-2017

پیش لفظ

کاش! میں اس شعر کا اردو ترجمہ کر سکتا کاش! کوئی اس شعر کا اردو ترجمہ کر سکتا کاش! بھٹائی پھر جنم لیتا اور اس شعر کو اردو میں لکھتا:

''ڪنڍي ڪلين وچ ۾، جڏهن هنيائون
موت نہ مارِيائون، ڏور وجهي ويا ڏک جي''

اس شعر کو ترجمے کے تشدد سے گذارا جائے تو ہمیں یہ الفاظ ہاتھ آسکتے ہیں کہ:
''انہوں نے میرے گلپھڑوں میں کانٹا اتارا اور پھر مجھے موت کی گھاٹ اتارنے کے بجائے مجھے درد کی لمبی ڈور ڈال کر چلے گئے''

میں نے سنا ہے کہ مچھیروں کے جال میں ایسی سرکش مچھلیاں بھی آتی ہیں جن کے وجود میں بہت سارے کانٹے چبھے ہوتے ہیں۔ دل ایک ایسی مچھلی ہے۔ اس میں محبتوں کے بہت سے کانٹے پیوست ہوتے ہیں۔ وہ ان سارے کانٹوں کے تیروں کو اپنے وجود میں لیے پانی کی پر پیچ گلیوں میں آوارہ گردی کرتی ہے۔ میرے دل میں پہلا کانٹا وہ عورت تھی جس کو میں نے اپنے بڑے بھائی کی شادی میں دیکھا تھا۔ بڑی آنکھوں اور لمبے والوں والی وہ عورت مجھ سے بہت بڑی تھی۔ وہ جوانی کی آخری سرحد کراس کر رہی تھی اور میں ابھی بچہ تھا۔ مگر وہ عورت ایک خوبصورت کانٹا تھی۔ وہ عورت اس بچے کی نرم دل میں اس طرح پیوست ہو گئی جس طرح ایک تیز چھری مکھن میں پیوست ہو جاتی ہے۔ وہ چھری آج تک وہیں ہے۔

اس احساس کے ساتھ کہ محبت صرف ماں سے نہیں ہوتی۔ محبت ان بچوں کی ماں سے بھی ہوتی ہے، جس کا شوہر اس کو راتوں کو اکثر مارتا ہے اور اس عورت سے بھی جس کا شوہر اسے دیوانہ وار پیار کرتا ہے۔ شادی شدہ عورتوں سے محبت اتنی شدید کیوں ہوتی ہے؟ حسین

عورتوں کو دیکھ کر بچے جلد بڑے ہونے لگتے ہیں۔ماں کی چھاتیوں سے دودھ اور محبوبہ کی چھاتیوں سے پسینہ پینے تک مرد کا سفر۔ محبت کا سفر ہے۔پیشانی چومنے سے زبانوں کے بوسے تک محبت کا سفر۔ بہت مہربان اور بیحد پریشان ہے۔لفظ سے لیکر لمس تک اور لمس سے لیکر لفظ تک احساس کا سفر رواں دواں رہتا ہے ان دریاؤں کی طرح جو کنوارے پربتوں کے درمیاں بہتے رہتے ہیں۔ان دریاؤں کو آج تک پرندوں کے علاوہ اور کسی نے نہیں دیکھا۔

اس بات کا احساس مجھے آج ہو رہا ہے کہ غربت انسانوں کو فطرت کے قریب لاتی ہے۔سوندھی مٹی پر بارش کس طرح گرتی ہے؟سیاہ رات میں بجلی کس طرح کڑکتی ہے؟سرد راتوں میں چھت کس طرح ٹپکتی ہے؟ کس طرح درختوں پر موسم خزاں آتی ہے؟ کس طرح ہریالی زرد ہو جاتی ہے؟ کس طرح شام کی سیاہی بہت جلد بکھر جاتی ہے؟ افسوس شہر کے ان بچوں پر جنہوں نے گاؤں نہیں دیکھے۔ گاؤں صرف ایک منظر نہیں۔ گاؤں ایک مشک بھی ہے۔ گاؤں صرف اک رشتہ نہیں۔ گاؤں ایک عشق بھی ہے۔ گاؤں ایک لفظ نہیں۔ گاؤں ایک کہانی ہے۔ ایک داستان۔ بہت ساری کہانیوں کا مجموعہ۔ ایک ناول۔ ایک نظم۔ اور وہ بھی نامکمل!! پہاڑی گاؤں بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ وہاں مسلسل بارش برستی ہے۔ وہاں بہت سردی ہوتی ہے۔ وہاں پانی آنسوؤں کی طرح صاف شفاف ہوتا ہے۔ وہاں لکڑی کے مکانوں سے دھواں آہستہ آہستہ نکلتا ہے۔ کھڑکی کھولتے برفانی صبح کا منظر بہت حسین ہوتا ہے۔ مگر میدانی گاؤں میں ایک الگ حسن ہوتا ہے۔مٹیالی ندی کا حسن۔ میلی سی لڑکی کا حسن۔ تیز ہوا کا حسن۔ گرم دھوپ کا حسن۔ اڑتی ریت کا حسن۔ پسینے کا حسن۔ نیند نہ آنے کا حسن۔ طویل دن اور مختصر رات کا حسن۔ بدنام کرنے والی بات کا حسن!! میدانی گاؤں کی شام صبح سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ جب آسماں کا رنگ گہرا نارنجی ہو جاتا ہے اور اس میں سیاہ رنگ کے پرندے اسکولی بچوں کی طرح شور مچاتے ہوئے گذرتے ہیں۔ جب مویشی کھیتوں سے واپس لوٹتے ہیں۔ جب دھول میں تازہ گھاس کی خوشبو گھل جاتی ہے۔ جب کسان کی بیوی گیلی لکڑیوں سے آگ جلاتے ہوئے تھک جاتی ہے۔ جب بھینس کے تھنوں سے سفید دودھ کے گرم پھوارے پھوٹتے ہیں۔ جب رات ہوتے ہی آسمان بہت سارے ستاروں سے بھر جاتا ہے۔ جب رات کو دیر سے لگتا ہے کہ تارے آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور چاند لاپرواہی کے ساتھ اپنے راستے پر چلتا جاتا ہے۔ جب گرم راتوں میں گیدڑ پہلا ٹھٹھہ لگاتا

ہے۔ جب سرد اور سیاہ رات میں زندگی کی پہلی محبت محسوس ہوتی ہے۔ جب بجھی ہوئی آگ کے گرم راکھ کے قریب ایک بلی چکر لگاتی ہے۔ جب نو بیاہے جوڑے کی چارپائی رات کے راز فاش کرنے لگتی ہے۔ جب سرد صبح میں گیلی بالوں والی عورت چائے بناتی ہے۔ جب کتا تنگ کرنے والی مرغی کے پیچھے بھونکتے ہوئے بھاگتا ہے۔ جب بوڑھی عورت ماٹی میں مکھن بنانے کے لیے "مانداھانی" چلاتی ہے۔ جب چھوٹا بچہ گھٹنوں گھٹنوں چلتے ہوئے صحن میں آجاتا ہے۔ جب سورج نکل آتا ہے اور پھر بھی ایک نوجوان رضائی اوڑھ کر سویا رہتا ہے۔ جب وقت رکنا چاہتا ہے مگر نہیں رک پاتا۔ تب یادیں رہ جاتی ہے۔ دل کے وجود میں پیوست کانٹوں کی طرح!! تو ہم تذکرہ کر رہے تھے ان لڑکوں کا جو خوبصورت عورتوں کو دیکھ کر جلد بڑے ہونے لگتے ہیں۔ وہ لڑکے جن کی جوانی سرسوں کے کھیت کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ ان کے گالوں پر ابھرتے ہوئے نرم بالوں کی رو آگ جیسی ہوتی ہے۔ اس عمر کے لڑکوں سے گاؤں کی شوقین عورت کتنی شرارتیں کرتی ہیں۔

گاؤں کے پانی میں عجیب بو ہوتی ہے۔ اس کا ذائقہ پہلے بوسے کی طرح بھلایا نہیں جاسکتا۔ گاؤں انگنت محبتوں کا مجموعہ ہے۔ شہروں کا اپنا حسن ہے۔ بہت مصنوعی مگر پھر بھی دلکش۔ دھویں سے لپٹی ہوئی صبح اور چمکتی ہوئی کار میں بیٹھی ایک اداس عورت۔ کڑک چائے اور بھیگا ہوا اخبار۔ سیفد چشمہ اور خشک بالوں والا ایک غیر ملکی۔ اسکول جاتا ہوا ایک ناراض بچہ۔ ہسپتال سے واپس آتی ہوئی ایک نیند کی ماری نرس۔ ایف ایم پر مسلسل باتیں کرنے والا نوجوان۔ ایک نئے ماڈل کی کار۔ ایک پرانا انگلش گیت۔ گھسی پٹی سیاست سے بھری اخبارات کا بوجھ اٹھانے والا کمزور جسم والا ہاکر۔ اور پھر شام! شہر کی ڈپریسیڈ شام۔ ٹرنکولائیزر گولیوں جیسی روشنیاں اور دبائے ہوئے جذبات جیسی ٹریفک جام! اور شاپنگ سینٹرز پر لوگوں کا رش۔ میک اپ کا ماسک پہن کر اپنے منہ مسکرانے والی عورتیں۔ اور انہیں تاڑنے والے مرد۔ رنگین راتوں کا سلسلہ۔ اور رات کے پچھلے پہر سخت تکلیف کے بعد سکون سے سانس لیتی ہوئی شہر کی سڑکیں اور کبھی کبھار اچانک محکمہ موسمیات کو غلط ثابت کرنے والے مون سون کے باوجود لوڈشیڈنگ کے باوجود کوئی اندھیرا بھی اچھا لگنا۔ میں آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ شہر کے مرد زیادہ ذہین ہوتے ہیں یا عورتیں؟ مجھے یقین ہے کہ شہر عورتوں کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں۔ شہر ایک چالاک مگر غمزدہ عورت کا آئینہ

ہے۔ شہر ایک مغرور جسم فروش عورت کا فون نمبر ہے۔ شہر شطرنج کا کھیل ہے۔ شہروں میں بسنے والے دل سے سوچتے اور دماغ سے محسوس کرتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ شہروں میں بسنے والے شاعری کس طرح کرتے ہیں؟ شہر تو بازار ہے۔ ایک ایسا بازار جہاں لوگ بستے بھی ہیں۔ اس بازار سے میں اس طرح گذرا ہوں جس طرح دوستووسکی کا وہ کردار جو اپنا میلا، پرانا اور پھٹی ہوئی جیبوں والا اوور کوٹ پہن کر پرانے پیٹرس برگ کی بازار میں صرف یہ دیکھنے کے لیے گذرتا تھا کہ آج کیا بکا اور کیا بچا؟

یہ کتاب ان چند کالموں کا مجموعہ ہیں۔ وہ کالم جو کانٹوں کی طرح میرے دل میں پیوست تھے۔ میں نے قلم کی سوئی سے ایک ایک کانٹا بڑی تکلیف سے نکالا ہے۔ اس کتاب کا ہر کالم ایک کہانی ہے۔ ایک ناول کا پلاٹ ہے۔ میں ایک کالم نگار نہیں ہوں۔ میں ایک ناکام ناول نگار ہوں۔ ایک کامیاب کالم نگار اور ایک ناکام ناول نگار کے درمیاں ایک اخبار کا پریس مسلسل شور کرتا رہتا ہے۔ میں نے یہ سارے کالم بے ہنگم آوازوں کے شور میں لکھے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ شور کے دل میں موجود خاموشی کو تلاش کروں۔ میرا ہر کالم ایک کوشش ہے۔ دراصل میں نے کالم لکھنے کی کوشش میں کوشش کی تھی کہ میں وہ بات بیان کروں جو میں ابھی تک نہیں کرپایا۔ یہ کالم اس لیے نہیں لکھے گئے کہ اس کو کسی کتاب کی صورت دی جائے۔ کتاب ایک امانت ہوتی ہے۔ میرا ہر کالم ایک خیانت ہے۔ میرا ہر کالم اس قرض کی ایک قسط ہے جو قرض کبھی ادا نہیں ہوپائے گا۔ میں ایک مقروض مصنف ہوں۔ اس کتاب میں وہ بہت سارے کالم نہیں ہیں جو میں نے لکھنے چاہے اور نہ لکھ پایا۔ وہ کالم جو قلم کے تیر اور کاغذ کی کمان سے شکار نہ ہو پائے۔ وہ کالم اندھیری رات میں اڑتے ہوئے پرندوں جیسے تھے۔ وہ کالم ان درندوں جیسے تھے جن کے دل بہت دکھی ہوتے ہیں۔ وہ کالم ان مچھلیوں جیسے تھے جو بہت سارے قلموں کے کانٹے اور سوچ کی ڈور کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں۔ وہ مچھلیاں جو کسی کے ہاتھ نہیں آتیں۔ وہ مچھلیاں جو دریا میں درد کے ساتھ سفر کرتی ہیں۔ یہ کالم نگار یہ اداس مچھیرا۔ شام کے دوشالے میں دور جامشورو سے لوٹ رہا ہے۔ سورج ایک مصور ہے اور دریائے سندھ ایک کینوس۔ شام کے رنگ اتنے کچے کیوں ہوتے ہیں؟

اعجاز منگی

اعجاز منگی کی کتاب

یہ میرا پرانا خواب تھا کہ میرے ہاتھوں میں وہ کتاب ہو جس میں اعجاز منگی کی شاعرانہ نثر میں لکھے ہوئے کالم ہوں۔ یہ خواب آج پورا ہو گیا۔

میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت محسوس کر رہا ہوں کہ اس کتاب کو میں ہی چھپوا رہا ہوں اور منتقل کر رہا ہوں ان ہزاروں لوگوں میں جو اعجاز کے کالموں کے مشتاق ہیں۔ اور آج جب یہ کتاب چھپ رہی ہے تو مجھے یاد آ رہے ہیں وہ سارے دن اور راتیں جو کئی برسوں سے وقفہ وقفہ سے آئے جس میں میں اعجاز کو کہا کرتا تھا کہ: "مجھے اجازت دو کہ میں تمہاری کتابیں شایع کروں۔" اور ہر بار اعجاز کسی نہ کسی بہانے سے ٹال دیا کرتا۔ اگر میرا بس چلتا تو اعجاز کی پہلی کتاب کم از کم دس برس پہلے چھپوا چکا ہوتا۔

مجھے یاد ہیں وہ پرائمری اسکول کے دن جب اسکول میں جادوگر آیا کرتا تھا۔ اور اپنے جادو سے ہم سب بچوں کو حیران کر دیا کرتا تھا۔ میں آج بھی اس حیرانگی والی کیفیت میں آجاتا ہوں جب اعجاز منگی کی جادوئی تحریریں پڑھتا ہوں۔

مجھے یاد ہیں وہ بارشیں جن میں بھیگتے ہوئے اپنے اندر کی دھول بھی صاف ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ ایسی ہی کیفیت اب بھی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے جب میں اس شاعر کی نثری تحریریں پڑھتا ہوں جو باتوں کی بارش میں میرے من کو بھگو لیتا ہے اور من کا میل دھل جاتا ہے۔

اعجاز منگی نے جب سندھی اخبارات کے لیے لکھنا شروع کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب

سے زیادہ مقبول رائیٹر بن گیا۔ اس کے کالموں کو پڑھنے والے محبوب کے خطوط کی طرح سینے سے لگائے رکھتے تھے اور ان کی کٹنگز کر کے فائل بناتے تھے۔ کئی بار تو ایسا بھی دیکھا گیا کہ اخبار کے ہاکر یہ کہہ کر اخبار بیچا کرتے تھے کہ: "اخبار لے لو، اعجاز منگی کا کالم بھی ہے۔"

ایک دفعہ سندھ کے کسی شہر میں کسی سیاسی جلسے میں ایک صاحب نے تقریر کے دوران کہا تھا کہ "کیا سندھ کی صورتحال نہیں بدلے گی؟ کیا ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا کہ یہاں کوئی مسئلہ ہو گا اور دوسرے روز ہم اخبار میں ہم اس مسئلے پر اعجاز منگی کا کالم پڑھیں گے اور بس۔۔۔؟؟"

اعجاز کی تحریر اس طرح پرکشش ہے جس طرح کسی خوبصورت انسان کی مسکراہٹ، جیسے بارش کے بعد مٹی کی خوشبو، جیسے کسی لوک فنکار کی سریلی صدا، جیسے کسی معصوم بچے کی ہنسی۔

اعجاز کے نثر کی تاثیر اتنی شاعرانہ ہے جتنی بعض شاعروں کی شاعری کی بھی نہیں ہوتی۔ اعجاز کی تحریر پڑھنے کے بعد قاری اس شاعرانہ محسوسات کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جہاں ہر چیز خوبصورت اور رومانوی نظر آتی ہے۔

میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس کتاب کو بہت جلدی میں اور کم وقت میں مرتب کیا گیا ہے۔ شاید اس میں غلطیاں ہوں لیکن پہلے پیار میں غلطیاں ہوتی ہیں اور جس پیار میں غلطی نہ ہو وہ بھلا پیار ہی کیا!!

میں یہاں اپنے پیارے دوست، مصنف، صحافی خرم سہیل کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے کتاب کو چھپنے سے پہلے دیکھا اور بہتر تجاویز بھی دیں۔

یہ اعجاز منگی کے کالم روزنامہ "امت" میں شایع ہوئے تھے، جس کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد ان کے کالموں سے انتخاب کی زیادہ کتابیں شایع کریں گے۔ آپ کا ساتھ چاہیے۔ آپ ہمیں بہتر تجاویز دیں، اعجاز کے کالم بھیجیں اور جو بھی آپ کے دل میں ہو وہ ہمیں بتائیں۔ ہم سے رابطے کے لیے یہ نمبر اور ایڈریس ہیں۔

masroor pirzado@ yahoo.com
0334-3615403
امبر پبلی کیشنز، کراچی
amberpublications805@gmail.com

مسرور پیرزادو

اجرک

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ چینی سیاح شیوسانگ سندھ کے کوٹیشور ساحل پر اترا۔ اس وقت موسم کون سا تھا؟ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ مگر وہ شام کا وقت تھا اور دراوڑ عورت کے جسم جیسی سمندر کی لہروں پر ڈھلتا ہوا سورج کسی غدار کے بوسے کی طرح نظر آرہا تھا۔

شیوسانگ نے ایک شاعر سے پوچھا کہ ”کیا اس دیس کا نام سندھ ہے؟“

شاعر نے جواب دیا ”ہاں اس دیس کا نام سندھ ہے“

شیوسانگ نے پوچھا کہ ”میں نے سنا ہے کہ اس دھرتی کے درختوں میں سونے کے بیر اگتے ہیں؟“

شاعر نے جواب دیا کہ ”تم نے ٹھیک سنا ہے۔ یہاں کے درختوں میں سونے کے بیر اگتے ہیں۔ مگر میں تمہیں بتاؤں کہ تھر کی ریباری عورتوں کے گال اس سونے سے کہیں زیادہ سنہرے ہیں اور جب شام کے سورج کی کرنیں ریت پر مچلتی ہیں تو پورا صحرا سونا ہو جاتا ہے“

شیوسانگ نے پوچھا کہ ”میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہاں بہت عمدہ ریشم بنتا ہے“

شاعر نے جواب دیا کہ ”ہاں۔ مگر جب سومریاں ”سومرا گھاٹ“ پر پانی بھرنے کے بعد بیٹھ جاتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے ریشم کے تھان کھول دیے ہیں“

شیوسانگ نے کچھ گھبراتے ہوئے کہا کہ ”میں نے سنا ہے کہ یہاں ”جکڑیاں“ گیت گائے جاتے ہیں۔ وہ گیت کہیں مجھے جکڑ تو نہیں لینگے؟ مجھے اپنے دیس واپس جانا ہے“

شاعر نے شیو سانگ سے کہا کہ "ہاں۔ وہ تمہیں جکڑ لینگے۔ اور اگر تم نے اپنے آپ کو آزاد کر بھی لیا اور واپس بھی لوٹ گئے، تب بھی تیرا دل یہاں جکڑا رہے گا"

کہتے ہیں یہ سن کر چینی سیاح شیو سانگ واپس چلا گیا۔ شام کے وقت۔ جب سمندر پر غروب ہوتا ہوا سورج، غدار کے بوسے کی طرح نظر آرہا تھا۔

"راج گھاٹ پر چاند" میں تاریخ کا یہ افسانوی واقعہ پڑھنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ حیرت ہے کہ شیو سانگ نے شاعر سے اس اجرک کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا، جو سندھ کا تہذیبی پرچم ہے۔

اگر شیو سانگ شاعرِ سندھ سے اجرک کے بارے میں یہ پوچھتا کہ "میں نے سنا ہے کہ یہاں پر ایک چیز کو اجرک بھی کہا جاتا ہے! وہ کیا ہے؟"

تو شاعر اسے ضرور کہتا کہ "یہ وہ لباس ہے، جو ہمیں مہد میں ملتا ہے اور لحد تک ہمارے ساتھ چلتا ہے۔

جب ایک لڑکی عمر کے اس راستے پر قدم رکھتی ہے جہاں اس کے جسم کی انگڑائیاں بولنے لگتی ہیں تو اس کی ماں اس کے سر پر ایک سفید ستاروں والی ایک سرخ شال رکھتی ہے، جس کو ہماری زبان میں اجرک کہا جاتا ہے۔ وہ اجرک اس کا پہلا پردہ ہوتا ہے۔ وہ اجرک اس لڑکی کا بہت کچھ چھپا لیتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی وہ ادائیں بھی، جن کے سہارے وہ اپنے جیون ساتھی کی چوری چوری تلاش کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی وہ باتیں اس اجرک کے سائے میں اس دنیا سے چھپی رہتی ہیں، جو باتیں صرف آنکھیں ہی سمجھتی ہیں۔ اور جب سرد راتوں میں وہ اپنے محبوب سے ملنے جاتی ہے تو یہ اجرک اس کو موسم اور ماحول سے محفوظ رکھتی ہے۔ اور اگر اس کی محبت کے مقدر میں کلہاڑی لکھی ہوتی ہے تو یہی اجرک اس کی لاش کو ڈھانپتی ہے، جس کو "کاری" کہا جاتا ہے۔ لیکن اس دیس میں ہر محبت کرنے والی لڑکی "کاری" نہیں بنتی۔ وہ لڑکیاں جو اپنے جذبات کو امید کے سہارے سنبھال لیتی ہیں، مگر جب چاندنی راتوں میں انہیں انگلی میں پہنا ہوا پیار کا چھلا کاٹنے لگتا ہے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں تو وہ آنسو ان کی اجرک میں جذب ہو جاتے ہیں۔

اور جب اس دیس کی لڑکیوں کو اپنے بابل کا آنگن چھوڑ کر پیا کے دیس جانا پڑتا ہے تو

باپ کی اجرک اس کے سر پر شفقت کے سائے کی طرح اس اعتماد کے ساتھ جھولتی ہے، جیسے وہ اسے زندگی کی ہر سردی اور گرمی سے محفوظ رکھے گی۔ وہ اجرک جس کو لپیٹ کر چیل جیسی چبھتی آنکھوں سے مار پیٹ اور پیار محبت کے نشان چھپا لیتی ہے۔ اور جب اس کو لگتا ہے کہ وہ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں اکیلی ہے تو وہ اجرک اوڑھ کر گاؤں میں پیر کے مزار پر جاتی ہے اور وہاں اسی اجرک کے کونے سے ایک ٹکڑا اپھاڑ کر منت کے طور پر مزار کے درخت کی ٹہنی سے باندھ دیتی ہے۔ اور پھر جب امید اس کے وجود میں آشیانہ بناتی ہے تو وہ اسی اجرک سے اسے نظر بد سے چھپا کر چلتی ہے۔ پھر ایک دن اس کی گود میں ایک ستارہ چمکتا ہے اور مندیں ہوئی آنکھوں اور بھنچیں ہوئی مٹھیوں والا ایک بچہ اس کے بانہوں میں "مبارک" کے ساتھ دیا جاتا ہے، جس کو وہ اجرک میں لپیٹ کر سینے سے لگاتی ہے۔ اور وہ بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے اور اس کے چہرے پر جوانی کی بہار بھورے بالوں کے ساتھ آگ کی لو کی طرح لہراتی ہے اور اس کے قدم زمین پر ترتیب کے ساتھ نہیں پڑتے، تب وہ اپنے کندھوں پر اجرک کو ایک ایسی خاص اسٹائل کے ساتھ رکھتا ہے کہ اس کے کندھے پر رکھی ہوئی مست کلہاڑی کسی کو نظر نہ آئے۔ یہ وہی اجرک ہوتی ہے جس کو ڈور بنا کر کسی شرمیلی لڑکی کو اپنے اور کھینچتا ہے۔ جب وہ فراق کے موسم میں کسی درخت کے سائے میں اکیلا بیٹھتا ہے تو اسی اجرک کو اپنی پیٹھ اور گھٹنوں سے "کانبھ" کی طرح باندھ کر سوچتا ہے کہ وہ کیا کرے؟ اس کو بھگا کر یہ گاؤں چھوڑ جائے یا فقیر بن جائے؟

پھر جب وہ دولہا بنتا ہے تو اس کے کندھوں میں ایک اجرک ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ اجرک جس کے سائے میں وہ اپنی عزت اور محبت کو لے آتا ہے اور پھر اپنا گھر بناتا ہے۔ جب گھر بنانے کی محنت کے دوران اس کا پسینہ بہتا ہے تو وہ اس کو اسی اجرک سے خشک کرتا ہے۔

اس کی وہی اجرک اپنے خلاف ہونے والے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست بن کر وڈیرے کے پیروں پر گرتی ہے اور وڈیرہ اسی اجرک کو روند کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی میلی اجرک کو جھاڑ کر اپنے شانوں پر رکھتا ہے اور کھانا کھائے بغیر گھر کے آنگن میں وہی اجرک لپیٹ کر لیٹ جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ اب وہ کیا کرے؟ اگر اس کے مزاج میں

گرمی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے تو وہ گاؤں بدل دیتا ہے اور اسی اجرک کو نقاب بنا کر ایک رات اپنے گاؤں میں داخل ہوتا ہے اور چوکیدار کو کہہ جاتا ہے کہ "سنو! اپنے وڈیرے سے کہہ دینا کہ موت اور مہمان اچانک آتے ہیں، میں بھی کسی دن موت بن کر اس کا مہمان بنوں گا۔"

لیکن اگر اس کی طبیعت میں ترشی نہیں ہوتی وہ وڈیرے کو سمجھانے اور اپنا حق لینے کے لیے بادشاہ سلامت کے راستے میں اسی اجرک کو بچھونا بنا کر فریادی فقیر کی طرح بیٹھ جاتا ہے!" اجرک کی اس طویل کتھا کو صبر کے ساتھ سنتے ہوئے اگر شیو سانگ شاعرِ سندھ سے پوچھ لیتا کہ "پھر کیا ہوتا ہے؟"

تو شاعرِ سندھ اس کو ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اسے بتاتا کہ "پھر وہی ہوتا ہے جو فقیروں اور بادشاہوں کے درمیان ہوتا رہتا ہے۔ نہ فقیر کو یہ اجازت ملتی ہے کہ وہ بادشاہ سلامت کی حضور میں اپنی فریاد پیش کرے اور نہ بادشاہ کی نظر سراپا فریاد بنے ہوئے فقیر پر جاتی ہے۔ پھر ایک دن وہ فقیر اس بادشاہ سے مایوس ہو کر خدا کی دربار میں فریاد لے جانے کے لیے اس دنیا کو چھوڑ جاتا ہے، اور اس کے جسد خاکی پر وہی اجرک ڈالی جاتی ہے، جس کا پلو ہٹا کر لوگ دیکھتے ہیں کہ "کس کی لاش ہے؟"

مگر نہ تو چینی سیاح شیو سانگ نے شاعرِ سندھ سے اجرک کے بارے میں پوچھا اور نہ اس نے اسے کچھ کہا۔ اس لیے تاریخ میں یہ بات بیان ہونے سے بچ گئی۔

اس دن جب کراچی پریس کلب کے سامنے ایک وڈیرے کے ظلم کے خلاف بھوک ہڑتال پر بیٹھا ہوا ہاری مر گیا اور میڈیا کے خوف سے وزراء پشیمانی اور پریشانی کے ساتھ دوڑے آئے، تب مجھ سمیت بہت سارے افراد کو اس سانحہ پر "پیرِ شہر" کی پراسرار خاموشی کے حوالے سے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

اور حیرت تو مجھے اس وقت بھی نہیں ہوئی جب انصاف کے لیے بھوک میں بلک کر مر جانے والے ولی داد کے جنازے پر پڑی ہوئی اجرک ہوا میں جھول رہی تھی۔

مجھے صرف افسوس ہوا، اس بات کا کہ صدیاں بیت گئی ہیں مگر نہ اجرک کا رنگ تبدیل ہوا ہے اور نہ بادشاہوں کا ڈھنگ اور نہ سندھیوں کے سنگِ قسمت کا سلوک۔

پانی کا گیت

دریائے سندھ میں طغیانی کا موسم ہے اور کچے کے گاؤں خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ جو پہلے بیل گاڑیوں پر بیٹھ کر دریا کی سطح سے بلند دیہاتوں میں جایا کرتے تھے اب وہ چنگچیوں پر چڑھ کر ان چھوٹے چھوٹے شہروں کا رخ کر کر رہے ہیں جہاں انہیں کوئی نہیں جانتا۔ ''دریا تو وہی ہے مگر انسان کس قدر بدل گئے ہیں؟'' سفید بالوں اور ٹوٹے ہوئے دانتوں والی وہ بوڑھی عورت یہ بات سوچتے ہوئے اپنے میلے پرانے دوپٹے کی اوٹ سے لوٹ رہی ہے اس وقت کی طرف جو لہروں کی طرح بہت آگے نکل گیا۔ دریا تو ہمیشہ موسم گرما میں بھرتے ہیں اس لیے پہلے دیہاتوں کے لوگ اپنی سالانہ نقل مکانی رات کے وقت کیا کرتے تھے۔ اب تو ان مناظر کو پینٹ کرنے والے مصور بھی نہیں جن کے رنگ ہمیں رلایا کرتے تھے۔ جو ہمیں دکھایا کرتے تھے اس مسافر خاندان کا منظر جس میں مرد اپنی دونوں ٹانگیں لٹکا کر بیل گاڑی کو چلا رہا ہے۔ بیل گاڑی میں اس کی بوڑھی ماں، جوان بیوی دو تین بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ بڑا بچہ درختوں پر ابھرے ہوئے چاند کو اپنے ساتھ چلتے ہوئے دیکھتا ہے اور ہلکی سے گرد میں ان کا کتا ان کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوتا ہے۔ آسمان میں آوارہ بدلی کچھ دیر کے لیے چاند کو چھپا لیتی ہے تو بچہ اداس سا ہو جاتا ہے پھر وہی چاند اور وہی کراہ کر چلنے والی بیل گاڑی اور وہی نیم تاریکی میں ڈھکے ہوئے گاؤں جہاں کبھی کبھار کسی من چلے کسان کا دیہاتی گیت بلند سروں میں سننے میں آتا جو دریا کو گمنام شاعر کے الفاظ میں کہتا کہ:

''اے دریا
میرے دیوانے یار
کس کی محبت میں
مست ہوا ہے تو۔۔۔''

محبت کا لفظ سن کر کوئی مسکرانے لگتا ہے اور کسی کی آنکھ میں پانی بھر آتا ہے۔ وہ بوڑھی عورت جو محبت کا لفظ سن کر مسکراتی ہے اب وہ کہیں بھی نہیں۔ دریا اس کی قبر کو بھی بہا لے گیا۔ قبرستانوں کو کھیت بنانے والے کچے کے مجرم وڈیروں کے ہلوں نے تو اس کی ہڈیاں بھی بکھیر دیں مگر جو نوجوان عورت آتش عشق میں جل رہی تھی وہ اب بوڑھی ہوگئی ہے اور معصوم بچے کے ہونٹوں سے چاہت کا پکا پختہ نغمہ سن کر مسکراتی ہے۔ مگر اب اس کی بہو نہیں روتی۔ کیوں کہ وہ کچے کو جزیرہ نما جیل سمجھتی ہے۔ اسے بہت بڑی خواہش ہے کہ وہ شہر میں اپنا گھر بسا لے۔ جہاں عورتیں چادر پہن کر بازار جاتیں ہیں۔ جہاں وہ خریدتی کم ہیں اور بیچتی زیادہ ہیں۔ مگر افسوس کہ ماضی اور حال کی دو لہروں کے لہراتے ہوئے تصادم میں رشتوں ناتوں کے ٹوٹتے ہوئے تانے بانے کو اپنے قلم کی سوئی سے سینے والی کوئی ایسا ادیبہ نہیں جو قرت العین حیدر کے مانند معاشرتی محبتوں کے نثری نوحے لکھے۔ اب سب بکتا ہے۔ مگر یہ فیصلہ کون کرے کہ پہلے انسان بدلے یا وہ ادبی تصورات جو اب بازار میں اپنا دام مانگ رہے ہیں۔ پورے ملک کی طرح سندھ بھی تبدیل ہو رہا ہے مگر ہر تبدیلی ترقی نہیں ہوتی۔ تنزلی والی اس تبدیلی میں سندھ کو بھی چند الیکٹرانک کھلونے دے کر اس سے وہ ماں چھین لی گئی ہے جو اسے لوریاں سنایا کرتی تھی۔ جو ایسی کبھی نہ ختم ہونے والی کہانیاں بیان کیا کرتی تھیں، جو سنتے ہوئے چھوٹے بچوں کو بڑی بڑی باتیں بھی سمجھ میں آجایا کرتی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ انہیں موسم گرما کی لگتی ہوئی لو میں نیند بھی آجایا کرتی تھی۔ اب موبائل فون کے دور میں نہ تو اہلیان سندھ کی نسل نو کو نہ تو سمجھ آتی ہے اور نہ نیند!!

اس سندھ کو تلاش کرنے کی اب پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جو سندھ وقت کی ہواؤں میں پیپل کے سوکھے ہوئے پتے کی طرح کہیں کھو گیا ہے۔ وہ سندھ جس کو

بیحد محبت کے ساتھ سمجھاتے ہوئے شاہ لطیف نے فرمایا کرتے تھے کہ "جب تک کناروں پر خطرہ ہے تب تک سکون کے ساتھ مت سونا" آج دریائے سندھ کے اکثر کنارے پانی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث کانپ رہے ہیں۔ مگر سندھ اپنی سرکار کے ساتھ سو رہا ہے۔ یہی تو وہ نیند تھی جس میں سوتے ہوئے سندھ کو دو برس قبل سیلاب بہا کر لے گیا تھا۔ وہ سندھ جو اپنے ماضی میں ایک امیر سرزمین ہوا کرتی تھی جہاں خوبصورت اور صحتمند گھوڑے اور مضبوط گاڑیاں، بالیوں کے حوالے سے عورت کے کانوں میں اور فصل کی صورت کھیتوں کھلیانوں میں سونا ہی سونا نظر آیا کرتا تھا اور قدیم دور کے چینی اور یونانی مورخ اس حسن کو خوبصورت الفاظ میں پیش کیا کرتے تھے وہ سندھ آج ایسے زخموں کی صورت نظر آتا ہے جن کا کوئی مسیحا نہ ہو۔

اس سندھ کا روز اول سے مکمل انحصار پانی پر ہی رہتا آیا ہے۔ اس لیے سندھ کی تاریخ اور ادب میں پانی کے گیتوں کو سب سے زیادہ پیار کے ساتھ گایا جاتا رہا ہے۔ وہ پانی جو آسمان سے بارش کی صورت اترتا ہے یا وہ پانی جو دریا کی لہریں بن کر ان انسانوں تک آتا ہے جو سیلابی موسم کے دوراں غیض و غضب میں آئے ہوئے دریا سے بچنے کے لیے دکھ اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنے کچے کے گاؤں چھوڑ کر جایا کرتے تھے اور اپنے خالی مکانوں کو بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھتے ہوئے خاموش زبان سے یہ وعدے کیا کرتے تھے کہ "جب پانی کی سطح کم ہوگی تو ہم لوٹ آئیں گے اور گیلی دھرتی میں بیج بوئیں گے اور خوشیوں کی فصل کاٹیں گے۔ تب تک الوداع! اے سنسناتے ہوئے جنگل الوداع! ہمارے تاریک دل میں تیرے جگنوؤں کی جوت ہمیشہ جلتی رہے گی۔ ہماری آنکھوں میں تب تک نمناکی کے ڈیرے ہونگے جب تک سارا پانی نہ سوکھے۔ کچے کے سندھ کے لیے سیلاب اس دو دھاری تلوار کی طرح ہے جس کی ایک دھار میں میں غم اور دوسری میں خوشی پنہاں ہوا کرتی ہے۔ جب تک دریا اپنی لہروں سے پیاسی دھرتی کو سیراب نہیں کرتا تب تک وہ دھرتی اپنے بھوکے بچوں کا پیٹ نہیں بھرتی۔ اس لیے دریائے سندھ میں سیلابی پانی کا آنا زحمت نہیں رحمت ہے لیکن انتظامیہ کی ناقص کارکردگی کی وجہ سے وہ رحمت پورے سندھ کے لیے زحمت بن

گئی ہے۔ کیوں کہ زرعی مشینری کی مدد سے کچے میں زمینوں پر قبضے کرنے والوں نے وہاں اپنی کیٹیاں بنادی ہیں۔ ان لوگوں نے وہاں ایسے ڈیم بنادیے ہیں جن میں پانی بھر کر وہ سارا سال کھیتی باڑی کرواتے ہیں مگر جب کسی سال زیادہ پانی آجاتا ہے اور دریا بڑا ہو کر بہنے لگتا ہے تب نہ صرف وہ مصنوعی ڈیم ٹوٹ جاتے ہیں بلکہ کچے کے وہ علاقے جہاں اب پکے مکانات بن گئے ہیں وہ سب زیر آب آجاتے ہیں اور اہلیان سندھ ایک عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس صورتحال کو بہتر انداز سے چلانے کے لیے جس سسٹم کی ضرورت ہے وہ سسٹم کہیں نہیں۔ اس لیے نہ صرف مسائل پیدا ہوتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو ایسے المیے بھی جنم لیتے ہیں جن کو بیان کرنے کے لیے ہمیں آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے الفاظ کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔

قدیم سندھ اور جدید سندھ میں بنیادی فرق یہی ہے کہ قدیم سندھ نے اپنے آپ کو فطرت کے عین مطابق ڈھالا تھا۔ وہ ایسا کچھ نہیں کیا کرتے تھے جس سے کہیں اور کسی بھی صورت فطرت کے ساتھ کوئی ٹکراؤ پیدا ہو۔ اگر دریائے سندھ کسی خاص مقام سے گذرتا تھا وہ اپنے جھونپڑے وہاں پر منتقل کیا کرتے تھے اور اگر پانی کے فطری بہاؤ کی وجہ سے دریا اپنا رخ تبدیل کیا کرتا تھا تو وہ بھی اپنے گھر اور گاؤں تبدیل کرتے تھے۔ ان کی تبدیلی کا یہ عمل بہت دھیمے انداز میں ہوا کرتا تھا مگر جب اچانک زلزلے آجاتے اور بھرے دریا امڈ پڑتے تو وہ ہنگامی بنیادوں پر محفوظ مقامات کی طرف منتقل ہو جاتے۔ انتقال آبادی کا یہ رجحان بہت فطری اور قدیم ہے مگر جب سے انسانوں نے فطرت کو اپنے کنٹرول میں لینے کی کوشش کی ہے اور انہوں نے ڈیموں اور بیراجوں کی صورت فطرت کے سرکش دریاؤں کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی ہے تب سے انسانوں پر ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ مگر ہمارا مخصوص اور کرپٹ سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرپاتا۔ اس لیے سیلابی صورتوں میں بڑی بڑی آفات امڈ آتی ہیں اور مٹھی بھر افراد کے مفادات کے لیے بہت بڑی آبادی المیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی اگر حکومت سندھ اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے کچے میں بسنے والے لوگوں کو محفوظ علاقوں میں منتقل کرنے اور سیلاب کے ایک

دو ماہ کا عرصہ گزارنے کے لیے ان کے لیے موثر منصوبے بنائے تو یہ صورتحال بہت بہتر ہو سکتی ہے مگر کوئی کچھ نہیں کرتا۔ ہر کوئی ہونے والے نقصان کو اپنے فائدے میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جو غریب اور سادہ لوگ کچھ بھی نہیں کرپاتے وہ ان سیلابی دھاراؤں میں اس طرح بہتے ہیں جیسے وہ انسان نہیں بلکہ گھاس پھونس ہوں۔

سندھ عرصہ دراز سے ایک عجیب قسم کے عذاب سے دوچار ہے۔ اس اذیت کی بنیاد پانی ہے۔ جب بارشیں بہت کم ہوتی ہیں اور دریا میں پانی نہیں آتا تب طاقتور لوگ پانی کی چوریاں نہیں کرتے۔ کیوں کہ چوری تو غریب اور کمزور کرتا ہے۔ وہ بندوقوں کے ساتھ پانی پر ڈاکے مارتے ہیں۔ وہ لہروں کو اغوا کرتے ہیں اور اپنی فصلوں کو سیراب کرتے ہیں اور کمزور و غریب کسان پریس کلبوں کے سامنے بھوک ہڑتال کرتے ہیں دھرنے دیتے ہیں اور انصاف آب کے حوالے سے مطالبات کرتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی نہیں سنتا۔ جس دیس میں پانی میں بہتے ہوئے بچوں کی صدائیں نہ سنی جائیں اس دیس میں غریب کسانوں کے مطالبات کون سنتا ہے؟ پھر ان لوگوں کی جذباتی حمایت کرنے والے مڈل کلاس کے شاعر اور ادیب اپنا تاریخی فرض ادا کرنے کے لیے "پانی کے گیت" لکھتے ہیں۔ ان گیتوں میں دریا جیسی روانی ہوتی ہے۔ ان گیتوں کی لے میں لہروں جیسا بہاؤ ہوا کرتا ہے۔ ان گیتوں میں ماضی کی صدائیں سن کر انسانوں کی آنکھوں میں پانی بھر آتا ہے۔ اس لیے تو کبھی کبھی ہمیں ایسا لگتا ہے کہ وہ سارا ادب جس نے انسانی جذبات کی عکاسی کی ہے وہ اپنی ذات میں اور کچھ بھی نہیں بلکہ "پانی کا گیت" ہے۔

یہ سندھ جو صدیوں کے سفر میں مسلسل سکڑ رہا ہے وہ بھی پانی کا گیت ہے۔ پانی کا ایسا گیت جو پیاسا ہے۔ پانی کا ایسا گیت جو اپنے دریا سے بچھڑی ہوئی موج کی طرح پھر سے دریا کے ساتھ ہم آغوش ہونے کی آرزو میں ایک آواز سے دوسری آواز تک کا سفر کر رہا ہے۔ جو ایک گلے کی گلی سے دوسرے گلے کی گلی کا پتہ پوچھ رہا ہے۔ جو مسلسل چل رہا ہے۔ جو کڑی دھوپ میں جلتا ہے پھر بھی چلتا ہے۔ جو سب کو یہی صدا دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"سر پہ آگ برستی دیکھو
بوند بوند کو میری دھرتی
ایک مدت سے ترستی دیکھو"

وہ بوند بوند کے لیے ترستی ہوئی دھرتی اپنے باسیوں کے ساتھ اس وقت کچے میں دریا کے کنارے کھڑی سوچتی ہے کہ "وہ ایک ایسی سوہنی ہے جس کا ماہیوال مر چکا ہے "جب ماہیوال مر جائے اور سوہنی دریائے سندھ کے کنارے تنہا رہ جائے۔ تب پانی کے کیوسک کی ناپ تول کتنی بے معنی بن جاتی ہے!!!

یہی سندھ کی کہانی ہے۔ جس کی آنکھوں میں پانی ہی پانی ہے۔ سیلاب کے موسم میں سندھ اسی پانی کا پیاسا گیت ہے۔ تاریک رات کی تنہائی میں اس گیت کے سر ان ستاروں سے ٹکراتے ہیں جن کو قسمت کے ستارے کہا جاتا ہے۔ مگر قسمت کے ستارے نہ تو دیکھ سکتے ہیں اور نہ آنسو بہا سکتے ہیں۔ وہ تو قیمتی گڑیاؤں کی آنکھوں کی طرح صرف لرزتی ہوئی صداؤں پر اپنی پلکیں جھپکتے رہتے ہیں۔۔۔!!!

ہنس

بنگلا بھاشا کے عظیم شاعر ٹیگور نے اپنی ایک نظم میں لکھا ہے:

"تم میرے وجود کے لیے قطبی تارا ہو
اب سفر حیات میں میرا بھٹکنا ممکن نہیں
تمہارا روشن رخ میری رہنمائی کرتا رہے گا"

وہ سندھی ادب کے آسمان کا قطبی تارا تھے۔ وہ جو جمعرات کی صبح کو قطبی ستارے کے طرح نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اب سندھ کا علمی اور ادبی آسماں اس کے بغیر کس قدر سونا سونا نظر آئے گا۔ اب قلم کے چپو چلانے والے نوجوان ملاحوں کو ساحل کا پتہ کون دے گا؟ اب کتابوں کے کھیت میں الفاظ کی صورت خوابوں کے بیج کون بوئے گا؟ اس شخص کو اب دن کا سورج اور رات کا چاند چراغوں کے ساتھ تلاش کرتے رہیں گے مگر وہ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ وہ شخص جو سفید رنگ کے کپڑے پہنتا تھا۔ وہ شخص جس کی روح بھی سفید تھی۔ وہ شخص جس کے جسم کا ہر بال سفید تھا۔ سفید ستارے جیسا وہ سفید شخص ایک صدی اور دو برس تک زندہ رہا۔ وہ جو کتابوں سے بھرے ہوئے کمرے میں تنہا رہتا تھا۔ وہ جس کو اپنی زباں اور اپنی ثقافت کے ساتھ محبت کرتا تھا۔ وہ شخص جو دنیا کی ہر زباں اور ہر ثقافت کی عزت کرتا تھا۔ وہ شخص جو محبت میں سندھی اور غصے میں انگریزی بولتا تھا۔ وہ شخص جو ساری زندگی محکمہ تعلیم کے اعلی عہدوں پر فائز رہا مگر اس کے پاس پینشن کے علاوہ اور کوئی پیسہ نہیں تھا۔ اس کے

پاس کوئی کوٹھی اور کوئی کار نہیں تھی۔ وہ محنت سے بنائے ہوئے اپنے سادہ سے مکان کے دروازے سے نکلتا اور حیدرآباد کے چھ سیٹوں والے سستے اور پرانے رکشا میں بیٹھ جاتا۔ وہ شخص جس نے پیدل چلتے ہوئے کبھی احساس کمتری محسوس نہیں کی۔ وہ شخص جس نے دامن پر کسی الزام کا داغ نہیں تھا۔ وہ شخص جو اپنی ایمانداری سے بتائی ہوئی زندگی پر مطمئن اور خوش رہتا تھا۔ وہ جو سب کو حوصلہ دیتا تھا۔ وہ بچوں کی طرح مسکراتا تھا اور بزرگوں کی طرح سمجھاتا تھا۔ وہ شخص جس کا گھر حیدرآباد سینٹرل جیل کے بالکل سامنے صحافی کالونی میں تھا۔ وہ شخص گذشتہ روز قید حیات اور بند غم سے آزاد ہو کر سندھی ادب کی تاریخ کا ایک عظیم حوالہ بن گئے۔

سندھی اخبارات میں ان کے وفات کی خبر لیڈ اور سپر لیڈ تھی۔ سوشل بولنے والے حلقے سوشل میڈیا پر اب تک اس کے لیے افسوس سے بھری ہوئی پوسٹس شیئر کر رہے ہیں۔ سندھ اسیمبلی میں انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ سینیٹ میں ان کے لیے دعائے مغرفت مانگی گئی۔ ملک کے اہم سیاسی رہنماؤں نے ان کے حوالے سے تعزیتی بیانات جاری کیے۔ وہ ادارے سوگ میں بند کر دیے گئے جن کے وہ سربراہ رہے تھے۔ وہ جنہیں "لائف اچیومنٹ" ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ان کے حوالے سے اہم ترین بات یہ تھی کہ وہ شیخ ایاز کے ادبی استاد تھے۔ شیخ ایاز نے اپنی دو کتابوں کا انتساب ان کے نام کیا۔ شیخ ایاز جب بھی ان کا تذکرہ کرتے تب شاہ لطیف کا یہ شعر گنگناتے کہ:

"کسی کسی شخص سے بہار کی بو میں آتی ہے"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی باتیں بہار کی جھونکے کی محسوس ہوتی تھیں مگر یہ بھی حقیقت ہے اس شخص میں سارے موسم موجود تھے۔ وہ موسم گرما اور موسم سرما کے سلسلے میں بہت سارے قصے بیان کرتے اور جب سرد جھونکوں میں گرتے ہوئے پتے ماحول کو مایوسیے بھرنے لگتے تب وہ انگریز شاعر شیلے کا یہ مشہور شعر پڑھتے:

If Winter comes, can Spring be far behind?

یعنی: اگر موسم سرما آئی ہے تو کیا موسم بہار بہت دور ہے؟

ہر تعلیم یافتہ سندھی ان کا نام بیحد احترام سے لیتا ہے۔ سب انہیں "محترم محمد ابراہیم جویو" کہتے ہیں۔ اب ابراہیم جویو صرف عہدوں پر رہنے کی وجہ سے سندھی مڈل کلاس میں مقبول نہیں۔ ان کی وجہ شہرت ان کی ایمانداری اور ان کی مسقتل ادبی اور علمی محنت ہے۔ وہ شخص جو بچپن میں یتیم ہوگئے اور جس نے دکھوں کو طاقت میں تبدیل کرتے ہوئے وظیفوں پر تعلیم حاصل کی اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ پوری زندگی پوری قوم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

دراصل ابراہیم جویو وہ واحد شخص تھے جنہوں نے مرزا قلیچ بیگ کے بعد سندھی زباں کو بہترین ادب کے ذخائر سے مالا مال کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا قلیچ بیگ بذات خود ایک شاعر اور ادب دوست شخصیت کے مالک تھے مگر ان کا دور انگریزوں کا دور تھا۔ ان کے دور میں انگریزی کتابوں کے تراجم کی انگریز سرکار حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ مگر محترم ابراہیم جویو کو نہ کسی حکومت کی مدد میسر ہوئی اور نہ انہیں سرکاری اداروں کا تعاون حاصل ہوا۔ وہ جو ایمانداری اور دیانت داری کی وجہ سے بہت غریب تھے۔ وہ اپنی تنخواہ سے تھوڑے پیسے بچاتے اور آہستہ آہستہ کسی اچھے کتاب کا ترجمہ کرتے اور خود ہی اس کتاب کی پروف ریڈنگ کرتے اور جب کتاب چھپ جاتا تو اپنے حلقے میں اس کو فروخت کرتے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کو پھر کسی کتاب میں استعمال کرتے۔ وہ انگریزی ادب کے بہت بڑے مداح تھے۔ اس لیے انہوں نے مارشلا کے موسم میں بائرن کی طویل نظم "شیلان کا قیدی" کو ترجمہ کیا اور اسے چھوٹے سے کتابچے کی صورت میں شایع کروایا۔ انہوں نے فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں لکھی گئی ان کتابوں کا ترجمہ جن کتابوں نے اپنے معاشرے کی بہتری میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے "گلیلو کی زندگی" کا ترجمہ اُس وقت کیا جب سندھی تو کیا اردو کے ادبی حلقوں میں بھی برٹالٹ بریخت ایک اجنبی نام تھے۔ ابراہیم جویو نے ہمیشہ کوشش کی کہ وہ سندھی زباں میں ایسی کتابیں ترجمہ کرے جو اہلیان سندھ کو سوچنے پر مجبور کرے۔ انہوں نے "فلسفے کا ابتدائی کورس" جیسی مشکل کتاب کا

سلیس زباں میں ترجمہ کیا۔

وہ ایک عجیب انسان تھے۔ جب بھی کوئی شخص ان سے ملنے کے لیے جاتا تو وہ اس سے باتیں بھی کرتے اور ساتھ ساتھ کسی کتاب کی پروف ریڈنگ بھی کرتے جاتے۔ وہ کتابوں کے عاشق تھے۔ اگر کوئی نوجوان انہیں اپنی کتاب دیباچہ لکھنے کے لیے دیتا تو وہ اسے کہتے کہ ”اس کتاب کی اگر میں ضروری ایڈیٹنگ کروں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“ اور پھر شفقت سے مسکراتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہتے کہ ”چلو ایسا کرتے ہیں کہ میں دیباچہ لکھنے کے بعد پورے کتاب کی پروف ریڈنگ کروں گا اور اس کے معاوضے کے طور پر تم مجھے کتاب کی بیس کاپیاں دے جانا۔ میرے پاس بہت سارے غریب نوجوان آتے ہیں۔ میں تمہاری کتاب ان کو دوں گا“ وہ شخص جو اپنے کتابی شوق کو پورا کرنے کے لیے عجیب انداز سے بچت کرتا تھا۔ اس نے پوری زندگی کوئی فضول خرچی نہیں کی۔ اس کے پاس سفید رنگ کے سستے دو یا تین کپڑوں کے جوڑے تھے۔ وہ ٹیکسی میں سفر کرنے سے منع کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا بس میں سفر کرنے سے کیا نقصان ہے؟ وہ حیدرآباد کے راستوں پر اکثر پیدل چلتا نظر آتا۔ جب ان کا کوئی دوست یا مداح گاڑی روک کر انہیں لفٹ دینے کے لیے اصرار کرتا تب وہ مسکراتے ہوئے کہتا کہ ”حیدرآباد بہت چھوٹا سا شہر ہے۔ مجھے حیرت ہے لوگ شہر کے اندر کاروں میں سفر کیوں کرتے ہیں“ اور وہ یہ بھی کہتے کہ ”اچھی صحت کا راز یہ ہے کہ تھوڑا کھاؤ اور زیادہ چلو“ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ وہ صحت کے ساتھ ایک صدی اور دو برس تک زندہ رہے۔ وہ ایک برس قبل مجھ سے ملے تھے تب شکایت کرتے ہوئے کہنے لگے تھے کہ ”اب کتابیں نہیں پڑھ سکتا۔ اب جینے کے لیے دل نہیں کرتا۔ جیسے انہوں نے کتابیں پڑھنے کے لیے جنم لیا تھا۔ ان کی زندگی کا مقصد علم حاصل کرنا اور حاصل کیے ہوئے علم کو معاشرے میں عام کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ مگر اس مقصد کے ساتھ ساتھ انہیں موسیقی کے ساتھ بھی شغف تھا۔ وہ دھیمے سروں میں شاہ لطیف کے کلام کو سنتے تھے اور کبھی خود گنگناتے ہوئے رو دیتے تھے۔ وہ اپنے ملنے والوں سے کتابوں کی کہانیاں

بیان کرتے۔ وہ انہیں بتاتے کہ کس کتاب میں کون سے نئی کہانی ہے؟ وہ صرف ادب اور شعر و شاعری کے حوالے سے کتابیں نہیں پڑھتے تھے بلکہ انہوں نے بہتر اور معیاری تعلیم کے سلسلے میں برازیل کے عوامی دانشور پائلو فریری کی کتاب "علم تدریس مظلوموں کے لیے" کا ترجمہ بھی کیا۔ وہ ایک بار سمندری حیات کے سلسلے میں کتاب پڑھ رہے تھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس کتاب کو آپ کیوں پڑھ رہے ہیں؟ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ "یہ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے تحقیق کی ہے اور بتایا ہے کہ مچھلیاں کس طرح تہذیب کے ساتھ رہتی ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ کروں۔ ممکن ہے کہ ہمارے لوگ مچھلیوں سے ہی کچھ سیکھیں۔" وہ ہمیشہ سیکھنے اور سکھانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ وہ سکھانے والے شفیق استاد عمر کا فرق ایک طرف رکھ کر نوجوانوں سے دوست بن کر ملتے اور اپنے پوتوں اور نواسوں کی عمر کے نوجوانوں کا تعارف اپنے دوست کے طور پر کرواتے اور ان کی باتیں غور سے سنتے اور انہیں مفید مشورے دیتے۔

اب وہ کہانیاں سنانے والا اور کتابیں پڑھانے والا اور تہذیب کے معیارات بتانے والا شخص اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ وہ شخص جو سندھی ادب کے آسمان کا قطبی تارہ تھا۔ وہ رہنمائی کرنے والا ادبی استاد ایک سرکش دانشور کی حیثیت سے اس ہنس جیسا تھا جو وفا کے علامت سمجھا جاتا ہے۔ جس کے بارے میں ہندی شاعر نے لکھا ہے:

"تال سکھے سر بیتوے ہنس کہیں نہیں جائے
پچھلی پریت کے کارنی کنکر چن چن کھائے"

یعنی: اگر تالاب سوکھ بھی جاتا ہے تب بھی ہنس کہیں نہیں جاتا
وہ محبت نبھاتے ہوئے کنکریاں کھا کر گزارا کرتا ہے!!

عورت اور آنسو

ترکی کے عظیم انقلابی شاعر ناظم حکمت نے لکھا تھا کہ:

"ایک غبارے جیسی
ایک گیند جیسی
یہ دھرتی
صرف ایک دن لیے
معصوم بچوں کے حوالے کر دو"

مگر افسوس ہمارے معاشرے کی نام نہاد تحریک نسواں سے تعلق رکھنے والی کسی شاعرہ نے نہیں لکھا کہ:

"ایک لمحے
ایک دن
ایک ماہ
یا ہمیشہ کے لیے
یہ دھرتی
دیدو
ایک دریدہ دامن
عورت کی آغوش میں"

ہماری اس اداس دنیا کو ایک ماں کی ضرورت ہے۔

وہ ماں جو سب بچوں سے محبت کرتی ہے۔ جو سب بچوں کی الجھنیں سمجھتی ہے۔ جو جانتی ہے کہ کس کے ساتھ رہنا ہے اور کس کی محبت کو آزادی کی آخری حدود تک پھیلا دینا ہے۔ ماں کا آنچل بہت بڑا ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کہ ممالک کے پرچم اتنے کشادہ نہیں ہوتے۔ مبارک ہو گا وہ دن جب کسی ملک کا پرچم اپنے عوام کے لیے ماں کا آنچل بن جائے۔ جس کا سایہ سب کے لیے ہو۔ جس میں مخصوص خوشبو ہوا کرتی ہے۔ محنت کی اور محبت کی خوشبو!

یہ بات الپچینو کی فلم ''سینٹ آف وومن'' سے کہیں بڑی ہے۔

کازانت زاکس نے لکھا تھا کہ ''جس طرح ہر ہاتھ میں موجود انگلیوں کے نشان الگ ہوا کرتے ہیں اس طرح ہر عورت میں ایک مختلف مہک ہوا کرتی ہے۔ میں دو برس کی عمر سے ہر عورت کو اس کی خوشبو سے جاننے کی کوشش کرتا ہوں''

جس طرح بارش کے بعد گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو ماحول کو مہکا دیتی ہے۔ اس خوشبو سے کہیں زیادہ خوبصورت خوشبو اس ماں میں ہوا کرتی ہے جس کا بچہ پریشان نیند میں اسے دیکھے بغیر اس کی خوشبو کو محسوس کرنے کے بعد سکون سے سو جاتا ہے۔ ایسی خوشبو اس سیاست میں کب پیدا ہو گی؟ جس کے انگ انگ سے بارود کی بو آرہی ہے۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ سیاست کی تاریخ میں بہت سارے تجربات ہوئے ہیں مگر کبھی کسی ریاست نے اپنا اختیار عورتوں کے حوالے کیوں نہیں کیا؟

آج سے بہت برس پہلے جب پی ٹی وی پر یہ گیت گونجتا تھا کہ:

''ہم مائیں
ہم بہنیں
ہم بیٹیاں
قوموں کی عزت ہم سے ہے''

تو بہت اچھا لگا کرتا تھا۔ اس وقت میں سوچتا تھا کہ کبھی ایسا سیاسی تجربہ بھی ہو کہ ملک کا انتظامی اختیار عورتوں کے سپرد کیا جائے۔ مرد صرف ذہنی اور جسمانی کام کے

لیے ہوں۔ کیوں کہ انتظام کو چلانے کے لیے ذہانت سے زیادہ مزاج کی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ اور محبت سے بھرا ہوا مزاج مردوں کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ مرد جن کے لیے امریکی ناول نگار جان اسٹین بیک نے لکھا تھا کہ ''مرد ایک پاگل دیوتا ہے'' مگر وہ وقت کب آئے گا؟ جب ہم اپنی دنیا ان سیانی ماؤں کے حوالے کر دینگے جن سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ ''امن کیا ہوتا ہے؟'' کبھی کبھی میرے ذہن میں خیال آتا ہے کہ اس معاشرے کے ارتقاء میں عورتوں کا کردار مکمل طور کبھی قلم بند نہیں ہوا اور جب بھی ہو گا تب ہم جان پائیں گے کہ غلامی سے لیکر سماجی انصاف تک جب جب اور جہاں جہاں اور جس جس قسم کی بہتریاں پیدا ہوئی ہیں وہ سب عورتوں کے دم سے ہوئی ہیں۔ ہم نے عورتوں کو اختیار نہیں دیا اس لیے وہ خاندانوں میں کھیل کھیلتی ہیں۔ اس وقت بھی ہم اگر ایک آزاد ملک میں جی رہے ہیں تو صرف اور صرف ان عورتوں کی وجہ سے جو مائیں ہیں، بہنیں ہیں، بیٹیاں اور بیویاں ہیں۔

مغرب بہت منافق ہے۔ وہ ہمارے معاشرے میں تو عورتوں میں مظلومیت کے حوالے سے بڑا مرتاد کھائی دیتا ہے مگر اس نے اپنے ریاستی سیٹ اپ میں عورتوں کو آگے لانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ کیوں کہ اگر جارج بش کی جگہ امریکہ کی صدر لارا ہوتی تو شاید وہ عراق اور افغانستان پر کارپیٹ بمباری کی درخواست منظور کرنے سے پہلے بہت سوچتی۔ مگر بش کے سینے میں وہ احساسات نہیں تھے۔ امریکہ اگر ریاستی معاملات میں آگے بھی لاتا ہے تو ایسی عورتوں کو جو عورت کم اور مرد زیادہ ہوا کرتی ہیں۔ جسمانی حوالے سے نہیں مگر مزاج کے حوالے سے۔ برطانیہ کی بے حس وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر پر بننے والی فلم کا نام ہے ''آئرن لیڈی'' یعنی فولادی عورت! اور وہ اس لوہے سے بنی ہوئی تھی جس لوہے سے ٹینکوں کے پہئیے اور توپوں کے نال بنائے جاتے ہیں۔ امریکہ نے ابھی تک کسی خاتون کو صدر نہیں بنایا مگر گذشتہ سولہ برسوں کے دوراں امریکہ نے تین خواتین کو وزیر خارجہ بنایا۔ جب کہ ان میں سے دو تو عورت کے روپ میں مرد تھیں۔ کیا میڈلائن البرائٹ کو دیکھ کر آپ کو کبھی یہ خیال آیا کہ آپ کسی عورت کو سن رہے ہیں؟ کونڈالائیزرائس بھی دبلی پتلی ہونے کے باوجود اپنی

روح میں ایک مرد تھی۔ جب کہ ہلیری کلنٹن ایک عورت تو تھی مگر زخمی جذبات والی!
مغرب نے سیاست کی اسٹیج پر صرف ایک عورت کی رونمائی کی اور وہ عورت تھی ڈیانا!

ڈیانا واقعی ایک مثالی عورت تھی۔ اس لیے وہ تخت و تاج کے دبدبے سے نہیں دبی اور اس نے اپنی حکمران حیثیت کو تنگ جوتے کی طرح اتار کر تاج برطانیہ پر مار دیا اور ننگے پاؤں ایک پیار کی تلاش میں نکل پڑی۔ ساحلوں پر۔ صحراؤں میں۔ اور ان سنگلاخ سرزمینوں پر جہاں بارش بھی نہیں برستی۔ ڈیانا کی زندگی پر بننے والی فلم ابھی تک ریلیز نہیں ہوئی مگر کیا اس فلم میں موجود ہوگا وہ پیشن جو اس کی ذات میں پیار کے لیے ہوا کرتا تھا!! اگر جان میجر کی جگہ انگلینڈ کی وزیر اعظم ڈیانا ہوتی تو وہ اپنی محدود عقل اور وسیع عشق کے ساتھ ایک نئی تاریخ ضرور رقم کرتی۔ مگر مغرب بزدل ہے۔ وہ ایک حقیقی عورت کو حکومت کا سربراہ نہیں بنا سکتا۔ وہ عورت جو اسٹیج پر محکوم اقوام سے معافی مانگتے ہوئے رو پڑے۔ جو کہہ سکے کہ ہمارے مردوں کو معاف کرو!!

ذوالفقار علی بھٹو کہتا تھا کہ ”میرے لیے سیاست ایک عوام کے ساتھ تھرلنگ رومانس ہے“ مگر عورت تو تاحیات عاشق ہوتی ہے۔ اور اس کی محبت میں ایک معصومیت ہوا کرتی ہے۔ وہ معصومیت جو محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایک ایسی محبت کی ضرورت ہر ملک کی طرح ہم کو بھی ہے۔ ایک ایسے حکمران کی ہم کو ضرورت ہے جو عوام سے محبت کرنے کے لیے مجبور ہو۔ جس کی آنکھیں رو سکیں۔ اس شاعر کی نظم کی طرح جس نے لکھا تھا کہ:

”جو آنکھیں روئی نہیں ہیں
ان آنکھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں ہے“

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت اور آنسو ایک سکے کے دو رخ ہوا کرتے ہیں مگر کس نے کہا کہ رونے کا تعلق صرف خوف اور درد سے ہوا کرتا ہے؟ رونا تو حساس دل کا ثبوت ہے۔ عورت روتی ہے مگر حساسیت کی وجہ سے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حساسیت بزدل ہوا کرتی ہے۔ عورت اپنے احساس میں جتنی بہادر ہے اتنا بہادر مرد

نہیں ہوتا۔ اگر ایک عورت کے بچے پر شیر حملہ کرے تو وہ اس سے جس طرح لڑے گی اس لڑائی کا تصور ایک مرد نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگر ایک ملک کی حکومت عورتوں کے پاس ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس ملک پر دشمن ملک حملہ کر کے اس کو فتح کر لے گا! نہیں ہر گز نہیں۔ کیوں کہ عورت میں داخلی طور پر محبت اور خارجی طور پر عزت ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنی عزت کے لیے ایک شیرنی کے طرح لڑ سکتی ہے۔

اپنے ملک کا حال دیکھ کر کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ کیوں نہ ہم اپنا ملک کچھ عرصے کے لیے اپنی عورتوں کے حوالے کر دیں!!

ایک مریض کی مانند! اس ملک کو ان مرد حکمرانوں کی ضرورت نہیں جو خواجہ سراؤں کی طرح ہر روز شیو کرتے ہیں اور خوشنما لباس پہن کر اسٹائل کے ساتھ چلتے ہیں۔ اس ملک کو ایک ایسی نسوانی حکومت کی ضرورت ہے جو ملک کے بچوں، بوڑھوں اور بیچارے لوگوں کا خیال رکھے۔ جو امن کے دور میں درختوں پر بیٹھے پرندوں کی طرح چہچہائیں مگر جنگ کے دوراں ان کا کردار اس کہانی جیسا ہو جس کا مرکزی کردار اس نوجوان راجہ کی ماں جیسا ہو جو دشمن کے حملے کی تیاریاں دیکھ ڈر جاتا ہے اور گھر میں جب اس کی بیوی چاول پکاتے ہوئے آواز کرتی ہے تب وہ اپنی بہو کو ڈانٹ کر کہتی ہے کہ ”دیگچی پر چمچہ آہستہ رکھو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ جب لوہا لوہے سے ٹکراتا ہے تو اس کی آوز سن کر میرا بیٹا ڈر جاتا ہے“ اور وہ راجہ ماں کی بات سن کر میدان میں گیا اور اس نے دشمن کو شکست دے دی۔ ایسی مائیں ہمارے معاشرے میں بھی موجود ہیں۔ مگر ان کو قیدی بنا دیا گیا ہے۔ پچاس برس کی عمر کی وہ خواتین جو اپنی گرہستی ختم کر چکی ہیں انہیں سیاست میں اختیارات دینے چاہئیں اور ان کے احکامات کی بجا آوری کرتے ہوئے ہمیں اپنے اس ملک کی کھوئی ہوئی آبرو کی بازیابی کے لیے انقلابی جدوجہد کرنی چاہئیے۔

یہ دنیا ہمارے بس میں نہیں اس لیے ہم اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو یہ دنیا نہیں دے سکتے مگر ہم اپنا آپ تو ان کے حوالے کر سکتے ہیں۔ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ ہم اپنے ملک کے لیے کیا کریں؟ ہم اپنے شہر کے لیے کیا کریں؟ وہ ہماری رہنمائی

کر سکتی ہیں اور ہم اس رہنمائی میں پر امن انداز سے ایک نئی دنیا نہیں تو نیا ملک بنا سکتے ہیں۔

اس کالم میں پیش کیا گیا یہ خیال سیاست کے حوالے سے ایک نسوانی یعنی فیمینسٹ تصور نہیں ہے۔ یہ ایک صوفی تصور ہے۔ ہم اس تصور پر عمل نہ کریں مگر اس پر سوچ تو سکتے ہیں۔ مشرق کی صوفی شاعری میں عاشقی کا تاج مرد کے ماتھے پر نہیں بلکہ عورت کے سر پر سجایا جاتا ہے۔ ہر صوفی نے اپنا تذکرہ نسوانی انداز سے خواہ مخواہ تو نہیں کیا۔ اس سوچ کے پیچھے ایک دانائی ہے۔ مگر ہم اس دانائی سے دور بستے ہیں۔ ہماری بستی پاگل دیوتاؤں کی بستی ہے۔ ہماری بستی میں محبت مجبوری اور عشق ایک عیب ہے۔ کب ہم اس میل شاونسٹ سوچ سے آزاد ہونگے۔ کب ہم اپنے ملک کے محافظ ہوں گے اور اس کی باگ ڈور ان عورتوں کے حوالے کریں گے جو پر امن ہونے کے ساتھ ساتھ غیور ہیں۔ جو معصوم ہیں۔ خوبصورت ہیں۔ نازک ہیں مگر فارسی کے اس شعر کی طرح جس میں شاعر نے کہا کہ:

"محبت کے معاملے میں تو ہم ان کلیوں کی طرح ہیں جن کا دل باد صبا سے بھی لرز جاتا ہے
مگر میدان کارزار میں ہم ان پہاڑوں کی مانند ہیں جنہیں اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا"

عورت آنسو ہے مگر اس شبنم جیسا جس کے دل میں شعلے دہکتے ہیں!!

ایک ایسے شعلے کی ضرورت ہمارے اس ملک کو بھی ہے جس کے حکمرانوں کو دیکھ کر اس دھرتی کی ماؤں اور بیٹیوں کے دلوں میں اس پشتو ٹپے جیسے احساسات ابھر آتے ہیں کہ:

"اے میرے وطن! اگر تیرے بیٹوں نے تیری حفاظت نہ کی
تو تیری بیٹیاں تیری حفاظت کے لیے میدان میں اتریں گی"

پیار کا پہلا شہر

وہ کراچی کہاں گیا؟
جس میں جون کا مہینہ
سمندر کی سبز لہروں پر تیرتا ہوا آتا تھا
اور اپنے ساتھ لاتا تھا پہلے پیار کے مدھر گیت!
"او میرے شوخ صنم
ہوا دیوانہ دل جب سے تمہیں دیکھ لیا"
وہ ویسپا اسکوٹر!
وہ ربن جیسی پتلی سی ٹائی!
وہ چھوٹا کوٹ اور وہ کالی پینٹ!
وہ چوڑی دار پاجامہ!
وہ وگ والا جوڑا!
وہ کاجل کی ترچھی لکیر!
وہ ہونٹ پر بنا ہوا نقلی تل!
وہ شوخ رنگوں والی ساڑھی کا
اڑتا ہوا پلو!
وہ ادب آداب والا رومانس!

وہ "پہلے آپ۔۔۔پہلے آپ" کی تکرار!
وہ کشادہ سڑکیں اور فٹ پاتھ پر لہراتے ہوئے گل مہر کے زرد پھولوں والے پیڑ!
وہ سینما گھروں پر آویزاں چر سی آرٹسٹوں کے بنائے ہوئے پوسٹرز!
وہ جامع کراچی سے آنے والی جھولتی ہوئی بس!
وہ شرمیلی لڑکیوں کا شوخ تبسم!
وہ شام کو اچانک چھا جانے والے بادل!
وہ ٹاور سے ٹکرا کر ٹکڑے ہو جانے والا چاند!
وہ نرم بوندوں کے بان!
اور کشادہ صحن والے مکان میں بجتے ہوئے گراموفون سے
اٹھتا ہوا اک پردیسی گیت!
"من بھیگا ہے
تن گیلا ہے
اس کا کوئی پیچ بھی ڈھیلا ہے
ملی اک اجنبی سے
کوئی آگے نہ پیچھے
تم ہی کہو یہ کیا بات ہے؟
اک لڑکی بھیگی بھیگی سی
سوتی راتوں میں جاگی سی"
اب وہ لڑکی بدل چکی ہے!
اب وہ لڑکی وہ نہیں
جو بیٹھ جاتی تھی
اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ
فٹ پاتھ پر بچھے ہوئے
ایک سیکنڈ ہینڈ بک شاک پر

اور چاہتے ہوئے بھی
نہیں اٹھاتی تھی
نیم عریاں تصویروں والا وہ میگزین
جس کا مونو ایک خرگوش کی تصویر ہوا کرتا تھا!
اور اس کا بوائے فرینڈ
اسے تحفے میں دیا کرتا تھا
اس دور کا بیسٹ سیلر ناول
LOVESTORY
اور خود خریدتا تھا
ماریو پزو کا ناول
THEGODFATHER
ابھرتے ہوئے مڈل کلاس کی زندگی اس شہر میں ایسی ہی ہوا کرتی تھی!
وہ شہر جواب رو بھی نہیں سکتا
ان دنوں کے لیے
جب جون جہنم نہیں تھا!
جس میں گیلی گرمی کا احساس
ناقابل فراموش تھا!
یہ وہ دور تھا
جب شہر کی دیواروں پر
نقلی عاملوں
جنسی ادویات
اور کرمنل سیاسی پارٹیوں کی چاکنگ
کہاں ہوتی تھی!!!!؟
وہ تو ریڈیو کا دور تھا

سننے سنانے کا دور!
تصور میں تصویر بنانے کا دور!
ایک ایسا دور
جواب کبھی نہیں آئے گا
الطاف حسین کی طرح!
اس دور کے اپنے درد تھے
اپنی خوشیاں تھیں!
اپنے اندیشے
اور اپنی آرزوئیں!
اپنے ہیروز
اپنے ولین!
وہ شاہی سید کا دور نہ تھا
ابھی اے این پی پیدا ابھی نہیں ہوئی تھی
اور پٹھانوں کی ٹرکوں کے پیچھے
بنی ہوا کرتی تھی
ایوب خان کی تصویر
اور اس کے اوپر لکھا ہوا تھا
"تیری یاد آئی، تیرے جانے کے بعد"
وہ بہت عجیب دور تھا
وہ بہت غریب دور تھا
اس دور کا ایک گیت تھا
"تم سے ملا تھا پیار
کچھ اچھے نصیب تھے
ہم ان دنوں امیر تھے

جب تم قریب تھے"
اب الیکٹرانک انقلاب کی وجہ سے
ہم بہت دور چلے گئے ہیں!!
یہ وقت ان بارشوں کے لیے ترستا ہے
جو مدفون شہروں پر برستی ہیں!!
"میں کیوں اس کو فون کروں؟
اس کو بھی معلوم ہے
یہ موسم کی پہلی بارش ہے"
اب شامیں بریکنگ نیوز بن گئی ہیں
اور راتیں ٹاک شوز!
اب وہ کراچی کہاں ہے؟
جہاں پی لڑکیاں
جو تیز ہوا میں
سگریٹ سلگانے والے لڑکوں کو
مسکرا کر دیکھتی تھیں
اور سوچتی تھیں کہ
"سانولے رنگ میں اتنی کشش کیوں ہے؟"
وہ شہر تو آہستہ آہستہ غروب ہوتا گیا
موسم خزاں کے سورج کی طرح!
اب تو اس شہر میں وہ درخت بھی نہیں
جو پتوں کی پازیب باندھا کرتے تھے
بیوفائی کی وجہ سے بھٹکنے والوں کے پیروں میں!
اب اس شہر کو الوداعی آنکھوں سے
دیکھنے والی نسل

بالکونی میں بیٹھ کر
اس وقت دیکھا کرتی ہے
جب بجلی بہت دیر تک نہیں آتی!
اور سوچا کرتی ہے
"رفیقو! یہ جگہ ہے وہ جہاں ریحانہ رہتی تھی"
یہ انگنت اندھیروں میں ڈوبا ہوا شہر
یاد کرتا ہے اس وقت کو
جب آسماں میں بجلی کڑکتی تھی
تب بھی سڑکوں پر جمع ہونے والے پانی میں
روشنی کے سائے لہراتے تھے
بچے کورس میں گاتے تھے
"بول میری مچھلی کتنا پانی؟"
اور کوئی نیا عاشق ریڈیو کا والیوم بڑھاتا تھا
جب اس پر یہ گانا آتا تھا
"کیوں ہم سے خفا ہو گئے
اے جان تمنا!
بھیگے ہوئے موسم کا مزہ کیوں نہیں لیتے؟
یہ رات یہ برسات یہ ساون کا مہینہ
ایسے میں تو پھولوں کو بھی آتا ہے پسینہ
اس رت میں غریبوں کی دعا کیوں نہیں لیتے"
مگر اب کسی کو دعا تو کیا
بد دعا بھی نہیں لگتی ہے اس شہر میں!
یہ شہر جو ایک اوپن ایئر ٹارچر سیل ہے
جس میں رکشا پاس سے اس طرح گذرتا ہے

جیسے سر سے آرا گذرتا ہے!
اور اگر کوئی درد کا مارا گذرتا ہے
اس کی بات سننے کے لیے کوئی
پاور ونڈو کا شیشہ بھی نیچے نہیں کرتا!
اب اس شہر کے آسماں پر ستارے نہیں چمکتے
اب اس شہر کی فضاؤں سے بادل نہیں برستے
اب اس شہر کے لوگ حیران کر دینے والے حبس سے
پریشاں ہو کر
لو کے لیے دعا مانگتے ہیں!
کبھی تو یہ شہر رم جھم تھا
بھیگے ہوئے اخبارات کو
گرم چائے کے ساتھ
پڑھنے والے لوگ!!
کہاں گئے؟
کہاں گئے وہ ایرانی ہوٹلز
جن کے کاؤنٹر والی کھڑکی میں
قرۃ العین طاہرہ کی شاعری
محمد علی باب کے لیکچرز
اور بہت کچھ موجود ہوا کرتا تھا۔
وہ مشاعرے جو پوری رات جاری رہتے تھے
وہ افسانے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے!
اور پکنک پارٹیز جو ہر ہفتے منعقد ہوا کرتی تھیں
وہ گلابی دھوپ کہاں گئی؟
جس میں کوڈیک کیمراؤں میں دیکھنے والے

بلیک اینڈ وائٹ رومانس کو بکھیرتے تھے!
وہ انگلش موویز
وہ سینمائیں!
اور ''سن فلاور'' کا آخری منظر دیکھ کر
اداس ہونے والے لوگ!!
کہاں گئے؟
ایک معمر عورت
اپنے میاں سے پوچھنا چاہتی ہے
وہ لڑکا کہاں گیا؟
جو تمہیں لڑکی بن کر خط لکھا کرتا تھا!
اب ڈاکیا صرف بل لاتا ہے
اس بجلی کے جو نہیں آتی!!
اب درد دستک دیتا ہے
اس دروازے پر
جس پر کبھی ایک پینٹنگ آویزاں ہوا کرتی تھی
اب کوئی شہر کی کتھا نہیں سناتی
اب سڑکوں پر سائرن چیختے ہیں!!
''وطن تو محبوب کی آنکھوں کی وجہ سے
حسین ہوا کرتا ہے
جب محبوب نہیں تو کیا دیس
اور کیا پردیس!!''
اب بات اس پشتو ٹپے سے آگے بڑھ گئی ہے
اب نسوار کی چٹکی سے درد دبانے والے چوکیدار نہیں رہے
اب پان میں پریشان مہک نہیں رہی

اور چھالیہ کا وہ گیت اب کوئی نہیں گنگناتا
"سروتا کہاں بھول آئے؟
پیارے نند دوئیا۔۔۔"
اب تو سارے گیت
نہ معلوم کس سمت کوچ کر گئے؟
اور محنت سے ابھرنے والا وہ مڈل کلاس
کہاں ہے؟
جس کے لڑکے
انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد
لڑکیوں کو متاثر کرنے کے لیے
اس امریکن قونصلیٹ
جایا کرتے تھے
جہاں کوئی دیوار تو کیا
کوئی چوکیدار بھی نہیں ہوتا تھا
اگر ہوتے تھے تو فلیگ والے
دو تین سیر و مونٹل ملازم!
اب شہر میں آبادی بہت ہے
مگر گلیاں ویران ہیں!
وہ اکتوبر کا مہینہ
وہ ٹھنڈی فضاؤں میں
رک جانے والی ہوائیں
وہ گلیوں میں کھڑے ہونے والے نیٹس
وہ "لو آل" کا اعلان
وہ شٹل کی آواز

اور ذرا دور کھڑکی کی چلمن پہ
چپکا ہوا سایہ!!
یہ پوری رات بریک ڈانس کے مقابلے
تو بہت دیر بعد آئے!!
اس وقت کرکٹ کھیلا کم
دیکھا بہت جاتا تھا
اور لڑکیوں کے پسندیدہ افسانوں کے ہیروز
پہلے فوجی اور بعد میں کرکٹ کے پلیئر بنے!
کراٹے کا کریز
دیر کی بات ہے!
یہ اس دور کی کہانی ہے
جب ووٹ بھتے کے طور پر دینے کے بجائے
نیکی کے حوالے سے دیے جاتے تھے!
اس دور میں مولوی دہشت سے دور تھے
اور میاں نورانی بائیں بازو کے
زبردست دانشور کہلاتے تھے!
اس وقت جماعت اسلامی
کتابوں میں قید تھی
اور پیپلز پارٹی ایک لبرل سوچ کا ابھرتا ہوا منظر تھی'
اس کراچی کو تلاش کرنے کے لیے
کسی اخبار میں اشتہار نہیں
کسی چینل پر کوئی پکار نہیں
جو کراچی فینٹسی نہیں
بلکہ ایک فیکٹ تھا!

وہ شہر جو ہجرت سے آباد ہوا
وہ شہر جو ہجرت سے برباد ہوا
جس شہر سے پہلے لوگوں نے کوچ کیا
پھر پرندوں نے
اور پھر موسموں نے!
نہ وہ ساحل سمندر کی سردی
جو مغربی انداز والے لانگ کوٹ کا تقاضا کرے
نہ وہ ساحل سمندر کی گرمی
جو کلائی میں بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے گزر جاتی تھی
اور بہت جلد لاتی تھی
اس جون کو
جو جولائی سے جڑا ہوا تھا
جس میں سمندر فطرت کا عظیم ہائڈرنٹ تھا
اور بادلوں کے ٹینکر بھرتے جاتے
اور برکھارت کی بوندیں
سیمنٹ کی دیواروں میں جذب ہو جاتی تھیں۔
سوکھے کے موسم میں ماتم کرنے والا یہ شہر
اب توفیض کی وہ نظم بھی نہیں دیکھتا
جس میں لکھا تھا
''سوچنے دو''
وہ نظم جو کہا کرتی ہے
''ہم سے اس دیس کا تم نام ونشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد بھی آئے تو محبوب گذشتہ کی طرح

روبرو آنے سے جی گھبرائے"
اب گرم اندھیرے میں یہ ڈوبا ہوا شہر
کوئی ٹائیٹنک بھی نہیں
کہ دریافت ہو
اس کہانی کے ساتھ
جس میں ایک روز تھی
ایک جیک تھا
جن کا قصہ ڈوبتا ہوا خیال بنا
تیرتا ہوا خواب بنا!!
اب تو یہ شہر جرم کا جزیرہ ہے
جو سکڑنے کے بجائے
پھیلتا ہی چلا جاتا ہے
آنکھ میں آنسو کی طرح!!

مجھے اپنے دل میں دفن کرو

کوئٹہ کے کیرانی روڈ پر قتل ہونے والے انسانوں کو اگر اسی رات کی تلخ تاریکی میں دفن کیا جاتا تو کل ان کے سوئم کی رسومات ادا کی جاتیں۔ مگر ان کے جسد خاکی تین دنوں تک کھلے آسمان تلے خاموش احتجاج کرتے رہے۔ بلوچستان کی یخ بستہ ہواؤں میں ان کے سفید کفن امن کے اداس پرچموں کی طرح لہراتے رہے۔ کوئٹہ کے غمگین آسمان کے تارے ان پر شبنمی اشک نچھاور کرتے رہے۔ اور ہم سب دیکھتے رہے۔ ہم جو مردہ انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں مگر سن نہیں سکتے۔ اگر ہم قتل کیے جانے والے انسانوں کی آواز سن پاتے تو پھر یا ہم پاگل ہو جاتے یا انقلابی! مگر ہم نہ پاگل ہیں نہ انقلابی۔ ہم بہت سیانے اور بیحد بزدل لوگ ہیں۔ اس لیے ہم صرف اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ان جنازوں کو دیکھ سکتے ہیں جنہیں بڑی مشکل سے جوڑا گیا۔ قدرت انسان کو عظیم تخلیق کی طرح ٹکڑوں سے جوڑ کر بناتی ہے اور دنیا کی سفاکیت اسے بارود سے توڑ کر ٹکروں میں بکھیر دیتی ہے۔ انسان کی ہستی وہ جگسا پزل ہے جو ایک بار بکھر جائے تو پھر اسے اسی صورت میں جوڑا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی ماہر سرجن اسے جوڑنے کی کوشش بھی کرے، اگر وہ بکھرے ہوئے انسانی اعضاء کو بہت باریک سے دھاگے میں پروتا بھی رہے تب بھی اس منظر کا عنوان "محبت مردہ پھولوں کی سمفنی" ہی بن پائے گا۔ مردہ پھولوں کی وہ سمفنی جسے سن کر انسان تو کیا پتھر کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی مجبور محبت کیا کرے؟ وہ اپنے پیاروں کے بکھرے ہو۔

وجود کے پرزے جوڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ گو وہ جانتی ہے کہ ایک ٹوٹا ہوا دل تو پھر سے جوڑا جا سکتا ہے مگر ایک شکستہ وجود کو جوڑنے کا ہنر تو انسانی ہاتھ کبھی کر ہی نہیں سکتے۔ حالانکہ انسانی ہاتھوں نے ارتقاء کے سفر میں بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے اپنی نرم و نازک انگلیوں سے فلک بوس پہاڑوں کو پرزوں میں تبدیل کر کے ان میں سے ایسی راہیں تراشی ہیں جن پر انسان اس طرح سفر کر سکتا ہے جس طرح مچھلی پانی میں!

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے سرکش طوفانوں کا نہ صرف مقابلہ کیا مگر ان پر غالب بھی آئے!

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے مچلے ہوئے دریاؤں کے رخ موڑ دیے۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے ایک اشارے سے خلا کے خطرناک زرہ کو چھید کر اس میں سے اپنا راکٹ نکالا اور چاند کی سیر کر کے واپس آیا۔

وہ انسانی ہاتھ جو گہری پستیوں سے پھسلے مگر پھر بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اوپر آتے گئے۔ اوپر، اتنا اوپر کے اس نے ستاروں کو چھونے والی عمارتیں تعمیر کیں۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے فطرت کی سرکش قوتوں سے پنجہ آزمائی کی اور کامیاب رہے۔

وہ انسانی ہاتھ جو ہومر کی اوڈیسی میں تلوار لیکر دیوتاؤں سے لڑے۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے آگ جیسی ہولناک حقیقت کو ماچس کی ڈبیا میں قید کر دیا۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے سردی کو گرمی اور گرمی کو سردی میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے ڈائنوسار سے مقابلے کیے۔ جنہوں نے جیتے جاگتے اور دھاڑتے ہوئے شیروں کو کاغذ کی طرح پھاڑ کر پھینک ڈالا۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے سمندروں کو مصنوعی ساحلوں کی زنجیروں سے جکڑا اور

ان سے ساحلوں کی کنواری اور بھیگی ہوئی رات پر اپنا نام لکھا۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے صرف پاور پر غالب آنے والی پاور پیدا نہیں کی مگر ان انسانی ہاتھوں نے پیار بھی کیا۔

ان ہاتھوں نے سوکھی ہوئی لکڑی سے ایسا ساز بھی بنایا جسے سن کر انسانوں اور پرندوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ان انسانی ہاتھوں نے موسیقی تشکیل دی۔ وہ نغمہ زن ہوئے۔ انہوں نے مصوری کی اور مونالیزا جیسا کبھی نہ مٹنے والا نقش بن گئی۔

ان انسانی ہاتھوں نے جنگل اجاڑنے کے جرم کا مداوا کرتے ہوئے ایک چھوٹے سے گملے میں رات کی رانی کا پودہ رکھا۔ اسے پانی دیا۔ اور رات صبح تک روتی رہی۔

ان انسانی ہاتھوں نے برف کے مجسمے بنائے اور تاج محل تعمیر کیا۔

ان انسانی ہاتھوں نے چند لفظ لکھے اور وہ گیت بن گیا۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے صرف شاخ گلاب سے نوچ کر ایک پھول کو شہید ہی نہیں کیا مگر اس پھول کو اس نے کسی کے بالوں میں سجایا اور دھرتی کے سارے گلاب اپنی اداس قسمت پر اوس کے آنسوؤں میں ڈوب گئے۔

وہ انسانی ہاتھ جو ایک عہد سے ترسے ہوئے ہاتھوں سے مس ہوئے اور محبت نے پہلی بار جنم لیا۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے محبت کی ملاقات کو تحفہ دینے کے لیے مہندی لگائی۔ جنہوں نے کسی کو ایک آزاد کڑی سے جکڑتے ہوئے ایک سونے کی انگوٹھی پہنائی۔

وہ انسانی ہاتھ جنہوں نے جذبات میں جلتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا اور بے رحم آسمان جیسی انسانی آنکھوں میں بادل امڈ آئے۔

وہ انسانی ہاتھ جن کی بیحد مضبوط انگلیوں نے آنسوؤں کی نمی محسوس کی اور۔۔۔۔!!

وہ انسانی ہاتھ جو دعا کی صورت قبائے الاہی سے لپٹے اور خالی نہ لوٹے۔

مادی اور روحانی حوالے سے بیحد مضبوط یہ انسانی ہاتھ اس وقت بہت کمزور پڑ

جاتے ہیں جب اسے اپنے پیارے کا جسد خاکی اٹھانا پڑتا ہے۔

جراحت میں سائنس کے عظیم جلوے دکھانے والے یہ ہاتھ اس وقت بچوں کی طرح چیخنے لگتے ہیں جب اسے قدرت کے سب سے قیمتی کھلونے کے ٹوٹے ہوئے وجود کو پھر سے جوڑنا پڑے!!

جب اسے ایک شکستہ جسم کو جوڑنے کا ٹاسک ملتا ہے تب انسانی ہاتھ درد کی آگ میں جلنے لگتے ہیں۔ کوئی کیسے جوڑے اس تن کو جس کو خدا نے جوڑا تھا۔ ایک جذبے کی طرح! ایک احساس کی مانند!!

ایسی کچھ مشکل آن پڑی تھی، ان ہاتھوں پر جنہیں پھر سے جوڑنا پڑا ان انسانوں کے وجود کو جو کوئٹہ کے کیرانی روڈ پر بارودی دھماکے سے ٹکڑوں کی صورت بکھر گئے۔

ہمیں تو صرف اپنا دکھ ہے۔ یاد کھ ہے ان انسانوں کا جو اپنے پیاروں کے تابوتوں کے پاس بیٹھے آنسو بہارہے ہیں۔ مگر اندازہ کریں اس دکھ کا جو شکستہ جسموں والے انسانوں سے کسی ناقابل برداشت خوشبو کی طرح پھوٹ رہا ہے اور جس مہک نے پورے ملک کے ماحول کو ایک تڑپاتی ہوئی خوشبو سے بھر دیا ہے۔

وہ انسان جو ہزارہ قبیلے سے تعلق رکھنے کے جرم میں قتل کیے گئے۔ وہ انسان جنہیں جینے کی بہت زیادہ خواہش تھی۔ وہ انسان جو ایک ترسی ہوئی شمع کی مانند ابھی جلے بھی نہیں کہ انہیں بارود سے بجھایا گیا۔ وہ انسان جو اپنے جسم کو قابل دید بنانے کے لیے جم جایا کرتے تھے۔ جو بھوک میں واک کیا کرتے تھے۔ جو اپنے شکم کو بھوک سے آشنا کرتے ہوئے اپنے آپ کو کسی مجسمے کی مانند تراشنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

جب ان انسانوں کے جسموں کو مٹی کے کھلونے کی طرح توڑا گیا تب ان کے اس انجام پر ان سے محبت کرنے والے تو بہت روئے۔ انہوں نے تو خوب ماتم کیا۔ انہوں نے تو اپنی آنکھ سے آخری قطرے کو بھی نچوڑا۔ مگر وہ انسان کچھ بھی نہ کرپائے جو بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر وہ سب کچھ کرنے کی تڑپ بارود سے جلی ہوئی آگ میں ٹھنڈی ہوگئی۔ وہ انسان جن کی آنکھیں نہ سو سکتی ہیں اور نہ رو سکتی ہیں۔ وہ انسان کوئٹہ کی قاتل سردی میں کفن کے ایک باریک سے کپڑے میں لپٹے صرف یہ حسرت کرتے

رہے کہ "مرے درد کو جو زباں ملے"

کوئٹہ کے کیرانی روڈ پر زندگی کا سفر تمام کرنے والے وہ لوگ تابوتوں میں پڑے پکارتے رہے مگر ان کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ ان کی صدائیں بلوچستان کے پہاڑوں سے اپنا سر ٹکرا کر واپس ان تابوتوں میں پناہ گزیں ہوئیں جن تابوتوں پر مائیں، بہنیں اور بیٹیاں سر ٹکرا کر پوچھ رہی ہیں کہ "انہیں کس جرم میں قتل کیا گیا؟" مگر وہ جنازے، وہ جسد خاکی بظاہر خاموش ہیں۔ مگر کوئٹہ کے سوگوار نظارے جانتے ہیں۔ ایک سرد شہر پر درد کی علامت بن کر چمکنے والے ستارے جانتے ہیں کہ وہ لوگ خاموش نہیں ہیں جنہیں سفاک سیاست نے بے رحمی سے بارودی آگ سے جلا کر انہیں ٹکڑوں میں بکھیر دیا۔ وہ ٹکڑے جنہیں انسانی ہاتھ تو کیا اب تو محبت بھی نہیں جوڑ سکتی۔

محبت بہت عظیم ہے۔ مگر زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتی ہے؟ کسی کے لیے دعا کے ہاتھ اٹھانے اور کسی کی قبر پر مٹی کا دیا جلانے کے علاوہ محبت اور کیا کر سکتی ہے؟ کوئٹہ کے مقتل جیسے ماحول میں احتجاج کرنے والی محبت صرف ماتم کر سکتی ہے۔

اور وہ محبت ماتم کرتی رہی!!

مگر کفن پوش بے گور لاشے کچھ کہنے کی کوشش کرتے رہے۔ اپنی سوکھی ہوئی زبانوں کے ساتھ! اپنے کٹے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ! اپنے بکھرے ہوئے وجود کی معرفت وہ کچھ کہتے رہے گذشتہ تین دنوں سے!! ممکن ہے کہ کسی کے دل میں یہ بھٹکا ہوا احساس بھی آنکلا ہو کہ یہ نعشیں بہت جلد دفن ہونے کے تمنائی ہیں اور ممکن ہے کہ ایسا کچھ سوچنے والے صحیح بھی ہوں مگر سوال ہے کہ کہاں؟ یہ لاشیں کہاں دفن ہونا چاہتے ہیں؟ اس سوال پر کسی نہیں سوچا۔ پورا ملک ان کے احتجاج میں دھرنا دیے بیٹھا رہا۔ مگر بہت کم لوگوں کو سمجھ میں آیا کہ کوئٹہ کے کیرانی روڈ پر اپنے آپ سے بچھڑ جانے والے معصوم مسافر کس منزل کے تمنائی ہیں؟ وہ بہت جلد یا بڑی دیر سے دفن ہونا چاہتے ہیں مگر کہاں ؟؟؟

وہ انسان اس دھرتی میں دفن ہونا نہیں چاہتے جس دھرتی پر زندگی کے مسافروں کو منزلوں کے ساتھ مغوی بنایا جاتا ہے۔

وہ انسان اس زمین میں داخل ہونا نہیں چاہتے جہاں سیاست سفید و سیاہ پرچم لہرا کر اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

وہ انسان سیاست کے کوزوں میں قید ہونے سے انکار کرنے والے سمندر ہیں۔

وہ انسان اس دھرتی سے بہت ناراض ہیں جو جس دھرتی پر سیاسی بازیگر اچھلتے اور کودتے ہیں۔

میں اس احتجاج مسلسل کو گذشتہ تین دنوں سے اس طرح دیکھتا رہا کہ یہ انسان محبت کرنے کے لیے پیدا ہونے والے یہ انسان بلوچستان کی سنگ لاخ دھرتی میں دفن ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔

ان انسانوں کا اصرار ہے کہ ہم انہیں اپنے دل میں دفن کریں۔

مگر ہم لوگ سیاستدانوں کی بکواس سننے کے عادی ہم لوگ! مردہ زندوں کی باتیں تو سن سکتے ہیں مگر بارودی بے وفائی کے ہاتھوں بکھر جانے والے ان زندہ مردوں کی صدائیں نہیں سن سکتے۔ جو کہہ رہے ہیں کہ ہمیں عزت کے ساتھ دھرتی میں نہیں بلکہ محبت کے ساتھ اپنے دل میں دفن کرو۔ مگر اپنے دل کو معصوموں کا قبرستان بنانے کے لیے ہمیں اپنے دل میں اگے ہوئے مجرم خیالات کا پورا جنگل صاف کرنا پڑے گا۔ انہیں ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں بسانے کے لیے ہم اپنے سینے میں موجود جنگل بھی صاف کر دیتے اور ہم سن پاتے ان شہیدوں کی صدائیں جو اپنے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے ہمیں کہہ رہی ہیں کہ ”ہمیں اپنے دل میں دفن کرو“

اگر ہم اس مردہ محبت کی صدا سن پاتے تو پھر یا ہم پاگل ہو جاتے یا انقلابی!!

اور ہم جو نہ پاگل ہیں نہ انقلابی۔ بس دیکھتے رہتے ہیں۔ اس ”سیلانی“ کی طرح جو درد کے سمندر میں مسلسل سفر کرتا رہتا ہے۔

عباس ٹاؤن

اب عباس ٹاون کی جانب جاتی ہوئی ابوالحسن اصفہانی شاہراہ پر سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔ اور جب وہاں کے مکینوں سے تلاشی لی جاتی ہے تو بہت سارے افراد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ روح کا زخم بن کر ابھر آتی ہے۔ گویا ان کی مسکراہٹ کہتی ہے کہ ''تم اس وقت کہاں تھے جب وہ بارود سے بھری گاڑی ریت اور سیمنٹ سے بنی ہوئی اس بستی میں داخل ہو رہی تھی جو اس وقت درد کی چبھتی بو لیے کھنڈر بنی کھڑی ہے'' اب جہاں نوحے بج رہے ہیں وہاں بچوں کی ہنسی کے معصوم ساز گونجا کرتے تھے۔ مگر اب وہاں کچھ نہیں۔ اور بہت کچھ باقی بھی ہے۔ وہ گیلریاں نہیں جہاں پر بچے ایک دوسرے سے بلند آواز باتیں کیا کرتے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ عباس ٹاؤن کے سامنے والی سڑک پر پھول بیچنے والا مزدور زندہ بھی ہے یا نہیں۔ حالانکہ اس کے پھولوں کی دوکان عباس ٹاؤن سے کچھ فاصلے پر ہے مگر کیا معلوم وہ کوئی چیز لینے گیا ہو اور ابھی تک نہ لوٹا ہو۔ اور دھماکے کے بعد مردہ پھولوں کی سمفنی کے سروں تلے دب گیا ہو؟

ہمیں کیا پتہ؟ ہم تو قاتلوں کو نہیں جانتے ہم مقتولوں کو کیا جان پائیں گے؟

کوئی سنی تھا۔ کوئی شیعہ تھا۔ کوئی سندھی تھا کوئی پنجابی اور کوئی وہ جس کے آگے ''اردو بولنے والا'' لکھا جاتا ہے۔ وہ اس جگہ سب اردو بولا کرتے تھے۔ مانا کہ وہ ثقیل اردو نہیں تھی۔ وہ عوامی اردو تھی۔ کراچی کی شہری زبان۔ نت نئے محاوروں سے

آراستہ مختلف لہجوں کی لگاوٹ سے پھلتی پھولتی عوامی اردو۔ مگر اب وہاں نوحوں کی صورت صرف درد کی زباں بول رہی ہے اور وہ سب لوگ چپ ہیں جو کبھی بہت زیادہ بولا کرتے تھے۔ وہ آنکھیں کہاں ہیں جو کہا کرتی تھیں کہ "مجھے بولنے سے مت روکو۔ کبھی ایسا خاموش ہو جاؤں گا کہ چیختے رہ جاؤ گے" اب وہ چیخ رہے ہیں بچوں کے شور پر نہیں مگر ان کی اس خاموشی پر جو نا قابل برداشت ہے۔

مائیں ہمیشہ کہتی رہتی ہیں کہ بچے کو سلانا بہت مشکل ہوا کرتا ہے۔ مگر عباس ٹاؤن کی ماؤں سے پوچھو وہ کہیں گی کہ "بچے کو جگانا ناممکن ہے" اس بچے کو جو ماں کی آغوش سے اچھل کر موت کی آغوش میں سو گیا۔

ہر ماں اپنے بچے کو سلانے کی لیے لوری گاتی ہے۔ مگر عباس ٹاؤن کے مقتول بچوں کی مائیں بچوں کو اٹھانے کے لیے لوریاں گا رہی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ انسان بیج نہیں کہ مٹی سے پھوٹے۔ مگر وہ پھر بھی گائے جا رہی ہیں کہ:

"اٹھو اب ماٹی سے اٹھو
جاگو میرے لال"

وہ لال جو اپنے لہو کی چادر تانے سو رہے ہیں اور اماں اکیلی جاگ رہی ہے۔

وہ اماں کیسے سوئے جس کا لال وادی حسین کی ویران تنہائی میں سو رہا ہے؟ وہ لال جس نے ابھی بولنا نہ سیکھا تھا مگر اماں اس کی ہر بات سمجھا کرتی تھی اور اس ملک کے ہر کونے میں موجود وادی حسین میں ایسے لال بھی سوئے ہیں جو کمسن نہ تھے۔ جو ابھی ابھی بڑے ہوئے تھے مگر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگے تھے۔ وہ آزاد نوجوان جن کے پیروں میں ابھی پیار کی بیڑیاں نہیں پڑی تھیں۔ جو کہا کرتے تھے کہ "ہم شادی نہیں کرینگے" جو بہت بولتے تھے اور اماں کو ان کا ایک لفظ بھی پلے نہ پڑتا تھا۔ ان کی خاموشی بہت تکلیف دے رہی ہے، ان ماؤں کو جنہوں نے بچوں کو اپنی کوکھ سے اس لیے جنم نہیں دے تھا کہ وہ ایک آگ کا شعلہ بن کر ہمیشہ کے لیے بجھ جائیں!!

اتوار کی شام کے بعد اب کے ای ایس سی عباس ٹاؤن کی بجلی بند نہیں کرتی۔ مگر اب کیا فائدہ؟ جب بچے گرمی کی وجہ سے سو نہیں سکتے تھے۔ تب تو بجلی آتی نہیں تھی

اور اب جب بچے منوں مٹی کے تلے سوئے ہیں تب بجلی چوبیس گھنٹے چل رہی ہے۔ کیوں؟ کیا وہ ٹوٹی ہوئی بالکنیاں دکھانے کے لیے جہاں پھولوں کے پاس پھولوں سے زیادہ حسین اور نازک بچیاں اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ دیر تک باتیں کیا کرتیں تھیں۔ اب وہاں پر صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ کہاں ہیں وہ دروازے جن کے کھلنے اور نہ کھلنے پر جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ کہاں ہیں وہ کھڑکیاں جو اکثر بند رہا کرتی تھیں۔ اب وہاں پر کچھ نہیں ہے۔ اب زندگی کے اجڑے ہوئے وجود پر لہو سے چپکنے والا وہ پیرہن پڑا ہوا ہے جس کی جیب کو رفو کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

عباس ٹاؤن کے مکین اتنے امیر نہیں تھے۔ اگر امیر ہوتے تو سہراب گوٹھ کے قریب سکونت پزیر نہ ہوتے۔ وہ تلاش کرتے کلفٹن کا ایک ایسا فلیٹ جس میں سمندر کی ہوا ترقی کے ساحل کا پتہ دیتی ہے۔ مگر وہ لوگ غریب تھے۔ جو بچپن سے ''شام غریباں'' سن کر آنکھوں کو بصارت کی آخری بوند تک نچوڑا کرتے تھے۔ اور ان غریبوں پر ایک قاتل شام ایسی بھی آئی کہ کراچی کی ساری سڑکیں نہر فرات بن گئیں اور اس کے کنارے پڑی رہیں ان کی لاشیں جو اپنی زندگی میں ''لکھ لٹ'' لوگ تھے۔ جو وفادار تھے۔ سراپا محبت و ایثار تھے۔ جنہیں دیکھ کر زندگی سے پیار سا ہو جاتا تھا۔ اب وہ لوگ وہاں نہیں۔ وہ سب وادی حسین کی اس مٹی میں مدفون ہیں جو فقیر کے کشکول کی طرح بھرنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔

عباس ٹاؤن سے رشتہ صرف ان لوگوں کا نہیں تھا جو سارے رشتوں کے قید سے آزاد ہو کر ایسے سو رہے رہیں جیسے جانتے نہ ہوں۔ پہچانتے نہ ہوں !! مگر عباس ٹاؤن کو وہ لوگ بھی پہچانتے ہیں جو اب وہاں نہیں رہتے۔ جو کہتے ہیں کہ ''ہم بد قسمتی سے نکل گئے'' وہ لوگ جو یہاں پیدا ہوئے تھے۔ جن کے لیے عباس ٹاؤن ایک ایسا شہری گاؤں تھا۔ جس میں ایک مخصوص مہک ہوا کرتی تھی۔ جس کے چنے پاپڑی کی لذت الگ ہی ہوا کرتی تھی۔ جس کی بریانی بہت لذیذ تھی اور جس کی دوپہر بہت ظالم اور جس کی شام بہت مہرباں ہوا کرتی تھی۔

مگر اب کچھ نہیں ہے۔

اب اگر ہے تو عباس ٹاؤن کے باسیوں کے رخساروں پر اڑتی ہوئی ریت جیسے احساسات کا وہ منظر جسے اگر فیض احمد فیض کی شاعری میں منتقل کر دیا جائے تو ہماری آنکھوں میں یہی حروف اتریں گے کہ:

"اب نہ دید ہے نہ سخن
اب نہ حرف ہیں نہ پیام
کوئی بھی حیلہ تسکیں نہیں
اور آس بہت ہے
امید یار، نظر کا مزاج درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو
کہ دل اداس بہت ہے"

آج عباس ٹاؤن کا دل بہت اداس ہے۔ وہ عباس ٹاؤن جو یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہے "صرف ہم ہی کیوں؟"

اب بھی اگر گلستاں کو لہو کی ضرورت پڑے تو اب بھی عباس ٹاؤن کے مکین یہی کہیں گے کہ "سب سے پہلے ہماری گردن کاٹو"

وہ بہت غیور لوگ تھے۔ شوق شہادت سے شرابور۔ بیحد عجیب لوگ۔ مال کے حوالے سے بہت مسکین مگر حال کے حوالے سے بہت امیر لوگ۔ جو اس ٹوٹے اور بکھرے ہوئے شہر میں جڑ کر جیتے تھے۔ نوروز کے بعد ختم ہونے والی سندھ اسیمبلی کی ڈپٹی اسپیکر شہلا رضا بھی ماضی میں اس عباس ٹاؤن کی ایک مورت ہوا کرتی تھیں جسے واقعے والے روز ووٹر نہیں بلکہ وہ لوگ یاد آئے جن کے نام وہ کبھی نہیں بھلا سکتی۔

وہ مقام جہاں زندگی مسکراتی تھی۔ وہاں پر آنسوؤں کی بارش برس رہی ہے۔ اب اس مقام پر زندگی رو رہی ہے۔ زندگی جس کا حاصل چند اشک ہی ہوا کرتے ہیں۔

پیر کی شب شام غریباں کے قافلے میں شامل ہونے والے لوگوں کو کچھ دنوں کے بعد ہم بھول جائیں گے۔ مگر کس طرح بھول پائیں گے وہ لوگ جو کپڑے کے خیمے جلنے کی باتیں سن کر روتے تھے۔ ان کے تو سیمنٹ سے بنے ہوئے خیمے بھی جل گئے۔

اب وہ میدان پر بس رہے ہیں۔ اپنے پیاروں کی یادیں دل میں لیے!

اب وہ جہاں بھی جائیں گے شہداء عباس ٹاؤن کی یادیں ان کے ساتھ چپکی رہیں گی۔ اور یہی درد ان کے لیے سرمایہ حیات ہو گا۔ وہ لوگ جو صرف شیعہ نہیں تھے۔ جو سنی تھے۔ مگر ان کا تعلق کسی جماعت سے نہ تھا۔ جن کا مسلک مزدوری تھا۔ جن میں سے بہت ساروں کی پیشانیوں پر نشان نماز نہیں مگر ان کے کندھوں پر نشان محنت موجود تھے۔ وہ محنت کش انسان جنہوں نے دو پشتوں کی جدوجہد کے بعد زمین سے اوپر اور آسمان کے نیچے ایک فلیٹ نما آشیانہ بنایا تھا۔ اس آشیانے کو بارودی بجلی سے جلا کر خاک کر دیا گیا۔ بم دھماکے کا نشانہ بننے والے وہ جڑواں اپارٹمنٹ خزاں رسیدہ درختوں کی طرح کھڑے ہیں اور وہ ہمدردی کی ہر بہار سے ناراض ہیں۔ اس بستی کے اجڑنے پر شہر میں افراتفری کے سوا اور کیا ہوا؟ ہم سب اس تلخ حقیقت سے واقف ہیں کہ عباس ٹاؤن غریبوں کا آشیانہ تھا۔ اس لیے بہت کچھ ہونے کے بعد بھی کچھ نہیں ہوا۔ کیوں کہ عباس ٹاؤن نائن زیرو نہ تھا۔ اگر ایسا واقعہ نائن زیرو کے قریب بھی ہوتا تو کراچی میں ایک قیامت آجاتی۔ مگر عباس ٹاؤن میں قیامت آگئی اور سیاست شہر اپنی دھن میں دھمکیوں سے کام چلاتی رہی۔ عباس ٹاؤن میں زندگی چلاتی رہی مگر شہر چلتا رہا۔ بس یہ ہوا کہ ٹریفک جام کی وجہ سے شہر کی شاہراہوں کی نبض کچھ دھیمی ہو گئی۔ مگر شہر تو چلتا رہا۔ شہر چل رہا ہے۔ شہر چلتا رہے گا۔ لیکن عباس ٹاؤن میں وہ لمحہ رک سا گیا ہے جو درد کے بھیانک بوجھ سے بھرا ہوا لمحہ ہے۔

اب عباس ٹاؤن کے سامنے والی سڑک سے گذرتے ہوئے اس اجڑی ہوئی بستی سے وابستہ بہت ساری یادیں راہ چلتے ہوئے مسافروں کے قدموں سے لپٹتی رہیں گی۔ اور اصرار کرتی رہیں گی کہ صرف نئی تعمیر ہونے والی کوٹھیوں کی طرف مت دیکھو۔ اک نظر اس بستی پر بھی ڈالو جو کبھی خطرناک حالات میں بھی خوش رہا کرتی تھی مگر اب تا ابد اداسی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ جس بستی کے سارے دروازے جل کر راکھ ہو گئے ہیں اور جس میں داخل ہوتی ہوئی ہوا اپنے ہاتھوں میں جلے ہوئے خوابوں کی خوشبو اٹھائے شہر میں دیوانہ وار پھرتی ہے۔

جس وقت عباس ٹاؤن میں دھماکہ ہوا تھا اس وقت کراچی کی بلند عمارات سے بڑھکتے ہوئے شعلوں کا منظر نظر آرہا تھا۔ پھر اس آگ کو بجھا دیا گیا۔ مگر عباس ٹاؤن میں لگی ہوئی آگ ہی نہیں وہاں کے مکینوں کے سینوں میں جلتے ہوئے دلوں کے چراغ بھی بجھ گئے ہیں۔ اب وہاں پر سورج ڈھلتے ہی سرچ لائٹس جل اٹھتی ہیں۔ مگر پھر بھی اندھیرا وہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لے رہا۔

عباس ٹاؤن کے شکستہ آشیانے سے رشتے داروں کے گھر میں مظلوم مہمان بن کر رہنے والی معصوم بچی اپنے خواب میں کبھی نہ ختم ہونے والی رات میں سفر کر رہی ہے اور بند آنکھوں سے جلے ہوئے گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ ہلا کر بار بار کہتی ہے کہ ”رات کب ختم ہو گی؟ سورج کب نکلے گا؟ روشنی کب ہو گی؟

اداس عقاب

لوڈشیڈنگ کی اس رات میں اگر جنریٹر نہ چلایا جاتا تو وہ ماحول ادب کے اداس لمحات کی کیفیت کو مزید شدید بنادیتا جس تاریک رات کی تنہائیوں سے دیوار پر لٹکتی ہوئی دو لالٹین معصوم مجاہدین کی طرح مسلسل لڑ رہی تھیں۔ اور ان کی رومانٹک روشنی میں بیٹھے ہوئے تھے کراچی اور حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے وہ سندھی ادیب جو پچاس برس کی پت جھڑ جیسی عمر میں بجلی کا انتظار کرتے سوچے جارہے تھے کہ ”کیا کھویا؟ کیا پایا؟؟“ اور کبھی نہ سلجھنے جیسے اس سوال پر شیخ ایاز کا یہ شعر مسکرائے جارہا تھا کہ:

”سونے جیسی جوانی
کو چھین کر
بال چاندی کیے
عمر مجرم ہے تو!“

زندگی پر الزام دھرنے والو! کیا تم خود مجرم نہیں ہو؟

بہت عرصہ قبل حالات سے تنگ آکر خودکشی کرکے مرنے والے کسی ادیب کی روح نے پراسرار پردے کو سرکاتے ہوئے کہا اور ماحول چونک پڑا!

وہ سب مضطرب تھے کہ دس بجے سے قبل اپنی اپنی ”عافیت“ کے پاس پہنچ جائیں ورنہ ”خیریت“ نہیں ہے۔ معاشرے کو بغاوت پر بھڑکانے پر فخر کرنے والے،

یہ عالمی ادبی تحریک کے کارکنان جن کی تعداد اب خاکسار تحریک والوں کی طرح کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے۔ وہ اپنے قلم کے بیلچے اٹھا کر کب تک پھریں گے؟ تب تک؟ جب وہ کسی سستے یا مہنگے ہسپتال کے بستر پر دھڑام سے گر جائیں اور قلمی بیلچے ان کی قبر کھودنے سے لگ جائیں اور میڈیا میں ان کے حوالے چند دنوں کا افسوس کسی سستی سگرٹ کے دھوئیں کی مانند بہت جلد بکھر جائے!!

وہ سارے سوداگران ادب سوچ رہے تھے جنہوں نے جوانی میں سپنوں کا سوداگر بننے کی ٹھانی اور اپنے نازک پروں پر بھاری بھاری خواب رکھ کر محوِ پرواز ہوئے ستاروں میں اپنا آشیانہ تلاش کرنے کے لیے!!

اور اس عمر کا موڑ گزار کر آنے والے ایاز نے بھی یہی لکھا تھا کہ:

"عقاب اپنے آشیانے کی طرف
لوٹ رہا ہے!!
کتنی دیر تک اس کے پروں نے
سنگلاخ پہاڑوں پر سایہ برسایا
میں مانتا ہوں کہ عقاب بوڑھے نہیں ہوتے
اور نہ وہ تھکتے ہیں!!
مگر یہ اور بات ہے کہ
شام کا سورج
پہاڑوں کے اس پار
ڈھل رہا ہے!!
رات کی تاریکی پھیلتی جارہی ہے
اور عقاب اپنے نشیمن کی طرف لوٹ رہا ہے"

اور فیض نے بھی تو کہا ہے کہ:

"لوٹ کر آکے دیکھا تو
پھولوں کا رنگ

جو کبھی سرخ تھا
زرد ہی زرد ہے!!
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں
درد ہی درد ہے!!"
مگر کیا درد صرف یہاں تھا؟

کیا درد کا فقیر صرف ان ادیبوں اور شاعروں کے دروں پر دستک دے رہا تھا، جن کے پاس ویسے تو زندگی کی ساری بنیادی ضروریات سے کچھ زیادہ ہی ہے مگر وہ اس دیس کے درد کے ترجمان ہیں جس کا بدن زخموں سے چور ہے اتنا کہ اس سے درد بھی یہ پوچھتا ہے کہ "کہاں سے اٹھوں"

وہ دیس جو ہر رات مچھروں سے لڑتے اور ستاروں سے جھگڑتے ہوئے گزارتا ہے۔

وہ دیس جو ان ادیبوں کے لیے ایسا بن گیا ہے جیسے فیض نے لکھا ہے کہ:

"مجھ سے اس دیس کا
تم نام نشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد بھی آئے تو محبوب گذشتہ کی طرح
روبرو آنے سے جی گھبرائے!"

ان ادیبوں نے ان لوگوں سے عظیم عشق کا دم بھرا تھا جو گمنامی میں جیتے اور گمنامی میں مر جاتے ہیں۔ جن کے نام بھی سوچ کر نہیں رکھے جاتے۔ جو جمعے کے روز پیدا ہوتا ہے اس کا نام "جمعہ" رکھ دیا جاتا ہے۔ جو گورا پیدا ہوتا ہے اسے "چٹہ" پکارا جاتا تھا۔ جن کے نام مقدس صحیفوں میں تلاش نہیں کیے جاتے۔ جن کے نام پیروں فقیروں اور نجومیوں سے پوچھ کے نہیں رکھے جاتے۔ جو خس و خاشاک سے ہوا کرتے ہیں اور انہیں قومی شناختی کارڈ میں بھی "کانڈیرو" لکھا جاتا ہے۔ ببول کے درخت جیسی

غربت میں جینے والے وہ لوگ خود کش حملہ آور کیوں نہیں بن سکتے؟ ایک کالعدم تنظیم کا سربراہ تو سندھ میں اپنا کام بڑھانے کی پلاننگ کرتے ہوئے سوچتا ہے مگر نہیں سوچتے تو یہ ادیب جو اب "سندھ دوست سیاستدانوں" کی تلاش میں پمفلٹ بانٹتے ہوئے اس وقت تھک جاتے ہیں جب ایک نظریاتی امیدوار ایک وڈیرے سے ہار جاتا ہے۔ اور نیم ادبی اور نیم سیاسی مزاج رکھنے والے "فیس بک" کے سرگرم کارکنان اس سندھی عوام کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں جس میں شاہ لطیف کی زباں میں اپنے درد بیان کرنے والی وہ ماں بھی شامل ہے جس کی جوان بیٹی کو بغیر کسی جرم کے قتل کیا گیا!!

سندھ تو وہ سانحہ ہے جس کا سوگ بھی نہیں منایا جاتا!!

نہ جانے کس کس کی روح کس کس طرح زخمی ہوا کرتی ہے؟ ہر شب ہر روز!!

فرشتے سندھ میں بسنے والے انسانوں کے درد رقم کرتے ہوئے تھک چکے ہیں!!!!

وقت کیوں نہیں ٹھہر جاتا؟ درد تھمتا کیوں نہیں؟ اس بچی کے لیے جس کی ماں بیماری میں علاج نہ ہونے کے باعث مر گئی اور بہت چند افراد اس کو دفنانے کے لیے جا رہے ہیں!!

سندھ صرف شدید گرمی میں طویل لوڈ شیڈنگ کا نام نہیں ہے۔ سندھ ان جیلوں میں قید بے گناہ قیدیوں کے لمحات بھی ہیں جو وہ بند کھولیوں میں بسر کرتے ہیں۔ وہ سندھ جسے بتایا گیا ہے کہ "درد صرف مرد ہی سہتے ہیں"

اور بہت دور ساحلی سندھ کے تاریک دیہات میں ٹھٹہ اور بدین میں بسنے والے لوگوں کی شادیوں میں وہ ماتمی لوک گیت شب کے پرندوں کی طرح نمکین ہواؤں میں اڑنے لگتے ہیں۔

سندھ ایک سسکی ہے!

کیا چار لفظ اس مظلوم محبت کے لیے کافی نہیں ہیں؟ جس کو وڈیرے دماغ کا خلل کہا کرتے ہیں۔

زیرو پوائٹ کے قریب میلی اجرکوں میں ملبوس چند سوکھی سانولی لڑکیاں اور چند زرد رنگ بیمار عورتیں دھیمے سروں میں اس "دودے" کی تعریف کر رہی ہیں جسے

ایک ابھرتے ہوئے سورج کی طرح ایک اداس لڑکی کی زندگی میں "سویرا" بکھیرنا ہے!! مگر اس لڑکی کے قبیلے سے تعلق رکھنے والی عورتیں بھڑکیلے مزاج مردوں سے تو نہیں مگر "بارش" نامی اپنی اس سہیلی سے ضرور کہتی ہیں کہ:

"اے بارش!

میرے اپنوں نے
کشتی میں ایک شیر سوار کرکے
مجھے بھیجا!!
میں اس شیر کی وجہ سے نہیں مری
مجھے اپنوں کی اس محبت نے مار ڈالا!!"

مگر ہر انسان کو اپنے حصے میں آنے والی آگ کی تپش محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے ایئرکنڈیشن ٹرپ ہو جانے کی شکایت کرنے والے بچوں کے باپوں کو اپنے گھر کی فریادیں سننے سے وقت ہی نہیں ملتا جو وہ فکر کریں ان "بیچارے لوگوں" کی۔ جن کے گندے کپڑے گوگول اپنے آنسوؤں سے دھوتا تھا اور اس پانی کو سیاہی بنا کر وہ ناول لکھا کرتا تھا جنہیں پڑھ کر خوشحال لوگ خوشی کے احساس سے بچھڑ جایا کرتے تھے۔

ادب کیا ہے؟

اس بے کار سوال پر بال سفید کرنے والے فرینچ مفکر ژان پال سارتر نے بھی یہی کہا تھا کہ "یا ادب سب کچھ ہے یا ادب کچھ بھی نہیں" وہ ادب سب کچھ تھا جو ادب اب کچھ بھی نہیں، جیسی حقیقت کی تلخی سے کامیابی کے ساتھ دامن چھڑانے والے سندھ کے ادیب اپنے افسانہ حیات کو ایک اچھا موڑ دینے کے لیے صرف اس وقت سوچتے ہیں جب کسی ذاتی دوست کی ضد کے آگے مجبور ہو کے ایسی محفلوں میں جمع ہوتے ہیں، جو اظہار کے ساتھ "درد کی انجمن" بن جاتی ہے۔ وہ نشست بھی کچھ اس طرح قائم رہی کہ کسی نے ادب کی اہمیت پر اصرار کیا اور کسی نے کہا کہ "ہم سب یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں؟ پھر سے بچھڑنے کے لیے؟؟ ہمیں کیا کرنا تھا اور ہم کیا کر رہے ہیں؟؟؟ ہمیں لوگوں کی اندھیری آنکھوں میں شمعیں روشن کرنا تھیں۔ ہمیں ہدایت کی گئی تھی

کہ اگر تمہارے پاؤں زخمی بھی ہوں تب بھی تمہیں لڑاکھڑا کر چلنا ہوگا۔ اور اپنی زنجیر کو سنگ لاخ سرزمین کے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے جگمگانا ہوگا۔ اپنی تحریر سے اپنے لوگوں کی تقدیر کو نقش کرنے اور اپنے دور کے فرعون سے لڑنے کے لیے اپنے قلم کو عصا بنا کر اس سماج کے سمندر میں اس کردار کو ڈبونا ہوگا جو غیرت دوراں کے لیے ایک گالی ہے!!

وہ ادیب جو سلجھے ہوئے حالات میں الجھے ہوئے خیالات سے دور رہا کرتے ہیں۔ انہیں کبھی تو اس محبت کی تلاش کرنا پڑتی ہے جو ایک وجود کی حد میں محدود نہیں رہتی۔ وہ محبت جس کی تلاش کرتے ہوئے اسلام آباد کے ایک ادیب کو جب موسمیوں کے درخت میں دو سوکھی ہوئیں موسمیاں لٹکتی نظر آئیں تو وہ خوش ہوگیا۔ اور انہیں اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر وہ اس کوہ پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا جہاں سے لوٹ کر کوئی کبھی واپس نہیں آتا!!

آرٹ کے وہ عشاق جنہیں سائنس کی ماڈل زندگی نے اپنی اداؤں کا اسیر بنا ڈالا ہے وہ جب اپنے نازک جسم سے پسینہ بہتا ہوا محسوس کرتے ہیں تو اس کی خوشبو انہیں یاد دلاتی ہے اس سندھ کی جوان کا پہلا پیار تھا۔

مگر کیا محبت کا وہ شہر ریت کی دیواروں سے بنا تھا؟

حالات کی ہواؤں میں اڑ جانے والے اس دیس کا نام و نشاں اپنی تحریروں میں تلاش کرنے والے وہ سارے ادیب اداس ہیں!!

وہ جو کبھی ادب کے آسمان پر عقابوں کی طرح محو پرواز رہے۔

وہ اب سوچ رہے ہیں کہ:

"عقاب اپنے آشیانے کی طرف
لوٹ رہا ہے!!
کتنی دیر تک اس کے پروں نے
سنگلاخ پہاڑوں پر سایہ برسایا
میں مانتا ہوں کہ عقاب بوڑھے نہیں ہوتے

اور نہ وہ تھکتے ہیں!!
مگر یہ اور بات ہے کہ
شام کا سورج
پہاڑوں کے اس پار
ڈھل رہا ہے!!
رات کی تاریکی پھیلتی جا رہی ہے
اور عقاب اپنے نشیمن کی طرف لوٹ رہا ہے"
عقاب بوڑھے نہیں ہوتے مگر انسان ہو جاتے ہیں۔

جب زندگی کی شام دھرتی کی اداس مہک کو اپنے دامن میں سمیٹ کر کسی کے دروازے پر دستک دیتی ہے تب مہنگے ہسپتال میں انہیں بچانے پر مامور نرس کی بادامی آنکھوں میں جھانک کر وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "یہ سب دھوکہ ہے"

مگر نہیں کہتے!!
کچھ نہیں کہتے!!
اس سندھ کی طرح جو ایک سسکی ہے ــــــــ!!
اور پھر وہ یہ بھی نہیں لکھتے کہ:

جب اظہار کا دامن
ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے
تب درد ایک سسکی بن جایا کرتا ہے
وہ سسکی جو دل میں دبی رہے تو ٹھیک
ورنہ وقت کے رخسار پر
آنسو کی ایک لکیر بنا کر
رخصت ہو جایا کرتی ہے۔

مگر وہ دن کب آئے گا

اس پنجابی آرٹسٹ کے الفاظ میں جھوٹ کی جھلک تک نہیں تھی جو کلفٹن کے ایک فلیٹ میں بنے ہوئے اپنے اسٹوڈیو کی کھڑکی کھول کر سمندری ہوا میں ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ "میں کس طرح بھول سکتا ہوں، اپنے اس "پنڈ" کو جس کے نل کا پانی پینے سے پیاس تو کیا بھوک بھی ختم ہو جاتی ہے" مگر وہ تنہا نہیں ہے۔ اس شہر میں ہر زبان میں درد بیان کرنا والے بہت سارے افراد موجود ہیں جو لوڈ شیڈنگ کی اذیت کا احساس اپنے گاؤں کی یاد سے کم کرتے ہیں۔

"چھوڑ آئے ہم وہ گلیاں"

یہ گیت صرف "ماچس" کے باغی کرداروں تک محدود نہیں۔ اس شہر میں بستے ہیں وہ "بشیرے اور نذیرے" بھی جن کی سانسوں سے سرسوں کی وہ مہک جانے کا نام نہیں لیتی جس کے سہارے وہ کراچی کی قید کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک مہک بھی بہت ہوا کرتی ہے کوئی غم کی لمبی شام بتانے کے لیے!!

"خوشبو ایک خاموش گفتگو کا نام ہے" یہ عبارت کسی ہورڈنگ، کسی موشن پکچر یا جامد اشتہار پر تو کیا کسی پرفیوم کے پیکٹ پر بھی نہیں لکھی گئی تو کیا ہوا؟ اگر کرشن چندر اپنے افسانے میں اس کا تذکرہ کرنا بھول بھی گیا تو کیا ہوا؟ ہے تو حقیقت!!

کراچی میں بسنے والے اہلیان پنجاب کی اقلیت کو آج بھی اپنے وہ گاؤں بہت یاد آتے ہیں، جو ان کی یاد میں اب صرف خوشبو کی مانند باقی بچے ہیں۔ اور یہ کوئی ادبی طرز

کا ڈائیلاگ نہیں مگر حقیقت ہے۔ اگر ان لوگوں کی آنکھوں پر کس کر پٹی باندھ دینے کے بعد بھی اگر اپنی جنم بھومی پر لے جائیں تو وہ آپ سے بے خود ہو کر کہیں گے کہ "میری مٹی کی خوشبو بتا رہی ہے کہ یہ میرا گاؤں ہے" بھلے آپ اس شخص کی آنکھوں کے ساتھ اس کے کان بھی بند کر دیں۔ وہ پھر بھی جان جائے گا کہ وہ کہاں پہنچا ہے؟ خوشبو سے زیادہ خطرناک یاد اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

تو ان گاؤں کی خوشبوئیں ابھی تک ان اہلیان کراچی کی سانسوں میں بسی ہوئی ہیں جن کی سماعتوں پر اب بھی رات کو دیر سے ایف ایم پر بلند ہوتا ہوا وہ لوک گیت ٹکراتا ہے تو وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں لوگوں کو صرف لوگ ہی نہیں مگر درخت بھی جانتے ہیں۔ جہاں انہیں پرندے بھی پہچانتے ہیں اور ایک دوسرے کو چہک کر کہتے ہیں کہ "لو پہنچ گیا پٹورائی داپتر بابو صاب بن کر!!"

وہ گلیاں کتنی تھوڑی سی تھیں اور گمنام بھی، جن گلیوں پر نہ کسی نام اور نہ کسی نمبر کا بورڈ آویزاں ہوا کرتا تھا۔ جن گلیوں کو دیکھ کر انہیں وہ عشق یاد آجاتے ہیں، جن کی ایک صدا نصرت فتح علی خان کے اس گیت میں اب بھی گونجا کرتی ہے کہ:

"کملی کر کے چھوڑ گیاں ایں
بیٹھی ککھ گلیاں دے رولاں"

اب وہاں ککھ تو بہت ہیں مگر وہ کڑی نہیں جو اپنے پیروں سے دھوپ کو مٹی کی طرح اڑاتے ہوئے چلتی تھی۔ جو ہنستی تھی تو اس کے دونوں گالوں میں وہ بھنور پڑا کرتے تھے جن کو پنجابی میں "ٹوئے" کہا جاتا ہے۔ وہ لڑکی جس کی کمر کے بل پر ندی مڑا کرتی تھی۔ ہنسی جس کی سن سن کر فصل پکا کرتی تھی۔ وہ کڑی صرف اس پنڈ کی نہیں تھی جس میں بھارت کے رومانوی شاعر گلزار کا جنم ہوا تھا۔ مگر اس شخص کے گاؤں میں بھی محبت کے ایسے مناظر ابھرتے اور ڈوبتے رہتے تھے جو شخص کراچی میں چمڑے کا بزنس کیا کرتا ہے۔ جو ایک ایسے کارخانے میں کام کرتا ہے جہاں رات دن چلنے والی مشینیں انسان کو پاگل بنانے کی ناکام کوشش کرتی رہتی ہیں۔ جہاں ایک گھٹن ہوا کرتی ہے اور اسے یاد آتی ہیں وہ ہوائیں جن میں صرف منتظر عاشقوں کی سیٹیاں ہی

نہیں بلکہ ان پرندوں کی پکاریں بھی تیرا کرتی تھیں جو اپنے آشیانوں سے بچھڑ جاتے تھے۔

ستاروں کا وہ جھرمٹ ڈسکو کلب کی جھل مل کرتی روشنیوں سے کہیں زیادہ حسین ہوا کرتا تھا جو آنگن میں لیٹے ہوئے انسانوں کے ساتھ بہت سی بھن بھن باتیں کیا کرتا تھا۔

گاؤں ماں کی آغوش ہوا کرتا ہے۔ اور شہر مارکیٹ۔ مارکیٹ میں اپنے اندر ایک بچہ سنبھال کر چلنے والے شخص کو ماں بہت یاد آتی ہے۔ وہ ماں جس کو بھی انسان اس کی خوشبو سے پہچان سکتا ہے۔ ماں کی مہک کون بھلا سکتا ہے؟ وہ مہک جو اس کے میلے کپڑوں سے آتی تھی۔ وہ مہک جو اس کے محنت کش ہاتھوں سے آتی تھی۔ وہ مہک جو اس کے آنچل سے قطرہ قطرہ ٹپکتی تھی اور روح میں ایک بے پایاں خوشبو بس جاتی تھی۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے گاؤں سے محبت کراچی سے نفرت کا نام نہیں۔ وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے اپنے دیہاتوں کا دم بھرتے ہیں وہ کراچی سے نفرت نہیں کرتے۔ اپنی ماں سے محبت کرنے والا اپنے بچوں کی ماں سے کس طرح نفرت کر سکتا ہے؟ عام لوگوں کو اظہار کا فن اور اس میں استعمال کرنے والے استعاروں کا آرٹ نہیں آتا مگر وہ بھی ایسا ہی کچھ محسوس کیا کرتے ہیں جو کچھ بھارت کے سکھ صحافی خشونت سنگھ نے ''دلی'' کے لیے لکھا ہے۔

یہ ایک انتہا پسند اردو اسپیکنگ کا موقف تو ہو سکتا ہے کہ ''ملک کے مختلف شہروں سے آنے والے افراد کراچی کو ایک بیسوا سمجھتے ہیں'' مگر حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سب لوگ جو اپنے گاؤں کو اپنی ماں کہتے ہیں وہ کراچی کو اپنا ایسا جیون ساتھی سمجھتے ہیں جس کے ساتھ رہنا بھی مشکل اور جس سے دور ہونا بھی ناممکن ہوا کرتا ہے۔ اپنی بیگم کو ''ایم کیو ایم'' کے نام سے پکارنے والے وہ پنجابی ایک نفرت بھری محبت یا ایک محبت بھری نفرت کرتے ہیں اس شہر سے جس میں انہیں الطاف حسین کی باتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ وہ لوگ جو اکثر لڑتے اور جھگڑتے رہتے ہیں اس شہر کے ساتھ جس کے

پہلو میں وہ سکون کے ساتھ سو جاتے ہیں۔

وہ لوگ جو سہراب گوٹھ پر کھڑی ان کوچوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں جنہیں اگلی صبح اس گاؤں میں ہونا ہوتا ہے جہاں زندگی گھٹ گھٹ کر مرنے کا نام نہیں ہوا کرتی تھی۔ جہاں ایک سکون سا ہوا کرتا تھا۔ مگر وہ لوگ کراچی کو کس طرح چھوڑیں؟ کراچی تو ان کی شریک حیات ہے۔ اس کا وجود تو ان کے خاندان کا وجود ہے۔ وہ لوگ کراچی کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتے جن کے بچے کراچی کے بغیر سکون سے سو بھی نہیں سکتے۔

وہ بچے اور بچیاں جو کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہیں کراچی کی مہک اچھی لگتی ہے۔ جو کراچی میں رہتے ہیں ان کی تو بات ہی کیا مگر وہ نوجوان جو اب یہاں نہیں بستے، انہیں بھی جب کراچی کی یاد آتی ہے تو نیویارک، لنڈن، اور پیرس کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو سونے کے پنجرے میں قید طوطے اور مینائیں سمجھنے والے وہ ”کراچائیٹ“ جو بی ایم ڈبلیو میں بیٹھ کر کراچی کے آٹو میں سفر کرنے والی دوست کو فون کر کے پوچھتے ہیں کہ ”کہاں ہو اس وقت؟“ اور جب وہ کہتی ہے کہ ”گرو مندر کے پاس سے گذر رہی ہوں“ تب کراچی ان کی آنکھوں میں نمی کا تناسب بڑھا دیتا ہے اور وہ بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”مجھے بتاتی جاؤ کہ تم کہاں کہاں سے گذر رہی ہو؟ کیا مزار قائد پر شام کا پھیکا چاند چمک رہا ہے؟ کیا ایم اے جناح روڈ پر ٹریفک کا رش بہت شدید ہے؟ سیون ڈے کے پاس کھڑے املتاس کے درخت سے زرد پھول جھڑ رہے ہیں؟ کیا ریمپا پلازہ کے ساتھ لگی ہوئی لوہے کی سیڑھی پر لوگ گذر رہے ہیں؟ کیا دو راستوں کے بیچ لگی ہوئی لوہے کی گرل سے کوئی بچہ آسانی کے ساتھ گذر گیا؟ کیا وہاں کوئی موٹا پھنس گیا؟ کیا ہوا؟ بتاؤ نہ کراچی کے بارے میں!! کیا اب تک وہاں سب کچھ ویسا ہے؟؟؟“ پردیس میں بسنے والے لوگ سمجھتے ہیں کہ ”ہمارا شہر بدل گیا ہوگا“ مگر انہیں کوئی امرت رس میں ڈوبے ہوئے لہجے کے ساتھ اطلاع دیتا ہے ”اس شہر میں سب کچھ ویسا ہی ہے۔ وہی اجنبی بھیڑ۔ وہی تحفظ کی تشویش۔ وہی ہر روز ہونے والی ہڑتالیں۔ وہی دکانیں۔ وہیں خریدار۔ وہی شور۔ وہی دن۔ وہی رات۔ وہی صبح۔ وہی

شام۔ہاں ! صرف تم نہیں ہو۔ تم کہاں ہو؟" اور وہ اپنے احساسات کا اظہار اشعار میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"ہم وہاں ہیں جہاں سے
ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی"

مرزا غالب نے کیا غضب کی بات کہی ہے کہ:

"ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"

مگر کبھی کبھی کسی کسی کو تو لگتا ہو گا کہ غالب غلط ہے۔ کیوں کہ صرف مکانوں کو مکینوں سے شرف حاصل نہیں ہوتا مگر کچھ صورتوں میں مکینوں کو مکانوں سے شرف حاصل ہوا کرتا ہے۔ کراچی کے وہ مکین جنہوں نے آنکھیں کھولیں تو اس دھوئیں میں جو اب انہیں پریشان نہیں کرتا۔ جنہوں نے اس شہر کی ہسپتالوں میں جنم لیا اور اس شہر کے تنگ آنگنوں میں چلنا سیکھا۔ اس شہر کی گلیوں کی دکانوں سے پہلی پہلی ٹافیاں خریدیں۔ اس شہر کے اسکولوں میں ABC پڑھی۔ اس شہر کی دکانوں کو دیکھا۔ اور اسی شہر کی دھوپ سے "موم کی وہ گڑیا" بھی خریدی جو گھر تک نہ آسکی۔

کراچی ایک قلیل اقلیت کے لیے بیوی ہو سکتی ہے مگر ایک بہت بڑی اکثریت کے لیے ایک ایسی ماں کا درجہ رکھتی ہے، جس کے پیروں کی جنت میں تشدد کے انگارے جلانے والوں سے وہ اہلیان کراچی شدید نفرت کرتے ہیں جو کسی پارٹی کے کارکنان نہیں مگر اس شہر کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ کراچی کی پرشور فضاؤں میں بیحد سکون کے ساتھ سونے والے ان بچوں کے کراچی میں جب بھی "یوم سوگ" کے نام پر کوئی ہڑتال ہوا کرتی ہے تب موبائل میسیج کی معرفت اپنے دل کی بھڑاس نکالنے والے یہ نوجوان نسل ایسا سمجھتی ہے جیسے کسی نے ان کی ماں کی توہین کی ہو!!

ہر انسان اپنی ماں سے پہلی اور اپنے شہر سے دوسری محبت کرتا ہے۔ کراچی سے محبت کرنے والے کم نہیں ہیں۔ مگر وہ خاموش ہیں۔ کراچی کی خاموش اکثریت ایک دن امن کی خطرناک یلغار بن جائے گی۔

"magar wo din kab aae ga?"

موبائل فون کے کی پیڈ پر یہ الفاظ ٹائپ کرنے والی لڑکی کی انگلیوں میں درد ہوتا ہے۔

وہ کراچی کی بیٹی جس کو اگر یہ پنجابی کہاوت سنائی جائے کہ "ماواں ٹھنڈیاں چھاواں" تو اس کی خوبصورت آنکھوں میں سمانے والا کراچی ایک آنسو کی صورت ڈھلکنے لگتا ہے!!

مور کبھی نہیں مرتے

تپتے ہوئے صحرا میں جلتے ہوئے سگریٹ سے کش لگاتے ہوئے جب ایک امپورٹڈ صحافی نے صحرائے تھر میں کارونجھر پہاڑ کے پاس کھڑے پاک بھارت سرحد کی طرف اشارہ کرتے ایک عام سے تھری سے پوچھا کہ "سنو! یہ مور کہاں سے آتے ہیں؟" تب اس کے ریگستان جیسے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک بوند نمودار ہوئی اور اس نے جواب دیا "صاحب! مور تو اس نیلے آسمان سے آتے ہیں۔ جس کی کوئی سرحد نہیں ہوتی" فقیروں جیسے لباس میں کھڑے ایک اہل صحرا کا فلسفیانہ جواب سن کر اس صحافی کو مسکرانا چاہیے تھا مگر وہ خاموش رہا! جب کہ ریت کے بہت بلند ٹیلوں کو ہر پل ایک نئی صورت دینے والی صحرائی ہوا چلتی رہی۔ قدرت کے ایک وسیع کینوس پر نت نئے نقوش بنتے اور مٹتے رہے۔ تھر کے پرندے بادلوں کو بلاتے رہے۔ اور کہیں دور سے وہ مور چلاتے رہے جو کبھی تھر کے فطرت پرست انسانوں کی نظر میں دیوتاؤں کا رتبہ رکھتے تھے مگر اب این جی اوز کا پراجیکٹ بن گئے ہیں اور موروں کے تحفظ کی خاطر پروپوزل پیش کرنے والی این جی اوز اب صحرائے تھر کے کچھ صحافیوں کی معرفت موروں کے مرنے کی خبریں فیڈ کروا رہی ہیں۔

اور ایک جھونپڑی کے آنگن میں سویا ہوا بچہ اپنی ماں سے پوچھ رہا ہے کہ "اماں! مور کیوں مر جاتے ہیں؟" تب کلچرل زنجیروں کے نام نہاد زیورات میں جکڑی ہوئی ایک صحرائی عورت اپنا پہلو تبدیل کرتے ہوئے اپنے بچے کو سینے سے لگاتی ہے اور اسے

بتاتی ہے کہ "ساون! مور نہیں مرتے۔ کبھی نہیں۔ وہ تو ہم سے روٹھ جاتے ہیں اور پھر لوٹ کر آتے ہیں" اور اس دوران اس کا مریض مرد جاگ جاتا ہے اور "بس اب سو جاؤ" کے حکم والے لہجے میں اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ "سکھاں! پانی دے"

پانی، سکھاں، ساون، صحرائے تھر اور کارونجھر کی ایک چوٹی سے اڑ کر دوسری چوٹی پر بیٹھنے والے مور! کیا کافی نہیں ہے اس تھر کے بیان کے لیے جو پیاس پیتا ہے۔ پیاسا جیتا ہے اور پیاسا مر جاتا ہے!! اسے تو سقراط کی طرح زہر کا پیالہ بھی نہیں مل پاتا۔

"سچائی سلگتی ہوئی ہوئی ریت جیسی ہوا کرتی ہے" ایسے اشلوک بتانے والے وہ جین پروہت کہیں نہیں جن کی غفائیں اب ان مقبروں جیسی نظر آتی ہیں جن کے جنازے انسانوں کی طرح اغوا کیے گئے محسوس ہوا کرتا ہے اور ان قدیم مراقبہ گاہوں کی سفید دیواروں پر اب نوجوان عاشق اپنی محبوباؤں کے نام کا پہلا حرف کندہ کر کے چلے جاتے ہیں اور چاندنی ایک مہربان نرس کی طرح اس صحرا کے زخموں پر مرہم رکھتی ہے جو دن بھر سورج سے لڑتا رہتا ہے اور رات کو ایک سپاہی کی مانند جاگتی ہوئی نیند سوتا ہے۔ اس صحرا کے ایک شہر "چھاچھرو" کے حوالے سے ایاز نے پوری سندھ سے پوچھا تھا کہ "کیا سوچ رہا ہے چھاچھرو؟" تب سندھ کے ہونٹ سل گئے تھے۔ مگر یہی سوال ہمارا شاعر کسی صحرا کے عام انسان سے پوچھتا تو وہ اسے پتے سے بنی ہوئی بیڑی پیتے ہوئے کہتا "سائیں چھاچھرو کیا سوچے گا؟ اس وقت جب لو چل رہی ہے۔ مور میگھ کے منتظر ہوں اور بارش کی نشانی سمجھے جانے والے پرندے بادلوں کو چیخ چیخ کر پکار رہے ہوں اور وہ سب اس بارش کو یہ کہہ کر بلا رہے ہوں کہ تیرے بادل تو ہم بھول گئے ہیں۔ تیرے وہ بادل جو ان ممالک پر برستے ہیں جہاں سیلاب آجاتے ہیں۔ اب انہیں یہاں بھی بھیجو۔ یہاں جہاں پیاس ہے۔ جہاں زندگی بوند بوند کو ترس رہی ہے۔ چھاچھرو بادلوں کے علاوہ اور کس کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟" بادل آجائیں تو تھر حسن کا گھر ہو جائے اور اگر بادل نہ آئیں تو پھر تھر ایسا ہی رہے گا۔ جس میں قحط آنے کا خواب دیکھنے والی گدھ جیسی این جی اوز راجاؤں اور مہاراجاؤں کی مانند چلتی ہیں۔ ڈبل کیبن گاڑیوں میں منرل واٹر کی بوتلیں بھر کر چلنے والیں وہ این جی اوز کیا جانیں کہ مور

صرف بادلوں کے آنے پر نہیں ناچتے۔ جب صحرا میں رات کسی خوابیدہ حسینہ کی صورت بکھر جاتی ہے تب بھی مور اپنے پر پھیلا اس طرح ناچنے لگتے ہیں جس طرح زندگی کے آخری ایام میں دیوانہ بن جانے والا پولش رقاص نجنسکی ناچتا تھا۔ مگر ادب اور دانش کے ماڈرن عشاق نجنسکی کی پہلی اور آخری کتاب "ڈائری آف میڈ مین" تو پڑھتے ہیں مگر اس مور کے رقص میں نجنسکی کو تلاش نہیں کرتے جو مور ناچنے کے بعد رونے لگتا ہے اور کہتے ہیں کہ اس کی مادہ اس کے وہ آنسو صحرا کی ریت پر گرنے سے قبل پی لیتی ہے۔ اور ان آنسوؤں سے ایک اور مور جنم لیتا ہے!!

جب عقل لاحاصل عشق بن جاتی ہے تب عقیدے کا جنم ہوا کرتا ہے۔ اور عقیدے کا اصرار ہے کہ "مور نہیں مرسکتے۔ اگر مور مر گئے تو تھر کبھی نہیں بچے گا۔ اس لیے اپنے لیے نہیں بلکہ تھر کے لیے ان موروں کو جینا ہوگا جو انہیں وہ سکھ نہیں دے سکتا جو چڑیا گھر کی سلاخوں کے پیچھے ان موروں کو ملتا ہے جو قیدی ہوا کرتے ہیں۔ جن کی وقت پر ویکسی نیشن ہوا کرتی ہے۔ جنہیں صحت بخش خوراک ملتی ہے۔ جو لمبی عمر جیتے ہیں اور پھر بوڑھے قیدیوں کی طرح سلاخوں کے پیچھے مر جاتے ہیں۔ عقیدہ اس لیے پرسکون ہوا کرتا ہے کیوں کہ وہ یہ بات دل سے مان کر چلتا ہے کہ "آزادی کی موت غلامی کی زندگی سے بہتر ہوا کرتی ہے" مگر این جی اوز شہروں کے چڑیا اور گڑیا گھروں میں قید موروں کی آزادی کے لیے آواز نہیں اٹھاتیں۔ انہیں صرف ان موروں کی فکر لاحق ہے جن کے بارے میں اہلیان تھر سمجھتے ہیں کہ یہ نیلے آسمان سے آتے ہیں اور نیلے آسمان میں چلے جاتے ہیں اور پھر نیلے آسمان سے لوٹ آتے ہیں۔ جو لوگ عقیدے کے اعتبار سے یہ سوچتے ہوں کہ وہ موروں کے دم سے زندہ ہیں انہیں موروں میں پھیلی ہوئی وبا کے بارے میں کوئی فکر کیوں ہوگی؟

وہ مور جن کا احترام تھر کے سارے لوگ کیا کرتے تھے۔ اب تو انہیں بھوکے انسان بھون کر کھا جاتے ہیں مگر ایک وقت ایسا بھی تھا جب مور آزاد پرندوں کی صورت اہلیان تھر کے گھروں پر اترتے تھے اور جس صحرائی گاؤں میں ان کا بسیرا ہوا کرتا تھا اس گاؤں کے لوگ انہیں اپنا مہمان تصور کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ٹھاکر

جو اب تھر میں نہیں بستے وہ موروں کی خوشی کے ساتھ خدمت کیا کرتے تھے۔ مگر اب تھر میں گھس آنے والے لوگوں نے صحرا کے ہر حسن کو تباہ کرنے کی کوشش کی ہے اور این جی اوز کی معرفت چل نکلنے والی یہ مہم تھر کے موروں کو بچانے کے بجائے انہیں ماضی کی مورت بنا کر چھوڑے گی۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ موروں کو بچانے کے لیے میڈیا میں ایک مہم شروع کرنے سے کہیں زیادہ ضروری ہے صحرا کے ان انسانوں کو بچانے کی کوشش کرنا جو بچ گئے تو پھر مور کبھی نہیں مریں گے۔ کیوں کہ مور انہیں اس لیے عزیز نہیں کہ وہ ڈالر کمانے کا ذریعہ ہیں۔ مور ان لوگوں کو اس لیے پیارے ہیں کیوں کہ وہ مور ہیں!! وہ مور جن سے محبت کرتے ہوئے مائیں اپنے بچوں کے نام "مور" رکھتی ہیں۔ اور شادی بیاہ کے سادہ فنکشنس میں تھال کو ڈھول بنا کر بجاتی ہیں اور یہ لوک گیت گاتی ہیں کہ:

"اے مور!
میرا دل میرے اپنوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے
اے مور دعا کرو!
میرے خالی جھولے میں
میرے بیٹے جھولیں
اور میری ماٹی ہمیشہ دودھ سے بھری رہے!!"

ایک تو یہ مور صدیوں سے فطرت کے بدلتے ہوئے تیوروں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ رکھتے ہیں اور دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ان موروں کا ہمیشہ سے تحفظ کرتے آئے ہیں وہ لوگ جو اب سنگین حالات کی وجہ سے اپنا تحفظ نہیں کرسکتے۔ مگر کیا یہ بات سمجھ آسکتی ہے ان انسانوں کو جو نہیں سمجھتے کہ مور تو ایک ایسا پھول ہے جو تھر کے درخت کی شاخوں پر کھلتا ہے۔ اس پھول کو تحفظ صرف اس صورت میں مل سکتا ہے اگر وہ درخت سلامت رہے جس کا نام تھر ہے۔ وہ تھر جو جہنم بن گیا ہے ان اہلیان تھر کے لیے جو رقم ہونے والی تاریخ سے بھی قبل بسا کرتے ہیں اس تھر میں جو ان کے آباؤ اجداد سے لیکر اب تک ایک تحفظ کی دیوار کی صورت موجود رہتا آیا ہے۔ جس طرح

سکھ بھرے حالات غاصب قوتوں کو دراندازی کی دعوت دیتے ہیں اسی طرح دکھ بھرے حالات انہیں ایسے حملوں سے دور رکھا کرتے ہیں۔ اس لیے تھر کی تاریخ کے وجود پر غیر حملہ آوروں کے زخم نہیں ہیں مگر تھر جدید دور میں دکھوں کی بستی بن گیا ہے۔ جس تھر کو صحرائی طوفان کچھ نہیں کرپائے اس تھر کو جدید دور نے دفن کر دیا ہے۔

اور یہ این جی اوز اس مزار تھر کی مجاور ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں جس تھر کی ریت کا ہر ذرہ محبت کا وعدہ بن کر چمکتا ہے۔ جس تھر میں موروں کو کمائی کا ذریعہ نہیں بلکہ محترم محبت کی عظیم علامت سمجھا جاتا ہے۔ جس تھر کے کسی گمنام عوامی شاعر نے تھری زبان میں یہ شعر لکھا تھا کہ:

"کارونجھر دی کور مریں تے ما کہیں نہیں
متھان ٹہونکے مورتہ ڈونگر لاگے ڈیپتو"

یعنی: "اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس کارونجھر پہاڑ کو مت چھوڑنا
جس پر کھڑا مور جب کوکتا ہے تب پورا پہاڑ چراغ کی مانند روشن ہو جاتا ہے"

ایسے تھر کو صرف موروں کا مقتل بنا کر پیش کیے جانے والی یہ حساس صحافت آخر موروں کا کیس اٹھا کر اس تھر کے کیس پر پردہ کیوں ڈال رہی ہیں جس تھر کے باسی بہت دکھی ہیں۔ جو اہلیان تھر اس طرح جی رہے ہیں جس طرح کوئی زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدی جینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور کوئی بھی سرزمین اپنے طور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کو شناخت دیتے ہیں ان میں بسنے والے!

اس لیے تھر صحرا نہیں بلکہ صحرا نشین ہیں۔ وہ ساری قوتیں جو موروں کو محفوظ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں وہ اگر اہلیان صحرا کے دکھ دور کرنے میں مصروف عمل ہو جائیں تو مور خود بخود خوش ہو جائیں گے!!۔

مگر ان نیم طبیبوں جیسے سیاسی حکیموں کو کون سمجھائے کہ پھولوں کا تحفظ تب ہی ممکن ہے جب درخت مضبوط اور صحتمند ہو۔ اس لیے موروں کو نہیں بلکہ ان انسانوں کی مدد کریں جو صدیوں سے موروں کا تحفظ کرتے آئے ہیں۔ جن کے لیے مور پرندہ

نہیں بلکہ ایک ایسے پیار کا مظہر ہے جس پیار اور میں پوجا میں کوئی فرق نہیں ہوا کرتا۔

اس لیے موروں والے موت پر ماتم کرنے والے میڈیا سے صرف اتنی التماس ہے کہ وہ ان اہلیان تھر کی زندگی میں بہتری لانے کے سلسلے میں آواز بلند کرے جو موروں کے اصل محافظ ہیں۔ اگر وہ لوگ بچ گئے تو مور نہیں مریں گے۔ صرف روٹھ جایا کریں گے اور روٹھنے کے بعد خود ہی واپس آجایا کریں گے۔ اس عقیدے کو بچانے کے لیے جس کی شاخ پر عقل کا پھل بھلے پیدا نہ ہو لیکن اس پر عشق کا پھول ضرور کھلتا ہے!!

محبت کی ایک نامکمل تحریر

لبرل لوئر مڈل کلاس کے مقبول رائٹر مظہر الاسلام نے لکھا ہے کہ "آرٹسٹ کی آخری ڈیوٹی یہ ہوتی ہے کہ وہ محبت کو بچائے" مگر کسی نقاد نے ان سے یہ نہیں کہا کہ "جو مر جائے وہ محبت ہی نہیں"

محبت تو قاتل ہے۔ یہ مقتول کیسے بن سکتی ہے؟ محبت تو لافانی، لازوال اور امر ہے۔ یہ تو یونانی دیومالا کا وہ اولمپک کردار ہے جو انسانوں میں سماجاتا ہے تو وہ دھرتی پر محبت کے دیوتا بن کر جیتے ہیں۔ اور دیوتا نہ مرتے اور نہ بوڑھے ہوتے ہیں۔ اس لیے تو قدیم ہندی شاعر کالیداس نے اپنے شعری ناول "وکرم اروشی" میں یہ تاثر دیا ہے کہ جب ایک مہارشی بوڑھے راجہ وکرم سے زندگی کی آخری سانسوں میں ان کی آخری خواہش پوری کرنے کے حوالے سے پوچھتا ہے کہ کیا تم مرنے سے قبل اروشی سے ملنا چاہو گے؟ تو جوانی سے بڑھاپے تک اروشی کے انتظار میں گیلی لکڑی کی مانند سلگتے ہوئے وکرم نے خوشی خوشی کہا ہے کہ "ہاں۔ مجھے اس اروشی سے ملاؤ جس نے سورج کی دھوپ اور سمندر کی جھاگ سے جنم لیا تھا" مگر پھر وہ یہ سوچ کر بیحد اداس ہو جاتا ہے کہ "میں تو منش ہوں۔ اس لیے بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مگر اروشی تو دیوی ہے۔ وہ اب بھی جوان ہو گی۔ تو کیا میرا بڑھاپا اس کی جوانی کا سامنا کر پائے گا؟" یہ سوچ کر اس کی آنکھوں سے دو آنسو لکیر بن کر لڑھکتے ہیں اور وہ نین پھر کبھی نہیں کھلتے جو محبت کے درپن تھے۔ مگر جو عمر سے شکست کھا جائے کیا وہ

محبت ہے؟

خیرپور کے خودکش صوفی شاعر سچل سرمست نے لکھا ہے کہ:

"سچل عشق بڈھا نئیں تھیندا
پاویں ہووے چٹی داڑھی"

اور ثانی منصور کے نام سے مشہور سچل نے یہ بھی کہا تھا کہ:

"آکر دیکھو عشق سچل کا
کل سے آج زیادہ ہے"

عشق مسلسل ابھرتا ہوا چاند ہے۔ خلیل جبران نے صرف یہ نہیں لکھا تھا کہ "افسوس اس قوم پر جو اطاعت کرتی ہے مگر بغاوت نہیں کرتی" جبران کے آگے جب ایک کورا کاغذ رکھا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا کہ "صرف ایک لفظ لکھیں" تو انہوں نے لکھا تھا "محبت" علامہ اقبال نے کہا ہے کہ "محبت فاتح عالم" دنیا کا فاتح سکندر نہیں بلکہ وہ مقدر ہے جسے محبت مل جائے۔ چیکو سلواکیہ کا جدید شاعر کہتا ہے کہ "جب انسان کے سارے مسائل حل ہو جائیں تب بھی وہ شام کے وقت ڈھلتے ہوئے سورج کو دیکھ کر محبت پر سوچتے ہوئے اداس ہوتا رہے گا"

مگر محبت وہ نہیں جو ایک وجود تک محدود ہو۔ جو محبت ایک وجود تک محدود رہتی ہے وہ محبت نہیں ہوس ہوتی ہے۔ لالچ ہوتی ہے۔ اسی لیے تو لوگ محبت کے لیے دوسرے کو تلاش کرتے ہیں۔ مگر جس سے محبت کی جائے وہ دوسرا نہیں ہوتا۔ اس لیے تو سارتر نے لکھا ہے کہ "دوسرا جہنم ہے" محبت تو وہ ہے جس کے لیے مرزا غالب نے لکھا تھا کہ:

"جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں"

مگر موجودہ دور کی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "محبت فقیری لباس

پہن کر دنیا کے دستور پر چلنے والے جدید عشاق کے اس قافلے کے مسافروں کو تلخ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتی ہے۔ جو نہیں سمجھتے ایاز کی یہ بات کہ:

"اے تبسم فروش محبوبہ
ہر لگی دل لگی نہیں ہوتی"

محبت ہے اور بہت زیادہ ہے۔ حسن کی طرح۔ جس کے لیے شیلے نے لکھا تھا کہ "حسن ایک مسرتِ پیہم ہے" اور ذوالفقار علی بھٹو نے نے پھانسی گھاٹ میں لکھا تھا کہ "میں حسن کے حوالے سے شیلے کے نظریے کی حمایت کرتا ہوں۔ حسن ہر جگہ ہے۔ ایک مکمل ملیامیٹ کر دینے والی جنگ میں بھی حسن کو بالکل ملیامیٹ کر دینا ممکن نہیں ہو گا۔ حسن اس قدر زیادہ حسن ہے کہ وہ بالکل ختم نہیں ہو سکتا۔ زندگی محبت کاملہ ہے۔ فطرت کی ہر خوبصورتی کے ساتھ اظہار عشق کیا جاسکتا ہے۔ سطع مرتفع کی خوبصورتی ہے۔ بلند بالا پہاڑوں کی خوبصورتی ہے۔ ہرے بھرے میدانوں کا حسن ہے۔ غیر ہموار ریگستانوں کا اپنا حسن ہے۔ پھولوں اور جنگلات کا حسن ہے۔ نیلے سمندروں اور بل کھاتے دریاؤں کا حسن ہے۔ طرز تعمیر کے شان و شوکت کا حسن ہے۔ موسیقی اور رقص کا حسن ہے۔ سب سے بڑھ کر مرد اور عورت کا اپنا حسن ہے جو اللہ تعالی کی مکمل تخلیق ہے" محبت اس حسن کی تخلیق نہیں بلکہ یہ سارا حسن اور نہ صرف دھرتی بلکہ آسمانوں کے رنگوں اور امنگوں کا بے حد حسن صرف اور صرف محبت کی تخلیق ہے۔ اس لیے جب تب یہ کائنات موجود ہے تب تک محبت موجود ہو گی یا یوں کہا جائے کہ جب تک محبت ہے تب تک یہ کائنات اسی طرح ڈولتی رہے گی۔ اس لیے محبت کے خاتمے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ وہ چیز جس کو ہم محبت کہتے ہیں وہ مخصوص حالات کی وجہ سے کم ہوتی جا رہی ہے اور اس کو کم ہونا ہی ہے اور اس کو کم ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ وہ محبت نہیں۔ جو اپنے آپ سے کی جائے وہ محبت نہیں ہو سکتی۔ جو ایک فرد یا ایک خاندان یا ایک قوم تک محدود ہو وہ محبت نہیں سیاست ہے۔
ہم نے سیاست کو محبت کا نام دیا ہے اور جیسے جیسے انسانی شعور کے بڑھنے سے اس

کی حقیقت کھل کر سامنے آ رہی ہے اور لوگ خوشنما نعروں جیسے وعدوں کے جال میں نہیں پھنستے تو ہم محبت کے ناپید ہونے کے وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سیاست محبت نہیں۔ اس لیے محبت اور سیاست میں فرق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ فرق واضح نہیں ہو گا تب تک لوگ سیاست کو محبت سمجھتے اور دکھ اٹھاتے رہیں گے۔ ایک قلمکار اور ایک سیاسی فنکار میں یہی فرق ہے۔ ادیب انسانوں سے محبت کرتا ہے اور سیاستدان انسانوں کو محبت کا دھوکہ دیکر انہیں اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس طرح محبت سے محروم لوگ شوبز کی تیز روشنی میں ایک اداکار یا اداکارہ کو عشق کی علامت سمجھنے لگتے ہیں اسی طرح اپنے حقوق سے محروم اور بہتر زندگی کے خواب دیکھنے والے لوگ ان سیاستدانوں کے چنگل میں اس طرح پھنس جاتے ہیں جس طرح باتونی شخص کی گفتگو میں معصوم دل والی لڑکیاں سحر میں آ جاتی ہیں۔ سیاستدان میں محبت کے نام پر جس چیز کی مارکیٹنگ کرتے ہیں وہ محبت نہیں بلکہ ایک جال ہوتا ہے جو دھیرے دھیرے وبال بن جاتا ہے۔

یہ دنیا اس وبال سے گذر رہی ہے۔ یہ دنیا قید ہے۔ یہ دنیا ایک جیل۔ ٹارچر سیل ہے۔ کیوں کہ اس دنیا میں محبت کے نام پر سیاست کا اسٹیج قائم کیا جاتا ہے اور لوگوں کو ایک ایسی چیز کے بارے میں چالاکی اور عیاری کے ساتھ بتایا جاتا ہے جو محبت سے ملتی جلتی ضرور ہے مگر محبت نہیں ہوتی۔ جس طرح سونے کا پانی چڑھایا ہوا زیور سونے کا زیور نہیں ہوتا ویسے آزمائش کے بعد سیاست کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے اور لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اگر ہم عرب اسپرنگ کی تعریفیں کرتے ہیں اور اپنے ماحول میں عوامی تحرک کے حوالے سے خزاں میں جھڑتے ہوئے پتوں کی بازگشت سنتے ہیں تو اس کا سبب یہ نہیں کہ ہم تبدیلی نہیں چاہتے یا ہم عظیم تبدیلیوں سے ہم آغوش ہونے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اس کا مطلب صرف اور صرف یہی ہے کہ معاشرے کو تبدیل کرنے کے مدعی نام نہاد رہنما معصوم انسانوں سے سیاست کرتے ہیں۔ تاریخ میں جب بھی کسی شخص نے عوام سے محبت کی ہے تب تبدیلیوں کا راستہ روکنے کی کوشش ناکام ہوئی ہے۔ تبدیلی ایک ایسا جانور نہیں کہ جو پہلے ہوا کرتا تھا اور

اب اس کا وجود باقی نہیں بچا۔ تبدیلی اب بھی آسکتی ہے مگر اس کے لیے ہمارے رہنماؤں کو سیاست چھوڑ کر اپنے عوام سے محبت کرنا ہوگی۔ جب کسی رہنما کی روح میں محبت جنم لیتی ہے تب اس کی مہک خود بخود انسانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے لیے تقریر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ محبت کی زباں ہمیشہ خاموش رہتی ہے۔ محبت بینر آویزاں نہیں کرتی۔ محبت پرچم نہیں لہراتی۔ محبت بلند آواز میں داد حاصل کرنے کے لیے گیت نہیں گاتی۔ محبت بھیگی ہوئی آنکھوں کی ایک نظر سے وہ سب کچھ کہہ دیتی ہے جس کے اظہار کے خاطر بہت سارے کتب خانے درکار ہوں۔ محبت فصاحت اور بلاغت کا بل کھاتا دریا نہیں۔ محبت اسٹیج پر آکر چیخنا چلانا نہیں۔ محبت مداری کی منڈلی نہیں۔ محبت لفاظی نہیں۔ محبت ایک سکوت ایک سکون اور ایک سوئے ہوئے حسن کے ہونٹوں پر جاگتی ہوئی مسکراہٹ ہے۔ محبت ایک حرف کی آہٹ ہے۔ جو اک تارے کی طرح مسلسل بجتا رہتا ہے اور اس کے سر پر دل کی دھڑکن تبدیل نہیں ہوتی۔

علم کی بڑی حیثیت ہے۔ مگر وہ عشق کے سامنے غلام سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس لیے تو اس دھرتی کے صوفیاء کرام نے دل کی گہرائیوں سے گواہی دی کہ:

"اکو حرف تینوں درکار
علموں بس کریں اویار"

وہ ایک حرف محبت ہے۔ سیاست نہیں۔ سیاست تو سمجھوتہ ہے۔ سیاست تو دھوکہ ہے۔ انسان سیاسی جانور نہیں۔ انہیں محبت کی ضرورت ہے۔ وہ محبت جس کے گلاب ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ جس کا ترنم ہمیشہ دلوں میں تازہ جذبات کا سمندر مسلسل تلاطم میں رکھتا ہے۔ وہ محبت جو لینے والے سے کہیں زیادہ سکون اور مسرت کا باعث بنتی ہے دینے والے کے لیے! اس محبت کی اس ملک کو ضرورت ہے۔ یہ ملک جو اپنے ناخنوں سے اپنے آپ کو زخمی کر رہا ہے۔ یہ ملک جس میں دہشت کی فضا دم گھٹنے کا باعث بن چکی ہے۔ وہ ملک جس میں عدم تحفظ کا راج ہے۔ وہ ملک جو بے یقینی کے

اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ ملک جس میں انسانوں کا خون ارزاں ہے۔ جہاں پانی مسلسل مہنگا ہوتا جارہا ہے۔ جہاں لوگوں کو کھانا نہیں ملتا۔ سونے کے لیے آشیانہ نہیں حاصل ہوتا۔ جہاں معصوم بچے وحشت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جہاں لوگ اپنے گردے اور دل کے ٹکڑے بازار میں بیچنے کے لیے آتے ہیں۔اس ملک کے حکمرانوں سے صرف اتنی گزارش ہے کہ انہوں نے ایک عرصے تک سیاست کی ہے مگر وہ کچھ وقت کے لیے سیاست کو ترک کر دیں اور محبت کرنا شروع کریں۔ وہ محبت کریں ان انسانوں سے جو پہاڑوں میں بستے ہیں۔ جو صحراؤں میں رہتے ہیں۔ جو گیس چیمبر جیسے شہروں میں جینے کی سزا کاٹتے ہیں۔ جو اغوا کیے جاتے ہیں۔ جو اپنے تحفظ کے لیے بھتے دیتے ہیں۔ جو بجلی کی لوڈ شیڈنگ میں صبر کے ساتھ گزارا کرتے ہیں۔ جنہیں محنت کا معاوضہ اتنا ملتا جس سے کوئی بمشکل زندہ رہ سکے۔ اگر اس ملک کے حکمران ان مظلوم لوگوں سے محبت کریں تو صورتحال میں انقلابی تبدیلی آسکتی ہے۔ یہ لوگ جن کی بڑھتی ہوئی آبادی کو بوجھ سمجھا جاتا ہے یہی لوگ اس ملک کے پر بن جائیں گے۔ کیوں کہ محبت معجزے دکھا سکتی ہے۔ محبت کا وہ معجزہ ایک عرصے سے منتظر ہے۔

اور ایسا بھی نہیں کہ محبت ناپید ہوگئی ہے۔اس کائنات میں جتنا حسن ہے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ اگر محبت نہیں ہوتی تو حسن بھی نہیں ہوتا۔ محبت ہے اس لیے حسن بھی ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ محبت صرف کشادہ دلوں کا رخ کرتی ہے اور ہمارے حکمرانوں اور سیاستدانوں کے سینے بہت سکڑے ہوئے ہیں۔ ان کے دل کی گلیاں بہت تنگ ہیں۔ محبت ان میں داخل ہو تو کیسے ؟ محبت کے لیے کشادہ دل چاہئیں۔ اس لیے حکمرانوں کو اپنی قوم سے دماغ کا وہ کھیل ختم کرنا چاہیئے جس کو سیاست کہتے ہیں۔ ان کو اپنے ملک اور اس میں بسنے والے لوگوں کے ساتھ دل کا وہ رشتہ قائم کرنا ہوگا جس کو محبت کہا کرتے ہیں۔ وہ محبت جو ایک بار انسان کے دل میں بس جائے تو پھر وہ ایک قوم ایک ملک اور ایک دنیا ہی نہیں بلکہ اپنے وجود میں ایک ایسی کائنات بن جاتا ہے جو مسلسل اپنی تکمیل کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔۔۔!!(نا تمام)

ایک تھی علیزہ

اخبار میں اس کی تصویر شایع نہیں ہوئی۔ اس لیے میں کچھ نہیں جانتا کہ کیسی دکھتی تھی؟اس کے بال چھوٹے تھے یا اتنے بڑے کے اس کی پیشانی پر لہرایا کرتے تھے اور وہ اس دنیا کو اپنے بالوں کی لٹوں میں سے دیکھا کرتی تھی! میں نہیں جانتا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی آنکھوں کا رنگ کیسا تھا؟ سیاہ یا سبز؟ بادامی یا براؤنش بلیک؟؟ مجھے نہیں معلوم۔ مگر میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اس کو نہ صرف اس شہر بلکہ اس دنیا میں آئے ہوئے ابھی ڈھائی برس مشکل سے ہوئے تھے۔ وہ ڈھائی برس کی چھوٹی سے گڑیا جو تیز رفتار کوچ کے تلے کچلی گئی اس کے حوالے سے شایع ہونے والی چھوٹی سی خبر آنکھ میں تنکے کی طرح تیر رہی ہے۔ وہ جو ننھی منی سی گڑیا تو تھی مگر وہ ربڑ یا روئی سے بنی ہوئی نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کی امی کوچ گذر جانے کے بعد ڈرائیور کو برا بھلا کہتے ہوئے اس کی اٹھاتی اور اسے صاف کر کے گود میں رکھ لیتی اور چل پڑتی اس گھر کی طرف جو ابھی تک ماتم میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہڈی اور ماس سے بنے ہوئے کھلونے بہت طاقتور ہونے کے باوجود بہت کمزور ہوتے ہیں۔ وہ شیشے سے بنے نہیں ہوتے مگر اب بار ٹوٹ گئے تو پھر دل طرح کبھی نہیں جڑتے۔ اس شہر کی معصوم اور ننھی منی سی گڑیا علیزہ بھی اب کبھی نہیں جڑ پائے گی۔ اس کے گھر کی دیوار پر آویزاں اس کی تصویر ہمیشہ یاد دلائے گی اس سانحہ کی جوان سینوں میں زخم چھوڑ گیا جن سینوں میں موجود دل اس علیزہ سے بیحد پیار کرتے تھے جو دل اب مغموم ہیں۔ اور

ان دلوں کے مالکان کی آنکھوں میں آج تو آنسو ہیں مگر وقت کے ساتھ انہیں مسکرانا بھی ہو گا مگر پھر بھی اس مسکراہٹ میں درد کا ایک ستارہ ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ اور جن دلوں نے درد پر بہت سوچ بچار کیا ہے یا جو درد سے گزرے ہیں ان کو معلوم ہے کہ ہر درد ختم نہیں ہوتا۔ کچھ درد ہمیشہ کے لیے مٹ جاتے ہیں مگر کچھ درد ختم نہیں ہو پاتے۔ وہ صرف دب جاتے ہیں اور جب بھی انہیں سر اٹھانے کا بہانہ مل جاتا ہے وہ باہر نکل آتے ہیں اور دل کے زخموں کو ہرا کر دیتے ہیں۔

علیزہ کا درد بھی ایک ایسا درد ہے۔ اس ملک، اس شہر یا اس علاقے کے لیے نہیں تو کم از کم اس گھر کے لیے ہمیشہ ہو گا جس گھر کی دیوار پر اب اس کی ایک عدد رنگین تصویر لٹکتی رہے گی اور دیکھنے والوں کو یاد دلاتی رہے گی اس وقت کی جب علیزہ نے جنم لیا تھا۔ بند آنکھوں اور بھنچی ہوئی مٹھیوں والی وہ معصوم مخلوق کتنی جلدی بڑی ہو رہی تھی! اس کی ماں سمجھتی تھی لڑکیاں سفیدے کے درختوں کی طرح بہت جلد بڑی ہو جاتی ہیں اس لیے علیزہ بھی بڑی ہو رہی ہے۔ وہ مسکرا کر سوچا کرتی کہ اچھا ہے علیزہ بڑی ہو جائے گی تو اپنی ماں کی مدد کرے گی۔ کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹائے گی۔ مگر کس کو معلوم تھا کہ علیزہ اس لیے بہت جلد بڑی ہو رہی تھی کہ اس کو جانے کی جلدی تھی۔ بیٹیاں تو پیدا ہی اس لیے ہوتی ہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کا گھر کا چھوڑ کر چلی جائیں مگر یہ کیسا جانا تھا؟ ایسی جدائی کا تصور بھی والدین نہیں کر سکتے جیسی جدائی کا راستہ اختیار کر کے چلی گئی ہے وہ علیزہ جو ایک پھول تو کیا کلی بھی نہیں تھی۔ وہ تو بیج سے پھوٹنے والی وہ نرم و نازک پتی تھی جو تتلی کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر علیزہ جو بوجھ برداشت کرنا پڑا تو اس کوچ کا جو کورنگی انڈسٹیریل ایریا کے صرف مزدوروں کو ہی نہیں بلکہ ان کی غربت کے بوجھ اور ان کے جسموں میں موجود بے انتہا تھکاوٹ کو بھی اٹھاتی ہیں۔ علیزہ اس کوچ کے ٹائر تلے کچلی گئی ہے جس ٹائر کے چلنے سے کراچی کے روڈ بھی اکھڑ جاتے ہیں۔

کیا اس ٹائر کے نیچے صرف وہ جیتی جاگتی گڑیا کچل کر مر گئی؟ نہیں اس ٹائر کے نیچے کچل گئے وہ خواب سارے جو علیزہ سے محبت کرنے والی آنکھوں نے اس کے

بارے میں دیکھے تھے۔ اعلیٰ تعلیم، بڑی گاڑی، خوبصورت مکان اور مضبوط رشتوں کے خوابوں سے اہم ہے وہ محبت جو اس قسم کے خواب دکھلاتی ہے جن خوابوں کے دوش پر عمر بے پرواہ پرندے کی طرح اڑتی رہتی ہے۔ اگر انسان کو زندگی میں وہ کچھ نہیں بھی مل پاتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے تو بڑی بات نہیں۔ انسان کسی نہ کسی حوالے سے کوئی نہ کوئی مسرت تلاش کر کے خوشی کے اسباب نکال لیتا ہے مگر علیزہ کی کہانی کے باب میں تو خوشی کا دور دور تک کوئی پہلو نہیں۔ اس میں تو صرف درد ہی درد ہے۔ دکھ ہی دکھ ہے۔ آنسوؤں سے شروع ہونے والی یہ کہانی آنسوؤں پر ہی ختم ہو جانے کے لیے بنی ہے۔ یہ کہانی جس کی عمر ڈھائی برس ہے۔ کیا محبت اور المیہ سے لبریز زندگی کی کہانی ڈھائی برس تک محیط ہو سکتی ہے؟ مگر ہو جاتی ہے۔ جب غریب خاندانوں میں علیزہ جیسی بچیاں جنم لیتی ہیں تو زندگی مسکراتی تو ہے مگر اس مسکراہٹ میں ایک مایوسی کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ مسکراہٹ جانتی ہے اس دنیا جو انسانوں کو دولت کے ڈیجیٹل کانٹوں میں تولتی ہے۔ اس لیے اس دولت کے ہاتھوں ہر دن اور ہر لمحہ فتح ہونے والی دنیا میں یہ اہم نہیں کہ کون کتنا باصلاحیت؟ کون کتنا ذہین؟ کون کتنا حساس؟ کون کتنا معصوم اور کون کتنا خوبصورت ہے؟؟ اس دنیا میں صرف اس پہلو پر سوچا جاتا ہے کہ کون کتنا بے حس؟ کون کتنا چالاک؟ کون کتنا مکار؟ کون کتنا بے حس؟ کون کتنا سفاک اور کون کتنا دولت مند ہے؟؟ علیزہ جن رشتوں میں رہتی تھی وہ چالاکی اور مکاری سے بہت دور تھے۔ ان میں اگر سفاکی ہوتی تو علیزہ کی ماں علیزہ کو کورنگی کی انڈسٹریل ایریا میں ایک کوچ پر اٹھا کر سفر نہ کرتی۔ اس صورت میں تو علیزہ ایک نئی اور اس خوبصورت گاڑی میں سفر کرتی جس میں بچوں کا حفاظتی سسٹم خاص طور پر موجود ہوتا ہے۔ اس لیے جب سرمائے دار اپنی فیملیز کے لیے گاڑیاں دیکھتے ہیں تو انہیں شوروم والے ایسی گاڑیاں دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ "سر یہ فیملی کار ہے۔ اس میں بچوں کی حفاظت کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے" علیزہ کا والد سرمائے دار نہیں تھا۔ وہ مزدور کی بیٹی تھی۔ اس لیے اس گاڑی میں سفر کر رہی تھی جس میں بچے تو کیا بڑے بھی محفوظ نہیں ہوتے۔

علیزہ کی المناک کہانی پڑھنے والو سے التماس ہیں کہ وہ ذرا اس پہلو پر بھی غور کریں کہ اس درد سے بوجھل کتھا میں کہاں کہاں کس کس کا قصور ہے؟ کیا ہوتا تو علیزہ آج بھی زندہ ہوتی۔ مسکراتی۔ قہقہے لگاتی۔ اپنے قدم ذرا مضبوطی سے اٹھاتی۔ اپنے والدین کی خوشیوں میں اضافے کا سبب بنتی؟ اگر علیزہ کی امی کوچ نمبر PE4938 پر سوار ہونے کے بجائے کسی دوسری کوچ پر بیٹھتی تو شاید یہ حادثہ پیش نہ آتا جو حادثہ نہیں تھا مگر زبان زد و عام خاص میں ایسے واقعات کو حادثات ہی کہا جاتا ہے۔ حادثہ تو اسے کہا جانا چاہیئے کہ جب احتیاطی تدابیر مکمل طور پر اپنائی جاتیں اور پھر بھی ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آجائے۔ مگر ہمارے معاشرے اور خاص طور پر اس شہر میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اس شہر میں انسان اتفاق سے نہیں مرتا بلکہ اتفاق سے جیتا ہے۔ کیوں کہ جب موت کے سارے امکانات انسان کے گرد گھومتے رہیں تو اس صورتحال میں انسان کا بچنا ایک ایسا معجزہ ہے جو اس شہر میں اکثر انسانوں سے اکثر پیش آتا رہتا ہے مگر وہ معجزہ اس دن نہیں ہوا۔ جس دن ایک ماں اپنی ڈھائی برس کی بچی کو کورنگی انڈسٹریل ایریا میں چلتی ہوئی کوچ سے اتار رہی تھی تو کوچ ڈرائیور اور اس کے کلینر کی لاپرواہی کی وجہ سے ایک ماں کے پاس کھڑی ایک دھائی برس کی بچی کوچ کے ٹائر کا نوالہ بن گئی۔ وہ ٹائر اتنا بڑا تھا اور وہ بچی اتنی چھوٹی تھی کہ اس کی چیخ بھی اس علاقے کے آسماں میں نہیں اڑ پائی جہاں فیکٹریوں سے دھواں اس طرح نکلتا ہے جس طرح گونگے چیخ رہے ہوں۔ کراچی کا وہ علاقہ جہاں بہت سارے غریب کچھ امیروں کو زیادہ امیر بنانے کے لیے دن رات محنت مشقت کرتے ہیں اس علاقے میں علیزہ ایک غیر اہم واقعہ بن کر اس دنیا سے چلی گئی۔ اس کی خبر کسی نیوز چینل۔ کسی انگریزی اخبار۔ کسی مغرور میڈیا میں نہیں آئی۔ کراچی کے عوامی اخبار "امت" نے علیزہ کی اس خبر کو اپنے آغوش میں لیا اور اس کو شایع کر دیا صرف یہ بتانے کے لیے اس شہر کے راستوں پر ہمارے بچے کتنے محفوظ ہیں؟

علیزہ کی یہ خبر کسی چینل کی بریکنگ نیوز نہ بن پائی۔ علیزہ کی اس خبر پر وزیر اعظم نے افسوس کا اظہار نہیں کیا اور نہ وزیر اعلی سندھ نے چوبیس گھنٹے میں رپورٹ پیش

کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اور نہ اس خبر پر چیف جسٹس صاحب نے سوؤموٹو ایکشن لیا۔ کسی نے کچھ نہیں کیا۔ اور تو اور ٹریفک پولیس کے اعلی افسر نے اس علاقے کے کسی ماتحت افسر کو معطل نہیں کیا۔ "سب چلتا ہے" کی دھن پر پورے شہر کے راستوں پر پہیئے چلتے ہیں۔ صنعتی یونٹس پراڈکٹس اگلتے رہے۔ دولت کی سنہری چمک کے ساتھ بینک چلتے رہے۔ اپنی کم عمر کم عقل اور کم تنخواؤں پر صرف مسکرانے اور سلپ بھروانے کا کام جاننے والی لڑکیوں اور دھوکوں میں ماہر مینیجروں کے دم سے پیسے کی لین دین چلتی رہی۔ جھوٹ موٹ کی باتیں اور لارے لپوں سے کاروبار جاری رہے۔ کوئی ہنسا۔ کوئی چیخا۔ کسی نے دہائی دی۔ کسی نے داد دی۔ اس سارے شور میں اس ماں کی سسکیاں دب کر رہ گئیں جو گھر سے ایک جیتی جاگتی بیٹی لیکر نکلی تھی مگر واپس آئی تو اس کے لاش کے ساتھ!!

اب علیزہ کے بارے میں کوئی کیا تذکرہ کرے؟ کوئی اس کے بارے کچھ بھی کہے گا تو وہ زمان ماضی استعمال کرے گا۔ وہ کہے گا کہ "علیزہ ایسی تھی" علیزہ کو "ہے" سے "تھی" کرنے والے اس معاشرے کو ہوش کب آئے گا؟ ہم آخر کیوں نہیں سمجھتے کہ کسی بھی غریب کا بچہ کسی گاڑی کے نیچے اس لیے آتا ہے کیوں وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے وہ طبقہ بذات خود ناانصافی کے ٹائر تلے دبا ہوا ہے اور مسلسل کچلتا جا رہا ہے۔ مگر نظام کا اندھا ڈرائیور بریک ہی نہیں لگاتا۔ گاڑی ہی نہیں روکتا۔ اور غریب طبقہ اپنی علیزاؤں کے ساتھ روڈ پر لہو سے لکھی ہوئی تحریر بن کر مٹتا جا رہا ہے اور یہ سوال شدت سے ابھر رہا ہے کہ "کہاں کا سفر ہے؟ کہاں جا رہے ہیں؟"

سکل بن پھول رہی سرسوں!

دنیا بہت بدل چکی تھی۔ ساڑھی کی جگہ جینز آگئی۔ لڑکیوں نے "آداب عرض" کیے بجائے "ہیلو" کو بھلا کر "ہائے" کہنا شروع کیا تھا۔ اب جوائنٹ فیملی سسٹم ایک جھنجٹ بن چکا تھا۔ اور بزرگ اس خوف سے خاموش رہنے لگے تھے کہ کہیں انہیں "اولڈ ہاؤس" کی راہ نہ دکھائی جائے۔ اس لیے وہ بڑی ہونے والی بچیوں کی "ہینگ آؤٹس" پر ہنسنے کے لیے مجبور تھے۔ اب پرانا دور دفن ہو رہا تھا۔ روایات رداؤں کی صورت اڑ چکی تھیں۔ ہر پرانی چیز "بیچ ڈالو" کے ڈر سے چپ تھی۔

مگر ثقافت کے سونے دریچے میں وہ سفید بالوں والی لڑکی ایک "شمع" کی مانند فروزاں رہی جس کی لو "ڈسکو" سے بہت سارے ہاتھ آگے والی موسیقی کے ماحول میں بھی امیر خسرو کے اس گیت پر لہراتی تھی کہ "سکل بن پھول رہی سرسوں"

وہ جوت، وہ لو، وہ روشنی آخر تک جھومتی رہی اس آنگن میں جہاں املتاس کے پیڑ سے پھول ہلکی سی ہوا میں بھی جھڑتے رہے!

وہ آنگن اب بہت اداس ہے۔ جس میں حیدرآباد دکھن کے دکھیارے اور گھبرائے ہوئے دل جیسا کلچر کنگن کی طرح کراچی کی کلائی میں اس آزادی کے ساتھ بہت خوش تھا جہاں "ڈولا آئے اور کھٹولا نکلے" کی روایت نے کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا۔

اب اداسی اس آنگن کا مقدر بن چکی ہے جس کی آخری "بنو" تھی وہ خاتون جو

پچاسی برس میں بھی "بجیا" کے نام سے بلائی جاتی تھی۔

اس ثقافت کی تباہی میں "ایم کیو ایم" کے کردار کی بات ہم پھر کبھی کریں گے۔

یہ لمحہ تو درد میں ڈوبے ہوئے دل کا لمحہ ہے۔ اس لمحے میں صرف ہمیں صرف اس "بجیا" کی بات کرنی ہے جو تبدیلی کی طوفان میں ایک تناور درخت کی طرح کھڑی رہیں۔ جس کی شاخائیں بلاتی رہیں ان بچیوں کو جو اپنے دیس میں جلاوطن تتلیاں بن چکی تھیں۔ جو انہیں آخر تک سمجھاتی رہی کہ "کلچر قید نہیں" بلکہ "آزادی" ہے۔ اس آزادی سے ناآشنا لڑکیوں کو اب اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ انہیں سمجھانے کے لیے وہ سفید بالوں والی لڑکی نہیں آئے گی جو آے آر خاتون کے ناولوں کو الیکٹرانک میڈیا پر ان ڈراموں کی صورت پیش کیا کرتی تھیں جس کے انتظار میں ایک ہفتہ ایک ماہ کے برابر محسوس ہوتا تھا۔

"شمع"

"افشاں"

"عروسہ"

ہر کہانی کے ساتھ ایک کردار جڑا تھا۔ ایک "اچھی بیٹی" کا کردار جو فرانس کی فیمینسٹ ادیبہ "سائمن ڈی بوار" کی کہانی "Dutiful Daughter" سے بہت مختلف تھا۔ مگر بہت خوبصورت تھا۔ اس میں مشرقی نسوانیت کا ایک ایسا حسن جلوہ گر تھا جس سے یہ دور محروم ہو چکا ہے۔

اس خاتون نے کبھی بھی نئے کلچر پر تنقید کا تیر نہیں چلایا۔ اس خاتون نے کبھی ماضی کے مورچے سے جدیدیت پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ وہ "پرامن بقائے باہم" کے اصول پر قائم رہی مگر اس نے کبھی اس کلچر کو فراموش نہیں کیا جس میں ڈھلتی ہوئی جوانی کے ساتھ عورت کا مقام کم ہونے کے بجائے بڑھتا رہتا تھا۔

کیا ہم نے صرف فاطمہ ثریا بجیا کو دفن کیا؟

نہیں ہم نے ڈیفنس کے قبرستان میں اس دور کو دفن کر دیا جو اب کبھی نہیں آئے گا اور نہ یہ گیت گائے گا کہ:

"نیم کی نمکولی سکھی، ساون آیا رے!"
"اماں میرے بابا کو بھیجو رے
کہ ساون آیا"

اب ساون آئے گا تو اس مٹی پر انکر اگانے کے لیے جہاں اس سفید بالوں والی سندری کو دفن کیا گیا جس کی قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے اردو ثقافت کے آخری سپاہی انور مقصود نے اپنے دل سے مخاطب ہوتے ہوئے یونان کے عظیم شاعر ہومر کے ان الفاظ کو دہرایا ہوگا کہ "برداشت کر۔۔۔ برداشت کر۔۔۔ تم اس سے زیادہ برداشت کر سکتے ہو" اور ساری عمر لوگوں کو ہنسانے والے اس روتے ہوئے شخص سے اپنے دل نے کہا ہوگا کہ "میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا"

ایک حساس دل کس طرح برداشت ہو سکتا ہے اس عورت کے ابدی فراق کا دکھ!

جو عورت صرف وہ آنگن نہ تھی جس سے گاڑی ریورس کرتے ہوئے وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی گملہ توڑ دیا کرتی تھی۔

اب وہ گملے سلامت رہیں گے اپنے روتے ہوئے پھولوں کے ساتھ جنہیں وہ صبح صادق کی حسین روشنی میں پانی دیا کرتی تھی۔

اسے سارے پھولوں سے محبت تھی اور ان سب پھولوں کو اس سے جو بذات خود ایک پھول تھی!

گلاب کا نہیں۔ موتیے کا بھی نہیں۔ سرسوں کا پھول!!

سرسوں کا وہ پھول جس پر بہت سارے پرانے گیتوں کی بھنورے منڈلاتے اور گاتے تھے:

"سکل بن پھول رہی سرسوں"

اب یہ نام نہاد جدید میڈیا موٹر وے پر دھند کی اطلاع تو بریکنگ نیوز کی صورت فراہم کرتا ہے مگر یہ نہیں بتاتا کہ "کہاں سرسوں پھول رہی ہے اور کہاں آم کی ڈالی پر کوئل کوک رہی ہے اور گوری سنگھار کر رہی ہے"

اب تو رادو ثقافت کی گوری ابدی سیج پر کفن کا کھیس اوڑھ کر کب کی سو چکی اور اس سے محبت کرنے والوں کو صبح میں بھی ایک سانجھ کی کیفیت محسوس ہو رہی ہے۔

اب گلزار کا یہ گیت ایک اداس گلاب کی مانند مہکے بھی تو کیا!

اب کوئی ساری زندگی محسوس کرتے رہے گا اس درد کو جس کو الفاظ میں پروتے ہوئے بھارت میں جلاوطنی کی کیفیت میں جینے والے شاعر نے لکھا تھا:

"تم گئے سب گیا
کوئی اپنی ہی مٹی تلے دب گیا"

وہ عورت صرف ایک درد نہیں بلکہ ایک دور تھی!

وہ دور جو دفن ہو گیا!!

اور پیچھے رہ گئے امیر خسرو کے یہ بول:

"سکل بن پھول رہی سرسوں"

اب تم کیا کرو گے؟

ایک سڑک پر تختی لگاؤ گے اس عورت کے نام کی جو راستہ نہیں ایک منزل تھی!

اب کیا کرو گے تم؟

ایک فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں لاؤ گے!

اور اس آرٹس کاؤنسل میں ایک تعزیتی اجلاس بلاؤ گے جس کے انتخابات کا معمہ "کراچی آپریشن" کے دائرے میں داخل ہو چکا ہے۔

کسی کا دل تو یہ صدا دے گا کہ:

"لاؤ سگاؤ کوئی جوش غضب کا انگار
وہ جوش کی آتش جرار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاؤ!
جس میں طاقت بھی ہو حرکت بھی توانائی بھی"

وہ آگ تو بجھ چکی!

وہ آگ جو ایک موم بتی کے ماتھے پر لہراتی تھی اور گاتی تھی:

"سکل بن پھول رہی سرسوں"

وہ عورت اب اس دنیا میں نہیں ہے جو علالت سے آخر تک لڑتی رہی۔ جس نے چاہا تھا کہ وہ اپنا آخری ڈرامہ "صحرا کی صدا" کے نام سے ان تھری بچوں پر لکھے جنہیں نہ دودھ میسر ہوتا ہے اور نہ دوائی!

اب یہ کام اس انور مقصود کو پورا کرنا ہوگا جس کے ہاتھ میں قلم تو ہے مگر وہ سیاہی کہاں سے لائے جو "بجیا" کی بھیگی ہوئی آنکھوں سے قطرہ قطرہ رستی رہتی تھی۔

ایک ٹیلنٹ ٹیڈ خاندان کی باصلاحیت خاتون اس دنیا میں نہیں رہی جس نے روائتی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔ اس نے کبھی یونیورسٹی میں کلاسز اٹینڈ نہیں کئے۔ لیکچرز نہیں سنے۔ نوٹس نہیں لیے۔ لیکن اپنے گھر میں اس نے جو مطالعہ کیا اور جس طرح سوچا اور سمجھا! وہ سب کچھ اس میں ایک شمع کی مانند جل اٹھا۔ جو خواتین مجبوری میں پردہ کرتی ہیں وہ آزاد ہونے کے بعد اپنے ماضی کے مصائب بیان کر کے ہمدردی کی بھیک بٹورتی رہتی ہیں۔ مگر اس خاتون کو اپنے اس ماضی پر فخر تھا جس میں سر پر دوپٹہ غلامی کی نہیں بلکہ حسین حیا کی علامت تھا۔ اس خاتون نے اپنی صلاحیتوں کو اس دور میں استعمال کیا جس دور میں ٹیلیویزن کی صورت ایک نیا میڈیا سامنے آیا تھا۔ ایک جدید میڈیا میں قدیم ثقافتی روایات کو اجاگر کرنے میں اس خاتون نے بھرپور کردار ادا کیا۔

اور وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کے باصلاحیت بھائی اور بہنیں بھی تھیں۔ اور وہ سب ایک مخصوص مائینڈ سیٹ سے جڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے پیچھے رہ جانے کے خوف میں اس جدیدیت سے سمجھوتہ نہیں کیا جس کے ساتھ ان کے اصولی اختلافات تھے۔ اپنے خاندان کے باقی باشعور افراد کی طرح بجیا کو بھی معلوم تھا کہ ان کا ثقافتی جنون ایک جزیرہ ہے۔ ایک ایسا جزیرہ جو جدید دور کے سمندر میں تیزی کے ساتھ جذب ہو رہا ہے مگر انہوں نے سیفٹی بوٹ کے لیے صدا نہیں کی۔

فاطمہ ثریا بجیا نے پچاسی برس کی بھرپور زندگی پائی۔ وہ ایک ایسی شمع کا مثال بنی جو سحر تک روشن رہتی ہے۔ ان کی زندگی کی کامیابی کا راز صرف قدرت سے عطا ہونے

والی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ محنت کش خاتون تھیں۔ اپنی محنت کی وجہ سے وہ وہ پرانے کلچر کے ساتھ بھی جدید دور کی خواتین سے بہت آگے نکل گئیں۔ انہوں نے اپنی شخصیت کی مہر اپنے دور پر ثبت کی۔ یہ بہت بڑی بات ہے!

وہ فرض شناس خاتون جس نے صرف خاندانی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے حصے میں آئی ہوئی اس ثقافت کے فروغ کے لیے بھی کام کیا جو ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح کراچی کے کلچرل سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ مگر جب تک وہ رہی انہوں نے اپنے آنچل جو ثقافتی پرچم بنائے رکھا اور ستار کی تاروں کے ساتھ انگلیوں کو الجھاتے ہوئے امیر خسرو کے ان بولوں کو سلجھاتی رہی کہ:

"سکل بن پھول رہی سرسوں
سکل بن پھول رہی سرسوں
امبوا پھوٹے، تیسوں پھولے، کوئل بولے ڈار ڈار
اور گوری کرت سنگھار
ملنیاں گدوالے آئیں کرسوں
سکل بن پھول رہی سرسوں"

سر درات کا چاند اور شاہ لطیف کی شاعری

کاش! ہمارے حالات اچھے ہوتے۔
اس دھرتی پر سرخی صرف گلابوں کی ہوتی۔
سرد ہواؤں میں گرم آنسوؤں کی نمی نہ ہوتی۔
تو ہم بات کرتے اس محبت کی جو ذہنی توازن کھو جانے والی لڑکی کی طرح "تلاش گمشدہ" کا اشتہار بن گئی ہے۔

کہاں ہے محبت؟
سب مایا ہے!
سب اڑتی پھرتی چھایا ہے!!
اس عشق میں ہم نے
جو کھویا جو پایا ہے
سب مایا ہے!!!

مگر اس شخص کے لیے محبت "مایا" نہیں تھی۔
جس شخص کی تصویر ہر سال بعد چاند کے فریم میں تین دنوں تک آویزاں رہتی ہے۔
وہ شخص جو اداس چاند کے رخسار پر مسکراتے ہوئے ستارے کی طرح معصوم ہے۔

کاش! اس شخص کی شاعری کو اوشو پڑھ پاتا۔

تو وہ موسم سرما کی پہلی بارش والی شام اپنے چیلوں سے ضرور کہتا کہ:

"آج میرا نہیں۔ کبیر بھی نہیں۔ آج صرف لطیف کی بات ہوگی۔ کیوں کہ جب لطیف کی بات ہوتی ہے تو پھر اور کسی کی بات کی کوئی گنجائش نہیں بچتی۔ جب لطیف گونجتا ہے تب اس میں سارے سر ایک مخصوص ردھم کے ساتھ بجنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ لطیف ایک تنہا ساز نہیں۔ وہ تو آرکیسٹرا ہے۔ جس میں سب موجود ہیں۔ رومی سے لیکر میرا تک اور گوتم بدھ سے لیکر گرونانک تک سب کی صدائیں اور سب کی خاموشیاں لہرانے لگتی ہیں لطیف کے سروں میں!!

لطیف تو خلا ہیں۔ جس میں سارے سیارے اور سارے ستارے رقصاں رہتے ہیں۔

آئیں! اس نیلی دنیا میں داخل ہوجائیں۔ اور یہاں داخل ہونے کے لیے کوئی دروازہ نہیں۔ لطیف خارجیت سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ لطیف کے لیے دل کے کواڑ کھولنے پڑتے ہیں۔ یہ داخلیت کی دنیا ہے۔ چھپی ہوئی۔ مخفی۔ شرمیلی محبت کی پہلی ملاقات کی طرح! اور یہ بات یاد رہے کہ لطیف کے معاملے میں جلدبازی مت کرنا۔ ورنہ تم لطیف کا حسن گنوا بیٹھو گے۔ لطیف کو آہستہ آہستہ اپنے اندر میں اتارنا۔ لطیف ایک ایسی مے ہیں جس کا نشہ دھیرے دھیرے چڑھتا ہے اور جب چڑھ جاتا ہے تو پھر اترنے کے نام نہیں لیتا۔ اس لیے لطیف کے سلسلے میں لطیف کا انداز اپنانا۔ وہ دھیما انداز۔ جیسے ایک ساز بجنا شروع ہوتا ہے۔ ہلکے سروں میں۔ جیسے بادل برستا ہے۔ پہلے ہلکی ہلکی بوندیں اور پھر جل تھل ایک کردینے والے آسمان سے امڈتے ہوئے آبشار!! لطیف ایسا ہے جیسے خزاں کے کھنکتے ہوئے جنگل میں ایک خاموش چنگاری جو دیکھتے دیکھتے خطرناک آگ میں بدل جاتی ہے۔

لطیف ایک شکاری پھول ہیں۔ نباتاتی دنیا میں کچھ پھول ایسے ہوتے ہیں جن پر تتلی بیٹھتی ہے تو آہستہ آہستہ اپنی پنکھڑیاں بند کرنے لگتے ہیں۔ ایک ایسا حسین جال ہیں لطیف! اس لیے لطیف کے پاس آنا تو اسیر ہونے آنا۔ اور یہ اسیری ایسی ہے جس

کے بعد انسان آزاد ہونے کی تمنا نہیں کرتا۔ یہ محبت کی قید ہے۔ دل کی دیواروں سے بنا ہوا وہ جیل جس سے نکلنے کا خدشہ بھی خوشیاں چھین لیتا ہے۔ لطیف محبت کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ ہے۔ لطیف لپ اسٹک نہیں کہ جب چاہی لگالی اور جب چاہی اتار لی۔ لطیف ایک کیفیت ہے۔ ایک ایسی کیفیت جو آتی تو ہے مہمان بن کر مگر پھر مکین بن ٹھہر جاتی ہے۔ لطیف دل کا ایک ایسا دام ہیں جو شروع تو ہوتا ہے دوستی سے مگر پھر کب محبت میں بدل جاتا ہے؟ اس کا پتہ ہی نہیں پڑتا ہے۔

سارے صوفیاء جز اور کل کی بات کرتے ہیں۔ لطیف بھی صوفی ہیں مگر وہ دوسرے صوفیاء کی مانند کل سے جز تک نہیں جاتے۔ وہ تو جز سے شروع ہوتے ہیں اور پھر کل میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے لطیف کی محبت میرا کی محبت جیسی نہیں۔ وہ محبت جو دنیا سے ہوتی ہوئی کرشن میں سما گئی۔ لطیف ایک دل سے شروع ہوتے ہیں اور پھر پوری کائنات میں پھیل جاتے ہیں۔ اور پھیلتے ہی جاتے ہیں۔ لطیف کو سرحدوں میں قید مت کرنا۔ لطیف کسی سیما میں سکڑ نہیں سکتے۔ وہ اسیم سے ملنے کی کلا کا نام ہے۔

لوگ محبت کرتے ہیں۔ مگر ان کی محبت آہستہ آہستہ ایک فرد تک محدود ہو جاتی ہے۔ اور بعد میں اس فرد کو بھی محدود کرنے لگتی ہے۔ اتنا محدود کہ محبوب اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ لطیف پھیلاتا ہے۔ وسیع کرتا ہے۔ اس لیے لطیف کی محبت کا کینوس لطیف کی طرح کائناتی ہے۔ مسلسل پھیلنے والا۔ ہر پل بڑھتا ہوا۔ اس لیے جب لطیف کی سسی پیار کرتی ہے پنہوں سے تو اس کو اس کے خاندان سے نہیں کاٹتی۔ اسے اپنوں سے جدا نہیں کرتی۔ پھر اسے پورے کیچ سے پیار ہو جاتا ہے۔ پھر اسے صرف پنہوں کی آنکھوں اور اس کی باتوں میں محبت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ تو ان اونٹوں سے پیار کرنے لگتی ہے جن پر سوار ہو کر وہ کبھی آیا تھا شہر بھنبھور میں۔ وہ صرف پنہوں سے پیار نہیں کرتی وہ تو ان راستوں پر بھی جان چھڑکتی ہے جن پر چلتے ہوئے پنہوں اس سے دور ہو گیا۔ وہ تو ان درختوں کو بھی گلے لگاتی ہے جن کے سائے میں پنہوں بیٹھا تھا۔ اور صرف سایہ دار درخت ہی نہیں بلکہ اپنے پیروں کو کاٹتے ہوئے پتھر بھی ان کو برے نہیں لگتے۔

لطیف کی شاعری محبت کی ایسی داستان ہے جس کی ابتدا تو ایک انسان سے ہوتی ہے مگر پھر وہ اپنے اندر اس دھرتی کو سمالیتی ہے جس دھرتی پر اس انسان کا آشیانہ ہوا کرتا ہے۔ پھر وہ صرف ایک گاؤں کو نہیں بلکہ پورے دیس سے الفت میں الجھ جاتی ہے۔ وہ ایسی محبت ہے جو محبوب کی آنکھوں سے ہوتی ہوئی اپنے آپ میں سارے دریاؤں کو سمالیتی ہے۔ سارے سمندروں کو سنبھال لیتی ہے۔اس میں سارے کھیت اور ساری جھیلیں جذب ہو جاتی ہے۔ پھر وہ محبت ان پرندوں کے لیے بھی پریشان ہو جاتی ہے جو سورج ڈھلنے کے بعد واپس نہیں لوٹتے۔وہ محبت ان کسانوں کو بھی اپنے دل میں بسا لیتی ہے جو بارش کے لیے دعا کرتے ہیں اور وہ محبت ان کمہاروں کے لیے بھی پریشان ہو جاتی ہے جو اپنے مٹی کے برتن دھوپ میں سکھانے کے لیے رکھتے ہیں۔

جب لطیف کی سوہنی اپنا دل ماہیوال کو دے بیٹھتی ہے تو وہ صرف ماہیوال تک محدود نہیں رہتی۔وہ اس کی بھینسوں سے پیار کرنے لگتی ہے اور جب وہ ماہیوال سے نہیں مل سکتی تو کنارے پر بیٹھ کر دریا سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ اسے اپنے دل کا حال بتاتی ہے۔اسے کہتی ہے کہ ”میری سہیلیاں مجھے محبت کے طعنے دیتی ہیں۔اے دیوانے دریا! تو میرے دل کی حقیقت کو جانتا ہے“

جب لطیف کی محبت مومل کا روپ دھار لیتی ہے تو وہ ان ستاروں سے بھی پیار کرتی ہے جو اس کے انتظار میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جو اسے بتاتے ہیں کہ اب رات کتنی باقی ہے۔وہ اپنے محل کے ان پردوں سے بھی لپٹ جاتی ہے جن کے ہلنے سے اسے رانو کے آنے کا گمان ہوتا ہے۔وہ اپنے کمرے کے اس پلنگ سے پیار کرتی ہے جس پر اس کا محبوب سوتا تھا۔ جس پر اب جدائی دھول بن کر جم گئی ہے۔

اور جب تماچی کینجھر کے کنارے بسنے والی نوری سے محبت کرتے ہیں تو اس کی محبت ان سارے مچھیروں سے بھی ہو جاتی ہے جن کے ساتھ وہ مل کر مچھلیاں پکڑتا ہے۔ جن گھروں سے اسے بدبو نہیں آتی۔ جن کے میلے کپڑوں سے اسے گھن نہیں آتی۔ وہ تو ان مچھیروں کی زندگیوں میں مسرت بکھیرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لطیف کہتے ہیں کہ ”جب جام تماچی آتا ہے تو جھونپڑیوں سے نکل آنے والے بچے مسکرانے

لگتے ہیں"

لطیف جس کی فرانسیسی شاعر بودلیئر کی طرح بادلوں سے محبت تھی مگر وہ محبت صرف کڑکتی ہوئی بجلیوں کے حسن کی قیدی نہیں تھی۔ اس محبت میں وہ کسان بھی شامل تھے جو بادلوں کو برستا دیکھ کر اپنے ہل اٹھاتے اور کھیتوں کی طرف چل نکلتے۔ اس محبت میں وہ پرندے بھی نظر آتے ہیں جو گرمیوں کی دھوپ میں جھلس جاتے ہیں۔ اس محبت میں وہ سیپیاں بھی ہیں جو بادل کی بوند کو ترستی ہیں۔ اس لیے لطیف بادلوں سے کہتے ہیں کہ صرف میرے لیے مت برسو۔ بلکہ صحرائے تھر کی ان سہاگن عورتوں کے لیے بھی برسو جنھوں نے بارش کی منت میں اپنے شوہروں کے ساتھ سونا چھوڑ دیا ہے۔ کیوں کہ محبت کا لطیفی مزاج ہے۔ یہ ایک مقام پر محدود نہیں رہتا۔

اس لیے تم لطیف سے پیار کرنے سے قبل یہ سوچ لینا کہ پھر تمھیں ان سب سے پیار کرنا پڑے گا جو لطیف کی دنیا میں بستے ہیں۔ وہ سمندروں کے کنارے جہاں سوداگروں کی محبتیں کا جل بھگوتی رہتی ہیں۔ جہاں جدائی غربت کی وجہ سے شدید ہو جاتی ہے۔ جہاں دکھ سے بھری ہوئی ہوا اس پوری بستی کو برفاب کر دیتی ہے جس میں موسم سرما کے دوراں نہ روئی ہوتی ہے نہ دوئی!!

لطیف محبت میں خود غرض نہیں۔ ان کے دل کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس میں سب سمائے ہوئے ہیں۔ اس دیس کے سارے انسان اور اس دنیا کے سارے دیس۔ اس لیے وہ بادلوں کو صرف سندھ پر برسنے کے لیے نہیں کہتے۔ وہ ان کی منت کرتے ہیں کہ سارے دیسوں پر برسو۔

اس دنیا کا المیہ یہی ہے کہ ہم محبت کو محدود کر دیتے ہیں۔ ہم دنیا سے نہیں بلکہ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ ہم ملک سے نہیں بلکہ اپنے شہر کو چاہتے ہیں۔ اور شہر میں اپنی گلی اور اپنے گھر کو! ہماری محبت سکڑتی جاتی ہے۔ لطیف کی محبت پھلتی ہے۔ پھولتی ہے۔ ایک موسم کی طرح!!

اس لیے اپنے آپ میں لطیف کو بسالو۔ تمہارے دل میں ساری دنیا خود بہ خود آباد ہو جائے گی۔ کیوں کہ لطیف میں سب ہیں۔ لطیف ایک ایسی وینا ہیں جس میں

سارے سر ہیں۔ تم صرف اس کی ایک تار کو چھیڑ کر دیکھو۔ پورا جلترنگ بج اٹھے گا۔ تم لطیف کی شاعری میں صرف ایک احساس کو اپناؤ پورا لطیف تمہارے دل میں بس جائے گا۔ مگر دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ!!

آج اگر لطیف کا ترنم پوری دنیا میں نہیں گونجتا تو کل گونجے گا۔ کیوں کہ وہ سر سفر میں ہیں۔ وہ چاروں دیشاؤں میں پھیلیں گے۔ سارے صحراؤں سارے پہاڑوں اور سارے میدانوں کو ہم رقص کرتے ہوئے محبت کا ایسا منظر پیش کریں گے جو اس سے پہلے کسی آنکھ نہیں دیکھا۔ وہ وہ منظر تم سے الگ نہیں ہوگا۔ اس منظر میں تم بھی شامل ہوگے۔

اس لیے جوگیوں، سناسیوں، مستوں، متوالوں اور سرکش سپاہیوں والی لطیفی دنیا میں ہر موسم اور ہر منظر میں صرف محبت ہی ملے گی۔ اس محبت میں مل کر تم بھی محبت بن جاؤ گے۔۔۔۔۔۔"

اوشو لطیف پر بات کرتے تو پھر کہیں نہیں رکتے۔ وہ موسم سرما کی پہلی بارش والی شام کو لطیف پر بات کرنا شروع کر دیتے اور ان کی شاعری میں جلتے ہوئے دلوں اور بجھتے ہوئے چراغوں کا سارا منظر پیش کرتے وہ وقت کی رفتار سے بچھڑ جاتے۔

اور اچانک ان کی نظر ڈھلے ہوئے آسمان میں پورے چاند پر پڑتی اور سرد رات میں محبت کی آگ بن کر جلنے والے چاند کو وہ کافی دیر تکتے رہتے اور ہونٹوں کو ہلکی سی لرزش دیتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہتے:

"آج بس اتنا ہی"

تمہاری آنکھوں میں ایک تل ہے!

''تمہارا کہنا ہے
تم مجھے شدت کے ساتھ چاہتے ہو
تمہاری چاہت
وصال کی آخری حدوں تک
میرے، فقط میرے نام ہو گی
مجھے یقیں ہے۔۔۔ مجھے یقیں ہے
مگر قسم کھانے والے لڑکے
تمہاری آنکھوں میں ایک تل ہے''

''تحفظ نسواں'' والے پنجابی بل کی آنکھوں میں بھی ایک تل ہے!
مگر ہم آج اس ''متنازعہ بل'' پر بات نہیں کریں گے!
آج ہم اس فیمینسٹ اردو شاعرہ کے اس ''نظم'' پر بھی تبصرہ نہیں کریں گے
جس میں ایک عورت محبت کی قسمیں کھانے والے مرد سے پوچھتی ہے کہ:
''کب تم مجھ سے پیار کرو گے؟
کب تک؟؟''
جب تک میں اپنی کوکھ سے اس بچے کو پیدا کرنے کے قابل رہوں گی جس کو

دیکھ کر سب کہیں کہ "بالکل اپنے باپ پر گیا ہے"
جب تک میں اس بچی کو پیدا کر سکتی ہوں جس پر تم نم آنکھوں کے ساتھ اپنی مر جانے والی ماں کا نام رکھو گے!

جب میرا رنگ ہے تازہ؟

جب تک میرا انگ تنا ہے؟

اس سے آگے بھی تو کچھ ہے!

انجانے کا شوق بڑا ہے!

لیکن تم میرے ساتھ "نہ" رہو گے

تب تک!!

کب تک مجھ سے پیار کرو گے تب تک؟"

اس جذباتی شعر کی گہرائی میں نہیں جائیں گے!

اس کڑوے سچ والا لطیفہ انگریزی لطیفہ بھی نہیں سنائے گے جس میں بتایا گیا ہے کہ:

لڑکا پوچھتا ہے "کیا میں تمہاری زندگی میں آنا والا پہلا لڑکا ہوں؟"

اور لڑکی پوچھتی ہے "کیا میں تمہاری زندگی میں آنے والی آخری لڑکی ہوں؟"

آج ہم اس معاشرے کی بات بھی نہیں کریں گے "جہاں ایک عمر رسیدہ عورت مسلسل پلاسٹک سرجری کروانے کے بعد اپنے آپ کو آئینے میں تلاش کرتے ہوئے رونے لگتی ہے۔ گھر سے بچھڑ جانے والی بچی کی طرح!!"

اور اس معاشرے میں بسنے والے شاعر کی بات بھی نہیں کرینگے جس نے اپنی جیون ساتھی سے کہا تھا:

"تم اپنے بالوں کو سیاہ رنگ کیوں کرتی ہو؟

تمہارے سفید بال دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ساتھ ایک زندگی بتائی ہے"

ہم اس دنیا کا تذکرہ پھر کبھی کریں گے جہاں عمر کے ساتھ عورت کی اہمیت کم

ہوتی جاتی ہے۔

اور ہم ان پسماندہ وادیوں اور دھول کی دیواروں میں نظر نہ آنے والے ان دیہاتوں کی بات بھی نہیں کریں گے جہاں ایک عورت عمر بڑھنے کے ساتھ زیادہ بااختیار ہوتی جاتی ہے!

وہ گھر جہاں پوتا پیدا ہوتا ہے!

وہ آنگن جہاں سے پوتی وداع ہوتی ہے!!

وہ ماحول جس میں ایک آنکھ سے غم اور دوسری آنکھ سے خوشی کا آنسو ڈھلکتا ہے!

وہ مسجد جس کا مولوی نکاح پڑھاتا ہے!!

وہ مندر جس میں ایک بیٹا اپنی پہلی تنخواہ بوڑھی ماں کے قدموں میں بھینٹ کرتا ہے!

اور وہ ڈانس ہال جہاں ایک دوسرے کی بانہوں میں جھولتے لوگ بھولتے رہتے ہیں کہ "پانچ منٹ پہلے انہوں کیا کہا تھا؟"

چاند آسمان سے اتر کر کسی کی بندی بن بھی سکتا ہے
یہ سب ستارے کسی کے بکھرے ہوئے سے گسیوؤں میں
سج بھی سکتے ہیں:
"مگر قسم کھانے والے لڑکے تمہاری آنکھوں میں ایک تل ہے"

جی ہاں! پنجاب اسیمبلی کے اس بل کی آنکھوں میں بھی ایک تل ہے!

جو اس "آزادی نسواں" کی وکالت نہیں کر رہا جس کے بارے میں علامہ اقبال نے لکھا تھا کہ:

"کچھ اس کا فیصلہ میں میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

اس راز کو عورت کی بصیر ہی کرے فاش
معذور ہیں مجبور ہیں مردان خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و نمائش میں زیادہ؟
آزادی نسواں یا زمرد کا گلوبند؟"

اب تو "گوگل" نے انٹرنیٹ پر "تھری ڈبلیوز" کی پابندی کو ختم کر ڈالا ہے مگر "مدہوش" تو کیا "باہوش" محفلوں میں اب بھی یہ سوال بیحد اہم ہے کہ "What Woman Wants?"

یعنی: عورت آخر کیا چاہتی ہے؟
کیا وہ عورت صدیوں کے سفر میں کہیں بھٹک گئی؟ جو کہتی تھی:
"کوٹھی نہ بنگلہ مانگوں
جھمکا نہ کار مانگوں
دل کو چرانے والے
دل کا قرار مانگوں!"
کیا اب عورت دل نہیں بلکہ دولت کا پتہ پوچھتی ہے؟
کیا اس کو "محبت" نہیں بلکہ "عزت" چاہیے؟
کیا وہ دور گذر گیا جس میں مرد "عزت"
اور عورت "محبت" کی متلاشی ہوا کرتی تھی!؟

کیا ہم وہ گلیاں پیچھے چھوڑ آئے جس کے بارے میں ایک رومانوی شاعر نے کہا تھا کہ:

"جہاں تیرے پاؤں کے کنول گرا کرتے تھے
ہنسے تو گالوں میں بھنور پڑا کرتے تھے
تیری کمر کے بل پر
ندی مڑا کرتی تھی!
ہنسی تیری سن سن کر

فصل پکا کرتی تھی"

کیا اس "جٹی" کا دور گذر گیا؟

جو چناب میں چراغ بن کر جلا کرتی تھی!

کیا اب اس "پتلو" کا دور آگیا ہے جو "ڈائٹ کھجوریں" اور "ڈائٹ پکوڑے" مانگتی ہے!

کیا وہ "تن کے روزے" اس لیے نہیں رکھتی کہ "من کی عید" ہو جائے؟

ہم اس عورت کی بات نہیں کر رہے جو ایک "قانون کے قیدی" مرد کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہشمند ہے!

روس کے عظیم ناول نگار دوستووسکی نے اپنے ناول "جواری" میں لکھا تھا کہ "ایک عورت غلام کے سامنے لباس تبدیل کر سکتی ہے مگر اس سے محبت نہیں کر سکتی"

کیا آج کی عورت کو "غلام عاشق" کی ضرورت ہے؟

کیا ایک غلام عشق کر سکتا ہے؟

مجھے معلوم ہے کہ مولوی بھی محبت کرتے ہیں!

مگر ہم مولانا فضل الرحمان کی بات کیوں کریں؟

ہمیں اس عورت کی بات کرنی ہے جو چاہتی ہے کہ کوئی اس کا انتظار کرے؟

جو اس کو بار بار فون کرے۔

جو اس سے پوچھے "تم کہاں ہو؟ کیسی ہو؟ کب آؤ گی؟"

جو اس سے کہے کہ "کیا میں تمہیں پک کرنے کے لیے آجاؤں؟"

وہ عورت بہت پریشان ہے جس کو اب کھانا پکانا بھی نہیں آتا!

وہ عورت جو اب کما سکتی ہے مگر وہ جانتی ہیں کہ "بچے پیسے نہیں کھاتے۔ وہ کھانا کھاتے ہیں"

اور پیسوں کو کھانے میں تبدیل کرنے کا ہنر تو اس سے موجودہ دور نے چھین لیا ہے!

اور اس کو آزاد کر دیا ہے کہ ایک ماڈرن فلیٹ میں دو بچوں کے ساتھ تنہا رہتے

ہوئے "فوڈ چین" کو بار بار فون کرتی رہے اور بغیر گیر والی آٹو میٹک کار کو پارک کرنے کے لیے پریشان ہوتی رہے۔

"تحفظ نسواں" نامی "اس بل کی آنکھوں میں ایک تل ہے"

جو عورت کو تنہا کرنا چاہتا ہے۔ جو اس سے وہ "مرد" چھیننا چاہتا ہے جو "تھوڑا سا پگلا اور تھوڑا سیانا ہو"

اور بات صرف ایک رشتے کی نہیں! اس پورے پیکیج کی ہے جو ایک کلچر اس عورت کو بہت سارے رشتوں کی صورت عطا کرتا ہے۔

یہ ایک بل ہے۔ کلچر نہیں!

بل بیحد مختصر اور کلچر بہت وسیع ہوتا ہے!

وہ کون تھا؟

وہ عکس بن کے ابھی چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے!

مگر پانی کا وہ گھر بہت جلد خشک ہونے والا ہے۔ بہت جلد بھیگی آنکھیں بھول کی دھول میں اٹ جائیں گی۔ بہت جلد وہ راہ معدوم ہو جائے گی اور اس پر موجود ان پیروں کے نشاں مٹ جائیں گے، جو پہنتے تھے کسی لاوارث لاش کے پیروں میں پڑی پلاسٹک کی چمپل!!

وہ جو اپنی تکھاوٹ سے کہا کرتے تھے ”مجھے مت ستاؤ مجھے بہت دور جانا ہے“

امر جلیل ان کے اس سفر پر ”سرد لاش کا سفر پارٹ ٹو“ کے عنوان سے ایک عظیم افسانہ لکھ سکتے ہیں۔

وہ سفر جو ”انیس توپوں کی سلامی“ اور ”ایک سبق“ پر اختتام پزیر ہوا۔

کیا تھا وہ سبق؟

وہ سبق یہ تھا کہ ”عوام کی خدمت اقتدار کے بغیر بھی کی جاسکتی ہے“

یا

وہ سبق یہ تھا کہ ”عوام کی خدمت اقتدار کے بغیر ہی کی جاسکتی ہے“

یہ بہت پیچیدہ بحث ہے۔

اس میں بہت سارے دانشوروں کے سگرٹوں، سگاروں اور پائپس سے اٹھتا ہو

دھواں اس سوال کو دھندھلا کر دینگے کہ "وہ کون تھا؟"

وہ مولانا تھا یا مارکسٹ؟

کیا وہ برازیل کے اس بوڑھے بشپ ہلیڈر کامارا کی طرح کے اپنی راہ پر چلنے والا ایک ایسا فقیر تھا جس سے جب اوریانا فلاچی نے پوچھا "اگر تم بشپ نہ ہوتے تو کیا بنتے؟"

تب اس نے کہا تھا کہ "میں جرنلسٹ بنتا"

برازیل کے بوڑھے فادر نے اٹلی کی اس خوبصورت اور خطرناک رائٹر کو یہی جواب ملا جو "تاریخ سے انٹرویو" کرنے چلی تھی۔ آمریت میں عوام کی خدمت کرنے والے اس بشپ نے اسے بتایا ہوگا کہ "اگر میں مسیحا کے مانند انسانیت کے جسم پر لگے ہوئے سارے زخم سی نہیں سکتا تو کم از کم انہیں گن تو سکتا ہوں!!!"

وہ شخص بھی ساری زندگی ان لاوارث لاشوں کے زخم گنتا رہا جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ "انہیں کس نے اور کیوں قتل کیا؟" بوری میں بند ان مقتولوں میں بہت سارے مقتول ایسے بھی تھے جن کو خود بھی خبر نہ تھی کہ انہیں "کون اور کیوں؟" مار رہا ہے؟ وہ 92 کا دور تھا۔ لاشیں بچھانے والوں کو دہشت پھیلانا تھی اور اس دہشت میں نہیں آیا تو وہ عبدالستار ایدھی جس کی ایمبولنسیں ان گلیوں میں بھی گھس جاتیں تھیں جہاں فائرنگ کا تبادلہ ہوا کرتا تھا۔

اب وہ جب اس دنیا میں نہیں رہا تھا تب اعزازات کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت پر اپنے پسندیدہ تعارف مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جب تک وہ خیمہ افلاک کے نیچے رہتا تھا تب تک اس سے کسی نے یہ سوال نہیں پوچھا کہ تم کون ہو؟ حالانکہ وہ کچھ سوچ کر ہر سوال کا جواب دیا کرتا تھا۔ مگر اس سے کسی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ تم کون ہو؟ شاید ہم ڈرتے تھے۔ ہمیں خوف تھا کہ کہیں وہ اپنا تعارف ایسا نہ کرادے جو ہمارے دل پر گراں گذرے۔ اب جب وہ نہیں رہا تب ہمیں اس کو مخصوص فلسفے کی سولی پر چڑھانے فکر لاحق ہوگئی ہے۔ مگر اس سے کیا حاصل ہوگا؟ اگر یہ ثابت بھی ہوجائے کہ عبدالستار ایدھی کس مسلک سے منسلک تھے

تو کیا اس سے یہ بات ثابت ہو پائے گی کہ وہ اس مسلک کی وجہ سے عظیم انسان بنے؟ مسلک انسان کو عظمت سے ہم کنار نہیں کرتے۔ یہ عمل ہے۔ جس سے زندگی بنتی ہے۔ جنت بھی۔ جہنم بھی! ایدھی جو بھی کچھ بنا اپنے اعمال کے باعث بنا۔ اس کے اعمال سب کے لیے تھے۔ جیسے چاند کی چاندنی مخصوص مسلک کے مخصوص نہیں ہوتی۔ جیسے سورج مخصوص لوگوں کے لیے نہیں ابھرتا۔ ویسے ہی عبدالستار ایدھی بھی سب کی خدمت کرنے کے لیے اس دنیا میں آیا تھا۔ اس نے مخصوص لوگوں کو خوش کرنے کے لیے خدمت کی راہ نہیں اپنائی۔ اس کی "ایدھی فاؤنڈیشن" کسی پارٹی کا فلاحی فرنٹ نہ تھا۔ حالانکہ ہر مسلک نے ایدھی کو اپنے دائرے میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ ہر پارٹی نے اس کے دفتر پر اپنا پرچم لہراتا دیکھنا چاہا۔ کچھ سیاستدانوں نے اسے خوشامد کے ذریعے اپنا اسیر بنانے کی کوشش کی اور کچھ سیاستدانوں نے انہیں ڈرایا دھمکایا۔ مگر وہ کسی دام میں نہیں آیا۔ وہ جو بہت سادہ بھی تھا اور بہت سیانہ بھی تھا۔ وہ جو دیوانہ بھی تھا اور داناہ بھی تھا۔ وہ کنجوس بھی تھا اور سخی بھی تھا۔ وہ امیر بھی تھا اور فقیر بھی تھا۔ وہ ایدھی تھا!!

وہ ایسی شخصیت کا مالک تھا جو انسانوں کو توڑتی نہیں جوڑتی ہے۔ ایدھی جیسے لوگ معاشروں کو منتشر نہیں کرتے۔ ایسے افراد معاشروں کو منظم کرتے ہیں۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ فکر اور فلسفے لوگوں کے درمیاں دوریاں پیدا کرنے والی دیواریں بن جاتے ہیں۔ اس لیے وہ لوگ مباحثے نہیں کرتے۔ جھگڑتے نہیں۔ انا نہیں دکھاتے۔ وہ مسکراتے ہیں اور کام میں مشغول نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ معاشرے کی ماں جیسے ہوتے ہیں۔ وہ ماں جو اولاد کا نظریہ نہیں دیکھتی۔ بچوں کا خالی پیٹ اور میلے کپڑوں اور نیند سے بھری ہوئی آنکھوں پر نظر رکھتی ہے۔ کوئی بھی ماں اولاد کے فکر اور فلسفے سے اتفاق کرنے کیے بعد ان کی خدمت نہیں کرتی۔ اور ایسا بھی نہیں ہوتا کہ ماں امیر بچے کا غریب بچے سے زیادہ خیال رکھے اور دیوانے بچے کے مقابلے میں داناہ بچے سے زیادہ محبت کرے!!! اکثر طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ مائیں ان بچوں کا زیادہ خیال رکھتی ہیں جو غریب ہوتے ہیں۔ جو ذہین نہیں ہوتے۔ جو زندگی کی دوڑ میں پیچھے آگے بڑھنے کے

بجائے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان بچوں سے مائیں زیادہ محبت کرتی ہیں۔

ایدھی بھی ایسا تھا۔ وہ اس معاشرے کی ماں تھا۔ وہ لاوارثوں کا وارث تھا۔ پھر وہ لاوارث جھولوں میں پڑے ہوئے بچے ہوں یا جھاڑیوں میں پڑے ہوئے لاش ہوں۔ وہ سب کی خدمت کرنے والا شخص تھا۔ اس نے کبھی بھی کسی زباں اور کسی کلچر اور کسی عقیدے کے بنیاد پر اپنا خادم ہاتھ نہیں روکا۔ وہ ایک کشادہ دل انسان تھے۔

"غمِ جہاں، غمِ یار ہو کہ تیر ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں"

ستار ایدھی خود ایک کشادہ دل تھے۔ وہ دل جس میں سب بستے تھے۔ سارے مذہب، سارے مسلک، سارے فکر، سارے فلسفے، ساری زباں میں، سب ثقافتیں!!

ایدھی کے نے اپنے دل کے دروازے کسی سائل پر یہ سوچ کر بند نہیں کیے کہ یہ میرے ہم عقیدہ یا ہم زباں نہیں ہے! اگر ایدھی ایسا کچھ کرتے تو ایدھی نہ بنتے۔ سیاستدان بن جاتے۔ وہ سیاستدان نہ تھے۔ ایدھی تھے۔ سب کے تھے۔ سب کے لیے تھے۔ سب کے ساتھ تھے۔

کبھی کبھار مباحثوں کے محدود دائروں میں بہت سارے قافلے پیچھے رہ جاتے ہیں اور کچھ افراد بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ افراد جو دریاؤں، صحراؤں اور سمندروں سے راستے نکالتے ہوئے اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جس منزل پر پہنچنے کے لیے وہ پیدا ہوتے ہیں۔ ایدھی ایسے انسان تھے۔ انہیں نہ اپنی کمیونٹی قید کر سکی اور نہ اپنی زباں محدود کر پائی۔ وہ ہر بندش کو توڑتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ انہوں نے ہر دہشت کا مقابلہ بہادری سے کیا۔ انہوں نے کبھی کسی سرکاری سائے کی تمنا نہیں کی۔ وہ کڑی دھوپ میں چلنے والے مسافر تھے۔ ان کی سب سے بڑی حاصلات یہ تھی کہ انہوں نے لالچ اور خوف کی ہر سرحد پیچھے چھوڑ دی اور خود آگے بڑھ گئے۔ چونکہ انہیں کوئی لالچ نہیں تھی۔ اس لیے انہیں کوئی خوف بھی نہ تھا۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ وہ حقیقی طور پر آزاد انسان تھے۔ ایسی آزادی کا خواب چےئرمین ماؤ نے دیکھا مگر وہ بھی اس حقیقت سے دور تھے۔ جب ایک امریکی صحافی نے ان سے پوچھا تھا کہ "ماؤزے تنگ

کون ہیں" تو ماؤ نے اپنا مخصوص دانشورانہ اور شاعرانہ انداز اپناتے ہوئے کہا تھا کہ "وہ ایک ایسا بیراگی ہے جو ایک پھٹی ہوئی چھتری کے ساتھ تیز بارش میں سفیدے کے درختوں والے جنگل سے نکل کر ایک پگ ڈنڈی پر چل رہا ہے"

ماؤ کو خود بھی معلوم تھا کہ وہ ایسا نہیں ہے۔ مگر عبدالستار ایدھی تو اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ایسے ہیں۔ ایک ایسے تارک الدنیا درویش جو دنیا میں نہ ہوتے ہوئے بھی دنیا میں تھے۔ وہ ایک ایسے درویش تھے جنہوں نے لالچ اور خوف سے نجات حاصل کرلی تھی۔ نہ ان کو لالچ کا روگ تھا نہ خوف کی بیماری۔ لالچ اور خوف سے بلند ہونے باعث وہ حقیقی طور پر ایک آزاد انسان تھے۔ وہ آزاد تھے۔ وہ ایدھی تھے۔

وہ ایدھی جو اپنے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرنے سے شرماتا تھا۔ کیا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ سر بازار بینر کے ساتھ بھیک مانگنے والا وہ شخص شرمیلا بھی ہو سکتا ہے؟ مگر اس کو قریب سے جاننے والوں کو معلوم تھا کہ وہ بہت شرمیلا بھی ہے۔

وہ جو اپنے پلاننگ اور اپنے ارادوں میں کرسٹل کی طرح کلئیر تھا۔ وہ شخص اپنی ذات کے بارے میں بہت کنفیوز تھا۔ جس طرح لبنان کے عظیم شاعر اور مفکر خلیل جبران نے لکھا تھا کہ "میں کسی شخص کے سامنے لاجواب نہیں ہوا سوائے اس شخص کے جس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ "تم کون ہو؟" اس وقت عبدالستار ایدھی اس دنیا میں نہیں ہیں اگر ہوتے اور ان سے ان پر لڑنے والے ان سے پوچھنے جاتے کہ "ایدھی صاحب آپ کون ہیں؟" تو اس شخص کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ مہکنے لگتی اور وہ جان چھڑانے کے لیے سوال پوچھنے والوں سے یہی کہتے جو وہ عام طور پر کہتے رہتے تھے کہ "میں ایک انسان ہوں" مگر جب سارے لوگ چلے جاتے اور ساری آوازیں سو جاتیں تب اس کے دل کے ساز پر وہی گیت بجنے لگتا جو ایک سوال بھی ہے اور ایک جواب بھی ہے۔ وہی گیت جو بابا بلھے شاہ نے اس وقت گنگنایا تھا جب اس سے ضد کے ساتھ پوچھا گیا کہ "آپ کون ہیں؟" تب انہوں گاتے ہوئے کہا تھا:

"بلھیا! کی جاناں میں کون؟"

یہ وہ جواب ہے جو ایدھی صاحب کے دل کے ساز پر بجتا تھا۔

وہ ایدھی صاحب جو کبھی قلت آب کا شکار رہنے والے شہر میں رہتے تھے اور چند دنوں سے ہمارے چشم تر میں بستے ہیں۔ وہ جو عجیب شخص ہیں اور پانی میں گھر میں بستے ہیں۔ سنا ہے کہ میٹھے در میں رہنے والے اس شخص کا کھارے پانی والا موجودہ گھر بھی بہت جلد خشک ہونے والا ہے۔

میری پیاری پوتی

زیڈ اے بھٹو ایک ادیب بھی تھے۔
کاش! انہیں سولی پر نہ لٹکایا جاتا
کاش! انہیں تاحیات قید کیا جاتا
کاش! انہیں ہر شام ایک بوتل، ایک قلم اور بہت سارے کاغذ دیے جاتے!!
کاش! وہ ایک خط اپنی پوتی کے نام بھی لکھتے
کاش! اس کا انداز کچھ اس طرح ہوتا:
"فاطی!

ایک تاحیات قیدی اپنی اس خوبصورت اور ذہین پوتی سے اظہار محبت کرتے ہوئے کیا لکھ سکتا ہے؟ جو بذات خود ایک ادیب ہے۔ جو اچھے سے جانتی ہے کہ احساسات الفاظ سے عظیم ہوتے ہیں۔ جس کو معلوم ہے کہ محبت کی باتیں بند ہونٹوں سے کی جاتی ہیں۔ اور سب سے بہتر خط صرف وہ ہوتا ہے جس کا کاغذ کورا ہو۔

میری سیاہی سے دل میلا مت کرنا۔ اس خط میں وہ باتیں کم پڑھنا جو میں لکھ سکا ہوں۔ اس خط میں وہ باتیں دھیان سے پڑھنا جو میں لکھ نہیں پایا۔

تم اس بات کو بہتر جانتی ہو کہ پیار ایک خوبصورت پاگل پن کا نام ہے۔ کیوں کہ تم جوان ہو۔ تمہیں تجربہ ہے کہ بہت سارے افراد سے بھرا ہوا ایک ایئرپورٹ کس طرح ایک دم اداس ہو جاتا ہے؟ کس طرح ایک لمحہ لینڈ کرتا ہے؟ کس طرح ایک

احساس کا ٹیک آف ہوتا ہے؟ محبت کا معاملہ آرتھر کوسلر کی کتاب "آمد اور روانگی" (Arrival and Departure) سے کہیں زیادہ اوپر کی بات ہے۔ دل پر نازل ہونے والے کسی مقدس صحیفے کے تقابلے میں کسی ناول کا تذکرہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ مگر محبت لامحدود اور اظہار ایک حد میں مقید ہوتا ہے۔

فاطی!

میرا خیال ہے کہ میں کچھ فلسفیانہ فہم میں الجھ گیا ہوں۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ میں تم سے عالمانہ گفتگو کروں۔ میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارا جنم اس لیے نہیں ہوا کہ میں تمھیں متاثر کروں۔ تم نے اس لیے جنم لیا کہ میں تم سے محبت کروں۔ تمہارے پتلے ہاتھوں کی نرماہٹ محسوس کروں۔ تم سے اس طرح پیار کروں جس طرح میری ماں مجھ سے کیا کرتی تھی۔ میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم ہو بہو اپنی دادی پر گئی ہو۔ وہی پتلی ناک۔ وہی ناراض آنکھیں۔ وہی چھوٹا قد اور وہی بلند حوصلہ۔

میرے اداس گھونسلے کی چڑیا! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔

میں وہ ساری محبت تمہارے سپرد کرتا ہوں جو میں تمہارے والد اور اپنے بڑے بیٹے کو نہ دے پایا۔ تمہارا والد میرے دادا کی طرح تھا، بہت ضدی اور بیحد سرکش۔ میں اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ میں اس سے بہت گھبراتا تھا۔ میری پہلی اور آخری محبت اور تمہاری "جونم" ٹھیک کہا کرتی تھی "یہ میرا قصور تھا کہ میں اس کا نام مرتضی رکھا۔ سلیو لیس بلاؤز پہننے کے باوجود تمہاری دادی سادہ دل سندھیوں کی طرح اس مفروضے کو مانتی تھی کہ "نام کی نسبت انسان پر اثر انداز ہوتی ہے" تم اس بات پر مسکرا سکتی ہو!!

فاطی!

میری چھوٹی سی گڑیا۔ مجھے اس بات کا فخر بھی ہے کہ تم میری پوتی ہو۔ مجھے اس بات کی فکر بھی ہے کہ میں تمہارا دادا ہوں۔ تم امیدوں کا آشیانہ ہو اور میں حسرتوں کا دیار!

میری پیاری پوتی!

مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس وقت بھی تمہارے ہاتھ نہیں تھامے تھے جب تم نے اپنے ننھے پیروں سے زندگی کا پہلا قدم اٹھایا۔ جب تم لڑکھڑائی اور تم بہت گھبرائی۔ تمہاری زندگی کا وہ پیارا پل میں اس سیل کی اسکرین پر بار بار ریپیٹ کرتا ہوں۔

چلو! ہم بہت ہلکی باتیں کرتے ہیں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں ''ال مرتضیٰ'' کے قصے اور وہ کہانیاں جو تمہاری دادی مجھے سلانے کے لیے سناتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے گھر میں اب تک وہ نیم کا درخت موجود ہے یا نہیں جس پر ہر صبح ایک اداس کوئل نوحہ سناتی تھی۔ میں تمہیں ان کھیتوں کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو اب فلسطین کی مقبوضہ سرزمین ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم عربی دکھ کے احساس سے آگاہ ہو۔ میں تمہیں بتانا چاہتوں کہ ہماری قوم اور عربوں میں بہت ساری باتیں مشترکہ ہیں۔ ہم بھی عربوں کی طرح عظیم تہذیب کے کھنڈارت میں مدفون انسان کا ایک ایسا ہجوم ہیں جو انفرادی طور بہادر اور اجتماعی طور پر بزدل ہے۔ مصر کے اہراموں اور موہن جو دڑو کی شکستہ دیواروں پر ایک تہذیب کی کہانی تاریخ نے بہت اداس دل سے لکھی ہے۔

فاطی!

مجھے خوشی سے زیادہ فخر ہے کہ میں تم سے اداس احساسات شیئر کر سکتا ہوں۔ مجھے تمہیں یہ بات بتانے میں ایک ملال سی مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ میں اپنے خاندان کا ایک تنہا سا فرد ہوں۔ ٹینی سن کی اس نظم کی طرح جس میں ''ڈالی پر بیٹھے ایک اکیلے پرندے'' کا تذکرہ ہے۔ میں جب تم سے چھوٹا تھا تب اس نظم کو میں نے بار بار پڑھا۔

میری پیاری پوتی!

ہر پرندے کی طرح ہر انسان اس اداس درخت جیسی دنیا پر ایک گیت گانے آتا ہے۔

تمہارے دادا نے ''عوامی الفت کے گیت'' گائے۔
ان گیتوں پر میرے مخالفین نے گندے الزام لگائے۔

مگر وہ گیت ان سب کو پسند تھے جن کے لیے میں نے گائے!

مجھے اپنی تقریروں کو گیت کہنے دو۔ کیوں کہ یہ علم اور عقل سے زیادہ عشق کا معاملہ تھا۔ میری وہ بے تسلسل تقریریں، میرے وہ ٹوٹے پھوٹے گیت۔ ان انسانوں کے لیے تھے جو میرے ترنم کی طرح ٹوٹے پھوٹے تھے۔

میری پیاری فاطی!

یہ اعتراف میں صرف تم سے کر سکتا ہوں کہ مجھ میں میکاولی اور منصور مستقل طور پر پنجہ آزمائی کرتے رہے ہیں۔ میری ذات عقل اور عشق کا میدان جنگ ہے۔ زندگی صرف ایک رومانوی داستان نہیں۔ حیات کے تقاضے بہت تلخ ہیں۔ میری بچی زندگی صرف سانس لینے کا سوال نہیں۔ وقت ایک کاکروچ کی طرح یاداشت کی رنگین تصاویر کو کترتا رہتا ہے۔ ایک عاشق کو ایک عیار بننا پڑتا ہے۔

ہاں! تو میں تمہیں بتا رہا تھا لاڑکانہ میں تمہارے گھر اور تمہارے کھیتوں کی باتیں۔

ان تازہ امرودوں کی خوشبو جو تھوڑے کچے ہوتے تھے۔ اس کسان کی بیٹی کی مسکراہٹ کے مانند جس کا رنگ دھوپ کی وجہ سے سانولا ہو گیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ تم ان احساسات کو کن حالات میں پڑھ رہی ہو؟

میں نہیں جانتا کہ تم کہاں ہو؟

چند دن قبل مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم میرے ہم نام پوتے کے ہمراہ تھیں۔

میری جان!

مجھے معلوم کہ تمہارے بھائی کی زندگی بھی تمہاری طرح کھوئے ہوئے والد کی جستجو ہے۔

کاش! میرے لیے یہ ممکن ہوتا کہ میں تم دونوں کو وہ لوری سناتا جو تمہاری دادی میرے لیے گاتی تھی۔ کیا ہوا اگرچہ میری آواز اس قدر میٹھی نہیں۔

میری فاطی!

میری پیاری فاطی!

زخم بہت ضروری ہیں۔ زخم روح کی شاخ پر مہکتے ہوئے پھول ہوتے ہیں۔ زندگی صرف ایک قہقہ نہیں۔ زندگی ایک خاموش آنسو بھی ہے۔ غم اور خوشی وہ دوپر ہیں جن کے سہارے پرندہ حیات دیر تک اڑ سکتا ہے اور دور تک جا سکتا ہے۔

زندگی کیا ہے؟ اس سوال کا کوئی بھی جواب غلط ہو سکتا ہے۔ دراصل زندگی اس قدر کشادہ ہے کہ اس میں سارے جواب سما جاتے ہیں۔ مگر وہ جواب میرے احساسات سے زیادہ قریب ہے۔ جو جواب اس شاعر نے رقم کیا تھا جو شاہ لطیف کے بعد میری مادری زباں کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ میں تمہارا تعارف شیخ ایاز سے کرانا چاہتا ہوں۔ تمہیں اس کی وہ نظم سنانا چاہتا ہوں جو اس نے بھرپور جوانی میں لکھی تھی۔ وہ نظم ہے:

"میری روح کی راگنی سن رہے ہو
شکستہ سی لے ہے
شکستہ سی باتیں
پرانی سی مۓ ہے
پرانے سے شیشے
جنہیں میں چرا لایا ہوں
ساقیان ازل سے
بصد رنج ناصح
بصد زعم زاہد
پلاتا رہا ہوں نئے مۓ کشوں کو
جو روح ابد میں تراشے گئے تھے
وہ اصنام لایا ہوں لیکن
کہیں وہ جبینیں نہیں ہیں
کہیں امتیاز پرتش نہیں ہے
حیات بشر ایک خواب پریشاں
جو صدہا نہنگوں سے پہلو بہ پہلو

چلی آ رہی ہے
حیات بشر نالہ نارسا ہے
حیات بشر نغمہ غم فزا ہے
حیات بشر آخر
میرے دوست کیا ہے؟"

زندگی ایک لاجواب سوال ہے میری بیٹی۔

غالب بہت بڑا شاعر تھا مگر زندگی صرف وہ دراز نہیں جس میں چند تصویر بتاں اور چند حسینوں کے خطوط ہوتے ہیں۔

فانی بھی کم درجے کا شاعر نہ تھا مگر مجھے اس کا یہ شعور بالکل بھی پسند نہیں ہے کہ:

"زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا"

میں اقبال کے عظمت سے انکار نہیں کرتا۔ مگر زندگی صرف کھوئے ہوؤں کی جستجو تو نہیں!!

زندگی زخمی پیروں کے ساتھ آگے بڑھنے کا نام ہے۔

وہ جوش اور ولولہ جو انقلابی شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ اپنے تمام تر ابہام کے ساتھ!

مگر دیکھو ایاز کی نظم میں جسم اور روح کا ایک ایسا رقص ہے جو انگریزی فلم Last TangoinParis کی یاد دلاتا ہے۔

زندگی ایک جستجو ہے۔ ایک بے قرار آرزو ہے۔ ایک رقص مستانہ اور ایک نعرہ دیوانہ ہے۔

تم سوچ سکتی ہو کہ عمر اور قید نے مجھے رومانوی تصورات میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ مگر فاطی میں آزاد جوانی میں بھی یہ سمجھتا تھا کہ زندگی ایک جہد مسلسل ہے۔

ہندو دیومالا میرے مزاج کے لیے کبھی پر کشش نہیں رہی مگر مجھے کرشن کی یہ بات بہت بھاتی ہے کہ "زندگی جنگ مسلسل ہے"

یہ بات سیاست سے بڑی ہے۔ یہ زندگی کی بات ہے۔ جنگ زندگی نہیں۔ زندگی کا زخم ہے۔ زخم صرف جسم کے نہیں ہوتے۔ ذہن اور دل کے زخم زیادہ تکلیف دیتے ہیں۔

میں اردو ادب کا اچھا طالب علم نہیں ہو۔ مگر مجھے غالب ہمیشہ سے پسند ہے۔ میں تمہارے لیے اس کا شعر گنگناتا ہوں:

"رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟"
آنسو دل کے زخموں کا لہو ہیں!!
فاطی! میرے قریب آؤ
اپنا موہوم سا پتلا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دو
اور محسوس کرو میرے غمگین لہو کی گردش!!
اپنے بوڑھے دادا کا غصہ جو غم سے مسلسل نبرد آزما ہے۔
میرے اور تمہارے قریب جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ بہت برا ہے۔
شام میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ وہ ملک جو تمہارے بچپن کی آغوش تھا۔
وہ ملک جو میرے بیٹے اور تمہارے والد کے انقلابی جن کا مورچہ تھا۔
وہ ملک صرف حافظ الاسد کا نہیں۔
وہ ملک اس شاعر کا بھی ہے
جس کا نام نزار قابانی ہے۔
وہ نزار قابانی جس نے لکھا تھا:
"جب ایک خوبصورت عورت مر جاتی ہے
دھرتی اپنے محور سے کھسک جاتی ہے
چاند ایک سو برس کے لیے سوگ کا اعلان کرتا ہے
اور شاعری بے روزگار ہو جاتی ہے"
نزار قابانی کی یہ نظم

مجھے دوبارہ بہت یاد آئی
ایک بار جب تیری پوپھی کا خون کیا گیا
اور دوسری مرتبہ جب تیری دادی
زندگی کے قید سے آزاد ہوئی!!
وقت لمحوں کی اداس جھیل ہے
ایک ایک پل کے قطروں سے
جنم لینے والی ایک اداس جھیل!!
تم کیسی ہو؟
تمہارے حالات کیسے ہیں؟
مجھے معلوم نہیں
مگر میں اندازہ لگا سکتا ہوں!

معصوم دلہن کو دفن کر دو

اس کے لیے ڈھول بجائے اور گیت گائے گئے۔
مگر اب چند سیکنڈس کی خاموشی درکار ہے!
سترہ برس کی اس دلہن کے لیے جس کو سہاگ رات!
محبت نہیں موت نصیب ہوئی!!

یہ سانحہ صبر سے برداشت کیا، اس جیکب آباد کی اداس رات نے، جس کے دن تیز دھوپ کی چتا پر چیختے رہتے ہیں!!

وہ رات اس راکھ جیسی تھی، جس میں چاہت کی کوئی چنگاری نہ ہو!
اور اس راکھ میں دفن ہو گئی وہ دلہن جس کا نام خانزادی تھا!

وہ خانزادی جو اندرون سندھ کی ان لاکھوں لڑکیوں میں سے ایک تھی جو شادی کی رات شرم سے نہیں بلکہ جہالت کے اس شر سے کانپتی ہیں جو کسی بھی پل ان پر بھوکے بھیڑیے کی طرح حملہ آور ہو سکتا ہے!

اس لیے وہ نوعمر لڑکیاں سسکیوں کے سروں پر گانا چاہتی ہیں وہ گیت جو نکاراگوا کے اس لوک گیت جیسا ہی ہے جس میں ایک پرانے گٹار کو بجانے والا بوڑھا موسیقار بتانا چاہتا ہے یہ بات کہ:

"میں نے اس لڑکی کو دیکھا
جو شیر کی پیٹھ پر بیٹھ کر

ہنستی گاتی جارہی تھی!
کچھ دیر بعد شیر واپس آیا
وہ لڑکی اس کی پیٹھ پر نہیں تھی
شیر کے ہونٹوں پر لڑکی کی مسکراہٹ تھی"

....

وہ سب لوگ جو وطن میں نہ ہونے کے باوجود بھی وطن میں ہیں۔ جو ہر صبح سوشل میڈیا کی ویب سائٹ اس طرح کھولتے ہیں جس طرح یہ وطن کی طرف کھلنے والی کھڑکی ہو۔ دو دن قبل جب انہوں نے ونڈو اوپن کی تب انہیں نظر آئی جیکب آباد سے تعلق رکھنے والی اس معصوم بچی کی لاش جو سفید ململ میں نہیں بلکہ سرخ جوڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ کسی عورت نے اپنے دوپٹے سے کو پھاڑ کر ایک پٹی اس کے سر اور ٹھوڑی پر باندھ دی تھی مگر اس پٹی کے علاوہ اس کا لباس اندرون سندھ کے دلہنوں جیسا تھا۔ اس کے سیاہ بال سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ اس کے بالوں سے جڑا ہوا تھا وہ لال پراندہ جس کے پھول سرخ اور ریشمی تھے۔ اس کے سرخ لباس پر سفید کڑھائی والی کشیدہ کاری کمال کی تھی۔ اس کا ریشمی دوپٹہ نارنجی رنگ کا تھا جسے دیکھ کر بہت ساری آنکھوں کو شعوری یا لاشعوری سندھ کا صوفی کلچر یاد آگیا ہوگا۔ وہ بچی جس نے ابھی مشکل سے بچپن کی دہلیز کراس کی تھی اور وہ جسمانی طور پر بڑی مگر ذہنی طور پر ابھی بہت معصوم اور چھوٹی سی تھی۔ اس عمر کی بچی کو دلہن کی شکل میں دیکھتے ہوئے بھی کچھ عجیب سا لگ رہا تھا مگر جب دلہن کے لباس میں اسے قتل کیا جائے تو پھر یہ بات برداشت کرنے کے لیے سخت دل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس بچی کی تصویر سوشل میڈیا پر بہت شئیر ہوئی ہے اور سندھ کے حکمران گھرانے کے چشم و چراغ نے اس سوشل میڈیا کی وجہ سے اس بچی کے قتل کا نوٹس لیا ہے اور حکومت سندھ سے کہا ہے کہ معصوم دلہن کے قاتل گرفتار کیے جائیں۔

....

یہ واقعہ وہاں پیش آیا جہاں اب تک وڈیرے جرگے کرتے ہیں اور اغوا ہو جانے

والی بچیاں برسوں گذر جانے کے بعد بھی بازیاب نہیں ہوپاتیں۔ یہ علاقہ جدید دور کے افکار کی بارش میں قدیم ثقافتی چھتری سے بچنے کی کوشش کرنے والا وہ علاقہ ہے جہاں حکمران خاندان اختیارات ان لوگوں کے حوالے کرتے ہیں جو چار اپریل کو تو اپنے کسانوں اور قبیلے کے غریب لوگوں کو بسوں میں بھر کر لاڑکانہ بھیج دیتے ہیں اور خود پراڈو گاڑیوں میں پہنچ کر جلسے گاہ میں رکھے ہوئے صف اول کے صوفوں پر براجمان ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور جب پارٹی قیادت رٹی ہوئی جذباتی تقریر کرتے ہوئے ''بھٹو ازم'' کا حوالہ دیتی ہے تب اندرون سندھ سرکاری سیاست کے اختیارات کے مالکان کیمروں کا رخ اپنی طرف ہوتے ہوئے دیکھ کر ''جے ئے بھٹو'' کا نعرہ بھی لگاتے ہیں اور جمہوریت کے طلاف ہونے والیے سازشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے اعلانات پر تالیاں بجانے والے ان مقامی رہنماؤں کو یہ حقیقت کوئی نہیں سمجھا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں یہ لاش خانزادی کی نہیں بلکہ اس جمہوریت کی ہے جو اقتداری سیاست کی ''کاروکاری'' والے کلچر کی پیدوار ہے۔ یہ صرف ایک معصوم انساں کی نہیں یہ ایک نظام کی لاش ہے۔ وہ نظام کو ہر رات ایک معصوم خان زادی کو کھا جاتا ہے۔

اور ایسا نہیں کہ ''کاروکاری'' کی اس وحشی کلچر کے خلاف آواز اٹھانے والے صرف وہ یہ لوگ ہیں جو این جی اوز سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہوں نے اپنا نام ''سول سوسائٹی'' رکھا ہے۔ اس قاتل کلچر کے خلاف تو شاہ لطیف سے لیکر شیخ ایاز تک سندھ کے ادیبوں اور شاعروں نے نسل در نسل جدوجہد کی ہے۔ شاہ لطیف نے ''سر سوہنی'' میں سندھ کی مظلوم عورت کی حق میں جو اشعار لکھے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں اور کون بھول سکتا ہے ایاز کے یہ الفاظ جن میں اس نے خان زادی جیسی ایک لڑکی کی معرفت پورے قبیلے، پوری قوم اور پوری انسانیت کے دل میں دھڑکتے ہوئے اس خوف کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''امی!

وہ مجھے ''کاری'' کرکے ماریں گے

وہ مجھے "کاری" کر کے ماریں گے !

امی!

ابھی تو میرا دولہا بن سنور کر نہیں آیا مگر

الو درختوں کی شاخوں پر شور مچا رہے ہیں!

امی!

یہ لوگ من کے کالے ہیں

یہ مجھے کاری کر کے ماریں گے !!"

اور خان زادی بھی اسی طرح قتل کی گئی۔

اس کو قتل کرنے والا کوئی اور نہیں اس کا دولہا تھا۔

اور اس قتل کو صرف ایک معصوم بچی کی شکل میں دیکھا گیا۔ حالانکہ یہ جمہوریت کا قتل تھا۔ مگر ہمارے نوعمر لیڈر معصوم لاش پر پارٹی پرچم کی وہ چادر بھی نہیں ڈالتے جس کو گلے میں لپیٹ کر تقریر کرنے کا کلچر عام ہو گیا ہے۔ تقریر سے پہلے نہ سہی تقریر کے بعد ہی سہی مگر کوئی لیڈر تو اپنے گلے میں لپٹی ہوئی پارٹی پرچم چادر جمہوریت جیسی خانزادی کی لاش پر ڈالے اور کارکنوں سے کہے کہ "معصوم دلہن کو دفن کر دو"

انتظار

عید تو گزر بھی گئی مگر وہ انتظار ابھی تک باقی ہے جس کے ڈیرے ان آنکھوں کے گلابی ڈوروں میں برسوں سے ہیں جنہوں نے پلک تک نہ جھپکائی اس احتیاط سے کہ کہیں نشانہ خطا نہ ہو جائے!!

جس طرح ایک گمنام شاعر نے لکھا ہے کہ:

"محبت اور نفرت کا
کوئی ملک نہیں ہوتا"

اسی طرح غلامی سے نفرت کرنے والی نگاہوں کا بھی کوئی مخصوص ملک نہیں ہوا کرتا۔ وہ آنکھیں ہر ملک میں سورج مکھی کے پھولوں کی طرح سورج سے نظریں ملاتی ہیں جو غلامی سے نفرت اور آزادی سے محبت کرتی ہیں۔

میں اس ملک اور اس قوم کی بات نہیں کر رہا جنہیں "گوشہ قفس میں آرام بہت ہے" میں ان بے چین قوموں کی بات کر رہا ہوں جو سرکش پرندوں کی طرح پنجرے کی سلاخوں سے لڑتے رہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی بات نہیں کر رہا جو نہیں جانتے کہ "غلامی کیا ہے؟" میں ان انسانوں کی بات کر رہا ہوں جو جانتے ہیں کہ "آزادی کیا ہے؟" وہ انسان عظیم ہیں جو جنگ مسلسل میں مصروف رہا کرتے ہیں۔ جو ہار اور جیت سے بلند ہو کر لڑتے ہیں۔ جن کے لیے جنگ ایک طرح کی عبادت ہے مگر ان کے لیے نہ تو ہار ایک جہنم ہوا کرتی ہے اور نہ جیت کوئی جنت!! جو جنت اور جہنم کے درمیاں بچھے

ہوئے میدان جنگ میں اس طرح لڑتے ہیں جس طرح قدیم پیڑ اور پربت طوفانوں سے لڑتے ہیں۔ وہ لوگ قابل محبت ہیں جو جنگ کو زندگی اور زندگی کو جنگ سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو جسموں کے زخموں کو روح کا زیور سمجھتے ہیں اور جیسے جیسے جنگ کا دورانیہ بڑھتا جاتا ہے ان کے شوق اور ولولے میں اضافہ آتا جاتا ہے۔ اور جیسے جیسے ان کا لہو بہتا ہے وہ پہلے سے زیادہ پختہ اور پر امید ہوتے جاتے ہیں۔

اگر امریکہ کی نظر میں دنیا اتنی پر امن نہیں جتنی لاطینی شاعر سسرو کے ان الفاظ میں ہے کہ:

"وہ لہو کی پیاسی تلواروں کے ساتھ آئے
اور انہوں نے ہر آواز کا گلہ کاٹ ڈالا
اور پھر بولے "آہ کس قدر سکون ہے۔۔۔"

اگر دنیا عالم مفتوح نہیں تو ہمارے دم سے نہیں بلکہ ان انسانوں کی وجہ سے ہے جو امریکہ کی طوفانی آنکھ میں چبھتے ہوئے تنکوں کی طرح ہیں۔ اور ان انسانوں کا ایک وطن نہیں۔ وہ کل ویتنام میں لڑے تھے اور آج مشرق وسطی میں بر سر پیکار ہیں۔

اور ایسا بھی نہیں ہے کہ انہیں لہو کی مہک بہت راس آگئی ہے۔ انہیں جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے۔ انہیں حسن اور عشق کے گیتوں سے نفرت ہے۔ مگر باغی ترانے گانے والے یہ سمجھتے ہیں کہ "عشق کا پرندہ غلام درخت کی شاخ پر آشیانہ نہیں بناتا" کیا وہ غلط سمجھتے ہیں؟ جب شام میں جنم لینے والے عربی ادب کے لبرل ترین شاعر نزار قابانی نے یہ لکھا تھا کہ:

"امریکا خدا نہیں ہے"

تب اسے معلوم تھا کہ یہ الفاظ ان کے لیے نہیں جنہوں نے "غلامی سے نکاح کر لیا ہے" یہ الفاظ تو ان کے لیے ہیں جو گوگول کے ناول "ٹارس بلبا" کی طرح دشمن کے خیمے سے محبوبہ کو بزور بازو اٹھاتے ہیں۔ جس طرح ایک پشتو ٹپہ ہے کہ:

"آزادی کی محبوبہ کہتی ہے
میں غلام یار کو بوسہ نہیں دوں گی"

اسی طرح اس دنیا میں جو شخص بھی امریکی سامراج سے برسرپیکار ہے وہ صرف قابل عزت ہی نہیں قابل محبت بھی ہے۔ کیوں کہ وہ اقتدار کے لیے نہیں بلکہ اس اختیار کے لیے لڑ رہا ہے کہ وہ اس عشق کا حق حاصل کرے جو صرف اور صرف آزاد فضاؤں میں ہی کیا جاتا ہے۔ مغلوب فضاؤں میں تو محبت کا دل مغموم ہو جایا کرتا ہے۔ اس لیے وہ دولت کے لیے نہیں بلکہ اس دل کے لیے لڑتے ہیں جس کی خوشی حاصل زندگی ہوا کرتی ہے۔ اسی لیے توروس کے نوبیل انعام یافتہ ادیب میخائل شولوخوف نے اپنی سوانح حیات کا عنوان رکھا تھا "دل کہنے پر" جو دل کے کہنے پر لڑتے ہیں وہ لوگ ہی بڑے ہوا کرتے ہیں۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں اس دنیا کا ایک مخصوص خاکہ ہوا کرتا ہے۔ وہ خاکہ جو اس دنیا سے مختلف ہوا کرتا ہے اور عمر خیام کی طرح اس دنیا کو اپنے آزاد دل جیسا بنانے کے لیے جو جاں سے گزر جاتے ہیں ان انسانوں کے نقش قدم تاریخ کے سفر میں بلند ہوتے ہوئے ستارے بن جایا کرتے ہیں۔ وہ ستارے جو صرف ہمارے رہنما نہیں بلکہ ہماری قسمت بھی ان کی مٹھی میں سما جاتی ہے۔

ہم اتنے برے مقدر کے مالک بھی نہیں جو مکمل طور پر غلامی کے قدموں میں گر جائے۔ کیوں کہ ہماری قسمت کے کچھ ستارے مسلسل لڑ رہے ہیں ظلم و ستم کی اس تاریک ترین رات سے جس سے مخاطب ہو کر مخدوم محی الدین نے لکھا تھا کہ:

"گزر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے"

وہ انتظار جو کل تھا وہ آج بھی ہے۔ اس لیے اس کالم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے کہ "عید تو گزر بھی گئی مگر وہ انتظار ابھی تک باقی ہے جس کے ڈیرے ان آنکھوں کے گلابی ڈوروں میں برسوں سے ہیں جنہوں نے پلک تک نہ جھپکائی اس احتیاط سے کہیں نشانہ خطا نہ ہو جائے!!"

اردو ادب کی شاید آخری رومانوی شاعرہ پروین شاکر نے لکھا تھا کہ:

"وہ آنکھیں کیسی آنکھیں ہیں
جنہیں تم چاہا کرتے ہو!!؟"

اگر پروین شاکر نے یہ سوال ہم سے کیا ہوتا تو ہم انہیں بتاتے کہ "وہ آنکھیں

ایسی نہیں جنہیں کسی ہندی شاعر نے "کاجل کٹیا" کہا تھا۔ وہ آنکھیں سیاہ راتوں میں سیاہ شیشوں والی ان پرل بلیک کلر والی گاڑیوں سے اترنے والیوں جیسی نہیں ہیں جن میں سبز اور نیلے رنگ کے کانٹیکٹ لینسز اٹکے ہوتے ہیں۔ وہ آنکھیں ایسی نہیں جنہیں دیکھ کر فیض نے لکھا تھا کہ:

"تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟"

ہاں! وہ ایسی آنکھیں نہیں جن آنکھوں کے لیے ابن انشا نے لکھا تھا کہ:

"فرض کرو یہ نین تمہارے سچ مچ کے میخانے ہوں"

ایک یونانی ناول نگار نے لکھا ہے کہ "دنیا کو بدل سکو یا نہیں مگر وہ آنکھیں مت بدلنا جو دنیا کی حقیقت کو دیکھتی ہیں" مگر ہم اپنی آنکھوں پر مخصوص مفادات کے چشمے چڑھا کر چلتے ہیں اور اس دنیا کو اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب ہم پر ضمیر کا دباؤ کچھ بڑھ جاتا ہے تو ہم اپنے آپ سے چیخ کر کہتے ہیں کہ "صرف میں ہی نہیں ساری دنیا ایسی ہے" ہم دنیا کی عام روش کو اپنے لیے ایک بہانہ بنا کر جیتے ہیں مگر زندگی صرف بیداری نہیں۔ زندگی وہ نیند بھی ہے جس میں دنیا کے عظیم لوگ خوابوں کی گلیوں سے آتے ہیں اور ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں ان کی باتیں سننا پڑتی ہیں اور ہمیں ان کی آنکھیں دیکھنا پڑتی ہیں جن میں ہمارے لیے تلوار سے تیکھے طعنے ہوتے ہیں۔ وہ آنکھیں ہمیں گھورتی ہیں اور کہتی ہیں کہ "کیا تم ہمارے خواب پورے نہیں کرو گے؟" وہ آنکھیں جن آنکھوں میں ایک ایسی دنیا کا منظر ہوتا ہے جو ظلم و ستم، بھوک اور افلاس، غلامی اور درندگی سے پاک وصاف ہوتی ہے۔ اس دنیا کا درشن دیکھ کر ہم بے بس ہو جاتے ہیں۔ جن آنکھوں میں ہم ایک عظیم دنیا کو دیکھتے ہیں وہ آنکھیں ایسی ہیں جنہوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ جو آنکھیں ظلم کے سامنے کبھی نہیں جھکیں۔ جن آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت اپنے وقت میں آمروں میں نہیں تھی۔ مگر حیرت ہے کہ جن انسانوں نے اپنی نظر کا وقار قائم رکھتے ہوئے سولیوں کو مسکرا کر قبول کیا۔ جن آنکھوں نے ہمیں بتایا کہ نظریہ فکر سے نہیں بلکہ نظر سے جنم لیتا ہے۔ وہ باغی انسان ہمیں ناراض نظروں سے

دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا تم ہماری نظر کا تسلسل نہیں بنو گے؟ ہم اپنی آنکھوں سے تو بچ بھی جائیں مگر ان آنکھوں سے کیسے بچیں جو آنکھیں صرف زبان سے ہی نہیں بلکہ زمان و مکان سے بھی آزاد ہیں۔ وہ آنکھیں سرحدوں میں قید نہیں ہیں۔ وہ آنکھیں جہاں بھی ہے وہاں ایک آشیانہ ہے اس آزادی کا جو "عقاب کی طرح اس وقت چیختی ہے جب اسے اپنا بھولا بسرا نشیمن نظر آجاتا ہے۔" وہ آزادی جس کے لیے کازانت زاکس نے یہ بھی لکھا تھا کہ "آزادی" یہ لفظ میں کاماز میں اس طرح لکھتا ہوں جس طرح کسی جنگلی بیل کو سینگوں سے پکڑ کر قابو کیا جاتا ہے۔ آزادی جس کے لیے کازانت زاکس نے یہ بھی لکھا تھا کہ "اے آزادی! میں تیرے لیے بڑی شاہراہوں کو چھوڑ آیا ہوں۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کے تیری طرف آنے والے راستے بہت تنگ اور بیحد پیچیدہ ہوا کرتے ہیں" وہ آزادی جس کے عشق کو بیان کرتے ہوئے ہیلن کے عاشق نے یہ بھی لکھا تھا کہ "آزادی وہ جلاد محبوب ہے جس کے ہاتھ اگر ایک بار چوموں گے تو پھر تمہیں موت سے ڈر نہیں لگے گا" آزادی کے دست بعیت فقیر!!

آزادی کے عاشق۔ آزادی کے تمنائی۔ امریکا سے سمجھوتہ کس طرح کر سکتے ہیں؟

اس لیے یہ دنیا تو رن بھومی ہے ان انسانوں کے لیے جو مسلسل لڑ رہے ہیں۔ وہ انسان جب نہیں لڑتے تب دکھی رہتے ہیں اور جب لڑتے ہیں تب انہیں سکھ ملتا ہے۔ کازانت زاکس کا دادا بھی ایک حریت پسند اور آزادی کا سپاہی تھا۔ کازانت زاکس نے لکھا ہے کہ "جب میں بڑا ہوا تب میں نے اپنی دادی سے پوچھا تھا کہ "میرے دادا کیا کرتے تھے" انہوں نے جواب دیا کہ "وہ لڑتے تھے" میں نے پوچھا کہ "جب جنگ نہیں ہوتی تھی تب وہ کیا کرتے تھے؟" تو انہوں نے ماضی کے جھرونکوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا کہ "تب وہ گھر کے آنگن میں بیٹھے رہتے اور تمباکو کا کش لگا کر گھر کے سامنے کھڑے بلند پہاڑ کو گھورتے رہتے اور جنگ کا انتظار کرتے اور جب اسے جنگ شروع ہونے کی اطلاع ملتی تب وہ اپنی بندوق اٹھا کر گھوڑے پر سوار ہو جاتے اور ہمیں الوداع کہے بغیر پہاڑوں کی طرف نکل جاتے"

ایسے لوگ اب بھی ہیں جو امریکہ کی عالمی وحشت اور دہشت کے خلاف پوری دنیا میں لڑ رہے ہیں۔ان کی جنگ برسوں سے جاری ہے۔اس جنگ کے دوراں ان کی عید بھی آتی ہے۔ مگر کیا وہ عید کی خوشیاں مناتے ہونگے؟ جب ان کا ملک غلام ہو۔ جب وہ بمباری میں اپنے دیس کے بچوں کو معذوری کی حالت میں دیکھتے ہونگے تب سوچتے ہونگے کہ ان کی عید تو تب ہوگی جب غاصب قوتیں ملیامیٹ ہو جائیں اور آزادی اپنا گلابی آنچل فتح کے پرچم کی طرح لہرائے۔اس طرح جب چھوٹے بڑے بچوں سے بھری اس دنیا کی عید آتی بھی ہے تب بھی وہ اپنی عید کا انتظار کرتے ہیں۔

یہ عید تو آئی اور گزر بھی گئی مگر ان انسانوں کی آنکھوں میں ابھی تک پہاڑوں کی چوٹی پر اپنے چاند ابھرنے کا انتظار بھرا ہوا ہے۔ مگر ایک طویل انتظار نے بھی ان کی آنکھوں میں تھکاوٹ اور بیزاری کے منحوس سایوں کو لہرانے کی اجازت نہیں دی۔

کاش! ہم کوئی عید ان انسانوں کے نام کریں جنہیں برسوں سے آزاد فضاؤں میں عید منانے کا انتظار ہے۔

کلچر ولچر

موہن جو دڑو: انجانی تاریخ اور پر اسرار تہذیب کا اداس پھول اس ندی کی شاخ پر کھلا اور مرجھایا جس ندی کے دونوں کناروں پر سندھ کے وہ مناظر موجود ہیں جنہیں کسی شہری مصور کی آنکھ نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ فطرت کی خوبصورت جھلک صرف شام کے ڈھلتے ہوئے اس سورج میں نہیں ہوتی جس کے نیچے بھینسیں تازہ گھاس کی خوشبو لیے اپنی ٹور سے دھول اڑاتی گھروں کی طرف لوٹتی ہیں۔

ہاں! بہت دلکش ہوتا ہے وہ منظر جب رنگین آنچل جیسے شفق کا عکس کسی جھیل کی سطح پر ہوا کے ہلکے جھونکوں سے ڈولتا ہے اور اس جھیل کے کنارے کھڑے نئے پرانے درختوں پر بیٹھے ہوئے سفید پرندے چھوٹی چھوٹی مچھلیوں پر آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور ان کے اوپر تیزی کے ساتھ اڑتا جاتا ہے جنگلی کوؤں کا وہ جھنڈ جو اپنے پروں کو لہراتا گویا یہ کہتا جاتا ہے کہ:

"بارشیں ہونگی رہ ہستی پہ تھم جائے گی دھول
اور دونوں طرف گہرے سرخ پھول
جب کھلیں گے
تب ملیں گے!!"

اور پھر سورج آہستہ آہستہ بجھ جاتا ہے۔ زندگی کی بیشتر آوازیں خاموشی کے ساتھ سو جاتی ہیں مگر جھینگر پھر بھی اک نئی محبت کے تذکرے جیسا گیت گاتا رہتا ہے۔

لیکن کیا حسن صرف جانوروں، پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں میں ہے؟ ایک دوسرے سے مایوس ہونے کے بعد مغرب نے انسانوں سے احتجاجی طور پر محبت کرنا بند کردی ہے مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انسان حسین نہیں ہے!! وہ انسان جو دریائے سندھ کے کنارے چلنا سیکھتا ہے۔ لڑکھڑاتا ہے۔ سنبھلتا ہے اور گر جاتا ہے مگر گر کر پھر چلنے لگتا ہے۔ وہ بچہ کس قدر معصوم اور دلکش ہوا کرتا ہے جس کا نام رکھنے کے لیے قدیم کتابیں نہیں کھولنا پڑیں اور نہ جوتش کے ماہرین سے کوئی مشورہ کیا گیا۔ بس گاؤں کی کسی بھی چیز کا نام اس بچے کا نام بن گیا جو عمر میں کچھ بڑا ہونے کے بعد درختوں میں چھپی ہوئی دنیا کا متلاشی تھا۔ جسے معلوم تھا کہ کس پیڑ میں طوطے کے بچے ہونگے اور کس تالاب میں مچھلی! وہ بچہ جو اپنی زندگی میں آنے والی دو سردیوں سے بڑی تکالیف جھیلتے ہوئے بچا اور جس کی قمیص میں بٹن نہ ہونے کی وجہ سے اس کے گلے میں سیاہ رنگ کا وہ دھاگہ سب کو نظر آتا ہے جو ماں کی دعا کے بعد اس کی واحد حفاظت ہے اور اس بچے کو نیشنل جیوگرافی والے بہت دور سے کسی دوربین کے لینس کے ذریعے دیکھتے رہیں تو انہیں معلوم ہو پائے گا کہ اس بچے کی ساری شرارتیں اور اور اس کی زندگی کا پورا انداز فطرت سے جڑا ہوا ہے۔

اور وہ تنہا نہیں ہے۔ اس سے عمر میں کچھ کم مگر اس کی ہم عمر نظر آتی ہوئی اک ''الہہ بچائی'' بھی ہے۔ جو سات بھائیوں کی تنہا بہن ہونے کی وجہ سے ''ست بھرائی'' کے نام سے بھی پکاری جاتی ہے۔ اس کی دنیا بھی دریائے سندھ کے کنارے اسی گاؤں میں ہے جہاں ''الہہ بچایو'' دھیرے دھیرے جوان ہو رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ زندگی بہت مشکل ہے مگر ''الہہ بچائی'' نے زندگی کی مشکلات ابھی نہیں دیکھیں۔ ابھی تو اس کی زندگی وہ مرغی ہے جس کے انڈوں سے سات چوزے نکلے دو مر گئے، ایک کو بلی کھا گئی۔ باقی چار کو بچانے کے لیے وہ سارا دن پریشان رہتی ہے اور ماں کی ڈانٹ برداشت کرتی ہے جو اسے کہتی ہے کہ ''اب تو بچی نہیں رہی'' مگر وہ بکری کے بچے کو محبت کے ساتھ اپنے پاس بٹھا کر اسے یہ بتاتی ہے کہ ''اماں! کو چھوڑو۔ مگر میں ابھی بہت چھوٹی ہوں۔۔۔۔!!''

وہ الہہ بچائی جانتی تو نہیں مگر اس کو اس بات احساس ضرور ہے کہ اس کے لیے کسی الہہ بچائے نے جنم لیا ہے جو دنیا کو دریافت کرتے ہوئے اپنے دماغ کو بڑھا رہا ہے اور اس کے پاس الہہ بچائی کو بتانے کے لیے بہت ساری باتیں جمع ہو رہی ہیں جو باتیں وہ الہہ بچائی کو موسم گرما کے دوراں آنگن میں کھلے آسمان تلے تاروں کے جھرمٹ کو دیکھتے ہوئے یا موسم سرما میں چولہے کے پاس بچھائے ہوئے بستر میں سمٹ کر سوتے اور دور گیدڑوں کے ٹھٹے سنتے ہوئے بتانی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ پلاننگ سے نہیں ہوتا۔ دیہاتوں میں زندگی توکل پر گذرتی ہے اور توکل پر گزرتے ہوئے اچھی لگتی ہے۔

وہ دونوں بچے جن میں ایک لڑکا ہے اور ایک لڑکی جو اپنی پسند کے جانوروں اور پرندوں سے کھیلتے ہوئے بڑے ہو رہے ہیں، ان کی زندگی بھی لاڑکانہ کے پاس بہتے ہوئے دریائے سندھ جیسی دھیمی ہے۔ ہاں ! کبھی کبھی حالات کی وجہ سے اس میں طغیانی بھی آجاتی ہے!! مگر کبھی کبھی!!! اکثر طور پر تو یہی ہوتا ہے کہ اجرکوں میں پیدا ہونے والے بچے اجرک کے ساتھ بڑے ہوتے ہیں اور اجرک تو رہ جاتی ہے مگر وہ خود نہیں رہتے۔ ان کی زندگی میں جو درد اور جو غم ہیں۔ ان کی زندگیوں میں جو تکالیف اور جو پریشانیاں ہیں۔ ان کی زندگیوں میں جو مسائل ہیں جنہیں وہ گھاس کی طرح کاٹتے بھی رہتے ہیں تب بھی وہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے اور مسلسل بڑھتے رہتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں جو بے یقینی اور جو عدم استحکام ہے۔ انہیں غربت اور پس ماندگی کی وجہ سے جن مصیبتوں کو جھیلنا پڑتا ہے اور جن مسائل سے مسلسل دوچار رہنا ہوتا ہے۔ انہیں جس مجبوری کے ساتھ جینا پڑتا ہے اور ان کے گرد وڈیرہ شاہی کے جو سارے پھیلائے ہوئے وہم اور خوف ہوتے ہیں وہ انہیں خاروں کی طرح چبھ کر اپنے ہونے کا احساس دلاتے رہتے ہیں مگر وہ کسی سے کچھ نہیں کہتے اور ہمیشہ صبر کرتے ہیں۔

کیا وہ شہر مدفون میں باسی ہیں؟ کیوں کہ ان کی زندگیوں میں سوائے موبائل فون کے اور کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جس طرح سندھ کے لیے کہا جاتا ہے کہ موہن جو دڑو سے نکلنے والا پہیہ آج بھی اسی رفتار سے چل رہا ہے اسی طرح دریائے سندھ کے کنارے بسنے والا سندھ صدیاں گذرنے کے بعد بھی نہیں بدلا۔ ویسے ہی جھونپڑیاں،

ویسی ہی تنکوں سے بنی ہوئی دیواریں اور ان کے ساتھ لگے ہوئے ببول کی لکڑی کے ٹیڑھے میڑھے دروازے اور ایسی چھت جس سے بارش بند ہونے کے بعد بھی ٹپکتی رہتی ہے اور ان کی ان رلیوں کو بھگوتی رہتی ہیں جن کو شہری بابو "ہماراسندھی کلچر" کہتے ہیں۔ اگر وہ کلچر انہیں پسند ہے تو وہ ہمیشہ کے لیے اپناتے کیوں نہیں؟ اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے بھیجنے کے بجائے مویشیوں کو چرانے کے لیے کھیتوں میں کیوں نہیں بھیجتے اور ان کے ہاتھوں میں نئے ماڈلز کی اسپورٹ گاڑیوں کی چابیاں دینے کے بجائے وہ انہیں اونٹوں کی باگیں کیوں نہیں تھماتے اور اپنی بچیوں کو آزادی کے ساتھ جینے کی اجازت دینے کے بجائے وہ ان کی کمسنی میں شادیاں کیوں نہیں کرادیتے اور انہیں کم خوراک پر جینے والے حالات میں کیوں نہیں رکھتے کہ وہ چوبیس برس کی جوانی میں بھی چار پانچ بچوں کے ساتھ چالیس پچاس برس کی بڑھیائیں نظر آئیں!!؟

کیا کلچر غربت کی غلامی میں انتہائی اذیت سے جینے کا نام ہے؟ اگر نہیں تو پھر وہ تصویر پانچ لاکھ روپیوں میں کیوں بک جاتی ہے جس میں ایک دو گھڑے سر پر ایک گھڑا کمر پر رکھ کر دور سے پانی بھر کر گھر کی طرف آتی دکھائی دیتی ہے!!

کیا کلچر مجبوریوں کی زنجیروں میں جکڑ کر دور دراز سفر کرنے کا نام ہے؟ اگر انہیں تو پھر اس عورت کے خاندان کو خوشحال زندگی کا تصور بھی نہیں جو بیل گاڑی کے نہ ہونے کی وجہ سے اپنے رشتہ داروں کے پاس پیدل آتا ہے اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پہنچنے میں اُسے پورادن لگ جاتا ہے!!

کیا یہ کلچر ہے؟ کہ ایک ماں لکڑیاں کاٹنے کے لیے خود کلہاڑی لیکر کانٹوں والے درخت پر چڑھ جائے!!

ہاں یہی کلچر ہے۔ غلام قوموں اور پسے ہوئے طبقات کا افسوسناک کلچر ہوا کرتا ہے اس کلچر کو دیکھ کر زندگی کی نئی امنگ کے ساتھ ان معذوریوں اور مجبوریوں کی مزاحمت کرنے کا تصور تو بہت خوبصورت ہوا کرتا ہے مگر خود عیاشیوں میں رہتے ہوئے عام انسانوں کی عذابوں سے بھری زندگی کو کلچر کا نام دیکر اس میں موجود ساری مصیبتوں کو جائز قرار دینے والی سیاسی سازش ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے اور ہمیشہ لوگوں کو

ذہنی طور پر چھوٹا رکھ کر انہیں موسیقی کی تیز دھنوں پر نچانے والے حربے استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔

ہمیں ہوش کب آئے گا؟ ہم آخر کب سمجھیں گے کہ کلچر پس ماندگی اور مجبوریوں پر فخر کرنا نہیں بلکہ ثقافت تو ایک سفر ہے جو زندگی کو ہر رخ میں مسلسل آگے بڑھاتا ہے۔ مگر جس طرح دریائے سندھ کو چھوٹے چھوٹے ڈیم بنا کر اور اس کے فطری راستے روکنے سے اس کی رفتار اور منزل کو تباہی سے دوچار کیا گیا ہے ویسے ہی دریائے سندھ کے کناروں پر بسنے والے انسانوں کی زندگیاں رک سی گئی ہیں اور ان کی رکی ہوئی زندگیوں کو پس ماندہ اور مجبور حالات پر فخر کرنے کی ترغیب دینے والا عمل اگر غربت اور غلامی مخالف سیاست نہیں تو اور کیا ہے؟

ہر کلچر ایک درخت کی طرح ہوا کرتا ہے۔ وہ درخت جس کی جڑیں ماضی کی مٹی میں مضبوطی کے ساتھ موجود ہوا کرتی ہیں مگر اس کا حال ایک طاقتور تنے کی طرح ان شاخوں کو ہواؤں میں جھولتے رہنے کا حق دیتا ہے جس پر مستقبل کے خوابوں کے پھول کھلتے ہیں۔ سندھ کا کلچر صرف ماضی کا مزار نہیں بلکہ زمانہ حال میں وہ محنت اور مشقت بھی ہے جو ایک مزدور والد اپنے بیٹے کو پڑھانے کے لیے کرتا ہے۔ سندھ کا کلچر اجرک کا لباس اوڑھ کر ریمپ پر ادا کے ساتھ چلنے والی ماڈل کا انداز نہیں بلکہ سندھ کا کلچر وہ محنت کش ماں ہے جو اپنی اولاد کے لیے سارا دن کام کرتی ہے اور نیند میں بھی اپنی اولاد کے لیے ایک خواب بنتی ہے۔ مگر کیا کیا جائے؟ کلچر جیسے الفاظ پر ان طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کا قبضہ ہو گیا ہے جو گدھ کی طرح ماضی کی لاش پر اترتے ہیں اور اس کی بوٹیاں نوچ کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ اس لیے کلچر کو بت بنا کر اس کو پوجنے کی کوشش کرنے کے بجائے اس کی وہ مکمل اور متحرک صورت دیکھنے کی ضرورت ہے جس کے سارے روپ ہر پل اور گھڑی رقصاں ہیں وہ مناظر جن کی ایک جھلک کیمرے کی آنکھ میں بند کرنے کے لیے پروفیشنل فوٹو گرافرز اس دور میں بھٹکتے تھے جس دور میں بدامنی کا بھوت سندھ کے آسمان پر منڈلاتے ہوئے نظر نہیں آتا تھا۔ مگر وہ ماضی قریب اور ماضی بعید والی دونوں زندگیاں اس مستقبل کا پتہ پوچھ رہیں

ہیں جو دہشتگردی کے دھوئیں میں گھرتا جارہاہے اور اگر دہشتگردی اسی طرح بڑھتی رہی تو اس کے بارودی دھوئیں میں وہ سندھ شاید سانس بھی نے لے پائے کو آج بھی کل کی طرح ''کلچر ولچر'' کی فکر کرنے کے بجائے ''توکل'' کی چڑھائی چڑھتی رہتی ہے مگر اس پہاڑی راستے پر منزل آنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ جب آپ جشن منانے کے سے فارغ ہوجائیں تب اس لالہ صحرائی جیسی سرزمین کو اس منزل کا پتہ بھی بتائیں جس کے لیے یہ مسلسل بھٹکتی رہی ہے اور اب تو شاید یہ بھول بھی گئی ہے کہ کس سفر کے لیے کب نکلی تھی اور اس نے کہاں کا رخ کیا تھا؟؟

کھڑی نیم کے نیچے

مائی بھاگی صحرا کی صدا تھی۔ اس غریب فنکارہ کو تو تھر کی سوکھی سرزمین میں دفن ہوئے ستائیس برس بیت چکے ہیں مگر اس کی امر آواز آج بھی ریگستان کے بکھرتے تن پر بگولوں کی طرح بجتی رہتی ہے۔ اور سب کو بتاتی رہتی ہے کہ ''میں کڑوی نیم کی میٹھی چھاؤں میں تمہاری منتظر ہوں''

وہ سادگی۔ وہ سچائی۔ وہ معصومیت۔ صدیوں سے منتظر ہے اس صحرائے تھر میں جس کے اپنے گیت ہیں۔ اپنے رقص ہیں۔ اپنا رہن سہن ہے۔ اپنے دکھ اور اپنے سکھ ہیں۔ جس کی اپنی روایات ہیں۔ سندھ کے اس صحرائی کلچر پر ہم کوئی ڈاکیومنٹری تو بنا سکتے ہیں۔ ہم مارواڑی لوک گیتوں کی دھنوں پر فلمی گانے بنا کر دولت تو کما سکتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے شوخ رنگوں والے لباسوں کو پینٹ تو کر سکتے ہیں مگر ہم سادہ مزاج انسانوں کے اندر میں چھپے صدیوں کے درد کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ ہم تو یہ نہیں سوچتے کہ پہاڑوں اور صحراؤں میں رہنے والے لوگ تیز رنگوں والے کپڑے اس لیے پہنتے ہیں کہ وہ پانی اور پیسے کی کمی کے باعث ہر روز نہا دھو کر نئے کپڑے نہیں پہن سکتے۔ اس لیے صحرا اور پہاڑ پردہ ہوا کرتے ہیں ان انسانوں کے لیے جو اپنی تنگ دستی اور غربت کو چھپا کر جیتے ہیں۔

جب بادل تھر پر گھنگھور گھٹا بن کر برستے ہیں تو آرٹسٹک مزاج رکھنے والے امیر لوگ بڑی گاڑیوں میں بیٹھ کر صحرائے تھر کا رخ کرتے ہیں۔ وہ اپنی ڈجیٹل کیمرا سے

مسلسل تصاویر کھینچتے جاتے ہیں اور مٹھی سے لیکر نگرپارکر تک بھیگی ہوئی ریت والے راستے پر نظر آنے والے مناظر کیمرے میں محفوظ کرتے واپس لوٹتے ہیں تو انہیں فیس بک" پر اپلوڈ کر کے بے تحاشا "لائیکس" حاصل کرتے ہیں۔ انہیں ہاتھی کے دانت سے بنی ہوئی چوڑیاں پہن کر اجنبی مسافروں کو دیکھ کر شرمانے والی سانولی عورتیں فلمی اداکاراؤں کی طرح نظر آتی ہیں۔ وہ بچے جو لوکل سیاحوں کی پھینکی ہوئی منرل واٹر کی بوتلوں کو گیند بنا کر کھیلتے ہیں ان کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوا کر غربت اور پس ماندگی کے ساتھ اظہار یکجہتی والا ان کا انداز بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جب وہ سیاح ایک رات مچھروں سے محفوظ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہر کر دوسرے دن چلے جاتے ہیں تو جتنی دیر میں ہوا ریت پر ان کی گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات ختم کرتی ہے، اس سے پہلے ان لوگوں کے ذہنوں سے اس صحرا میں بسنے والے انسانوں کی یاد مٹ جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ بھولے لوگ پہلے کسی مسافر کو دیکھا کرتے تھے تو سوچا کرتے تھے کہ وہ راستہ بھٹک گیا ہے مگر اب انہیں لگتا ہے کہ وہ سیاہ چشمے میں امیر آدمی کسی مقصد سے اس طرف آیا ہوگا۔ کیوں کہ تھر میں کوئی بھی بغیر مقصد کے نہیں جاتا۔ تھر کے لوگ پہلے بہت سادہ ہوا کرتے تھے مگر وہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ شہری بو بھلے ان کے ساتھ محبت بھری زبان سے بات کریں مگر ان کی محبت مفاد کے بغیر نہیں ہوتی۔

اس وقت میڈیا کے فوکس میں آئے ہوئے ہیں صحرائے تھر کے وہ لوگ جو فطرت کے حوالے سے اپنے سارے فرائض ادا کرتے ہیں مگر انہوں نے اپنے حقوق کے لیے کبھی آواز نہیں اٹھائی۔ جب وہ قلت آب کی وجہ سے پانی کی بوند بوند کو ترستے ہیں تب بھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے۔ ان کی نظر تو ہمیشہ آسمان پر ٹکی ہوتی ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ جب بارش ہوتی تو تب ریت پر رنگینیاں بکھر جاتی ہیں۔ مگر جب بادل ان سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور سوکھے کا موسم میں کوئی سبز پتہ بھی دکھائی نہیں دیتا تو وہ چپ چاپ اپنے بچوں اور مویشیوں کو لیکر پانی کے قریب ڈیرے ڈالتے ہیں۔ مگر انہیں ابھی شہروں کی دولت اور وہاں کی پر کشش زندگی نے اپنا تھر چھوڑنے پر مجبور نہیں

کیا۔ وہ جہاں بھی ہوتے ہیں۔ جس حال میں بھی رہتے ہیں۔ جب انہیں تھر کی طرف چمکتی ہوئی بجلیاں نظر آتی ہیں تو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور چل پڑتے ہیں اس صحرا کی طرف جہاں ریت کے ہر ذرے سے انہیں محبت ہوا کرتی ہے۔ ان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے اس سوال کا جواب کہ تھر میں ان کے لیے کیا ہے؟ جب کوئی ان سے کہتا ہے کہ شہروں میں اچھی تعلیم ہے۔ ملازمتوں کے مواقع ہیں۔ اچھا کھانا اور بہت سا پانی ہے۔ پھر تم صحرا میں کیوں رہتے ہو؟ تب وہ سوال پوچھنے والے کے چہرے میں حیرت سے گھور کر کہتے ہیں کہ "وہ ہمارا دیس ہے" اپنے دیس سے ایسی محبت کے باعث ماروی کا کردار حب الوطنی کی علامت بن گیا ہے۔

ماروی تھر کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ جس کو عمر نامی راجہ نے اغوا کیا اور اسے اپنے محل میں لے آیا اور اسے کہا کہ "میں تم سے زبردستی بھی کر سکتا ہوں مگر میں تمہارا دل جیتنا چاہتا ہوں اور تمہیں اپنی رانی بنا کر رکھوں گا۔ تمہارے گاؤں میں تو پانی کی بوند کے لیے لوگ ترستے ہیں اور یہاں میرے محل میں آبشار بہہ رہے ہیں۔ میں تمہیں دنیا کا ہر سکھ دوں گا۔ مگر تم دل سے میری ہو جاؤ" مگر ماروی نے اسے جواب دیا کہ تم میرے جسم کو تو حاصل کر سکتے ہو مگر میری روح اپنے گاؤں ملیر میں ہے۔ میں تیرے ریشمی لباس اور تیرے سونے کے گہنے نہیں پہنوں گی۔ مجھے اپنے تن پر پڑا ہو یہ سوت کا پیراہن بہت پیارا ہے۔ کیوں کہ اس میں میرے دیس کی مہک ہے۔ مجھے اپنے کانوں اور کلائیوں میں پڑے ہوئے یہ کالے دھاگے پسند ہیں۔ میں تمہارے عمدہ کھانے نہیں کھا سکتی۔ کیوں کہ میرے گھر والے میرے اپنے پیارے گھاس کی پتیاں چبا کر کھاتے ہیں۔ مجھے اس سونے کے پنجرے میں قید ہو کر رہنا قبول نہیں۔ میں صحرا کی پنچھی ہوں۔ مجھے جانے دو۔" اور کہتے ہیں کہ آخر راجہ عمر مجبور ہو گیا اور اس نے ماروی کے آگے ہار مان لی۔ ماروی کے اس کردار سے متاثر ہو کر شاہ عبدالطیف نے اس پر سینکڑوں اشعار لکھے اور آج بھی سندھ میں اگر کسی عورت کو عزت دی جاتی ہے تو اسے "ماروی" کہا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تھر کا مجموعی کردار ماروی جیسا ہے۔ تھر سراپا ماروی ہے۔ اگر تھر ماروی نہ ہوتا تو یہ صحرا کب کا خالی ہو چکا ہوتا۔ کیوں کہ

تھر کے 99 فیصد آبادی کے پاس دولت اور جائداد تو کیا رہنے کے لیے پکے مکان تک نہیں ہیں۔ وہ گھاس پھونس سے بنی ہوئی گول کٹیاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ پانی کے لیے بہت دور جاتے ہیں۔ وہاں پانی بھرنا بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ تھر کے کنویں بہت گہرے ہوتے ہیں اور ان سے پانی بھرنے کے لیے تھر کی عورتوں کو بڑی جفاکشی کرنا پڑتی ہے مگر وہ پھر بھی ماروی کے مانند اپنے دیس کو چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ جب ان کے بچے بیمار ہوتے ہیں تو عمر کوٹ، میر پور خاص، بدین اور حیدرآباد میں آتی ہیں۔ مگر واپس جانے کے لیے! اس لیے یہ نہ سمجھا جائے کہ آج اگر میڈیا پر ان کے بارے میں احساسات سے بھرے ہوئے پروگرام نشر ہو رہے ہیں۔ اگر آج سیاسی جماعتیں اہلیان تھر کو امداد دینے کے لیے ایک دوسرے سے بازی لینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ آج اگر امیر لوگ عطیات کی بارش کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں اور سپریم کورٹ نے تھر میں مناسب علاج نہ ملنے کی وجہ سے مرنے والے بچوں کے حوالے سے از خود نوٹس لیا ہے اور پاکستانی فوج کے دستے ادویات اور کھانے پینے کی اشیاء لیکر تھر کے طرف چل پڑے ہیں تو تھر والے سندھ کے شہروں میں نقل مکانی کریں گے! کبھی نہیں۔ تھر وہ واحد علاقہ ہے جہاں کی سرزمین سخت نہیں مگر پھر بھی اہلیان صحرا کے دل کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اس سرزمین سے جس کے ساتھ ان کی غیر مشروط محبت ہے۔

مگر ہماری حکومتوں کو آج تک ان لوگوں کا کوئی احساس نہیں ہوا جن لوگوں نے کبھی ریاست کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا۔ آج اگر کسی میڈیا پر تھر کے قحط اور بیماریوں کے حوالے سے اسٹوریز آ رہی ہیں تو اہلیان تھر اس مہربانی پر خوش بھی ہیں اور حیران بھی۔ کیوں کہ یہ مسائل تو تھر کے لوگوں کے لیے نئے نہیں ہیں۔ ان کے بچے گرمیوں میں ڈائریا اور سردی میں نمونیا کی وجہ سے مرتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ سردیوں میں انہیں اپنا ڈھاپنے کے لیے گرم کپڑے نہیں ہوتے اور گرمیوں میں ان کے پاس پانی کی قلت ہو جاتی ہے۔ مگر ان تکالیف کو اپنا مقدر سمجھنے والے یہ لوگ کبھی شکوہ نہیں کرتے۔ انہوں نے کبھی شکایت تک نہیں کی۔ وہ تو مانگتے ہوئے بھی شرماتے ہیں۔

اس لیے خاموش رہتے ہیں۔ مگر نہ معلوم اس بار میڈیا کا دھیان ان کی طرف کیوں ہوا؟ کیا میڈیا کے جس گروپ نے اہلیان تھر کا اشو اٹھایا اسے سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت کو ذرا جھٹکا دینا تھا؟ یا میڈیا کو مجبور کیا ان این جی اوز نے جنہوں نے گذشتہ مون سون میں دعائیں مانگیں کہ اس بار تھر میں بارش نہ ہو تا کہ ان پر ڈالروں کی بارش ہو جائے! یا اس کی کوئی اور وجہ ہے؟

یہ بھی تو ممکن ہے کہ میڈیا تھر کی طرف اس لیے متوجہ ہوئی ہو کہ ہواؤں میں برسوں سے اس مائی بھاگی کا گیت گونج رہا ہے جو سر پر دوپٹہ رکھ کر اور آنکھیں جھکا کر گاتی تھی کہ ”کھڑی نیم کی نیچے ہوں تا ہیکلی“ یعنی ”میں کڑوی نیم کی میٹھی چھاؤں میں تمہاری منتظر ہوں“ ہو سکتا ہے کہ ہوا کے کسی جھونکے نے میڈیا کی سماعتوں سے اس گیت کو ٹکرایا ہو اور میڈیا نے صحرائے تھر کی طرف اپنی مہاڑیوں موڑلی ہو جس طرح بیوفائی کرنے والا مسافر اچانک احساس جرم میں جکڑ جاتا ہے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرف چل پڑتا ہے جہاں ایک معصوم اور مظلوم محبت منتظر ہوتی ہے۔

تھر ہمیشہ سے اداس رہتا آیا ہے۔ مگر آج تھر اپنی ساری اداسی کے ساتھ مسکرا رہا ہے۔ کیوں کہ میڈیا نے جس طرح تھر کی تاریخی مظلومیت پیش کر رہی ہے۔ اس سے اہلیان تھر کو محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اس ملک میں اجنبی نہیں ہیں۔ ان کے لوگوں کے دلوں میں اپنائیت ہے۔ اس اپنائیت کا احساس بھی بہت بڑی بات ہوا کرتا ہے۔ تھر کے لیے میڈیا نے جس محبت کے جذبے کو جگایا ہے اس کے لیے میڈیا کی تعریف کرنا ہمارا فرض ہے مگر میڈیا کے بین الاقوامی بابو لوگوں کو صرف یہ دھیان رہے کہ تھر اپنی تمام تر غربت اور پس ماندگی کے ساتھ ایک غیور علاقہ ہے۔ اس لیے اہلیان تھر کے لیے اگر پانی کی دستیابی ممکن بنائی جائے تو یہ ایک بہت بڑی بات ہوگی۔ مگر تھر کے غریب لوگوں کو امداد کا عادی بنانے والا خواہ اچھا بھی نظر آئے مگر وہ حقیقت میں اتنا برا ہے جتنی بری بھوک اور پیاس بھی نہیں ہوتی۔

مقتل میں محبت

ایک تھری لوک گیت کے بول ہیں:

''سندھڑی ری مارگی اڈتی جائے کھیہ''

یعنی: سندھ کی طرف جانے والے راستے پہ دھول اڑ رہی ہے!

ویسے تو یہ گیت جدائی کا ہے۔ کیوں کہ جب بھی تھر میں قحط پڑتا ہے۔ تب محبت کی شہہ رگ پہ کڑا وقت پڑتا ہے۔ سوکھے کا موسم جدائی کا موسم ہوا کرتا ہے۔ جب بادل نہیں برستے۔ تب تھر کے لوگ نقل مکانی کرتے ہیں۔ وہ رخ کرتے ہیں اس دھرتی کا جہاں دریائے سندھ بہتا ہے۔ اس منظر کو منظوم الفاظ میں قید کرنے والے ایک تھری شاعر نے محبوب کے جدا ہونے والے پل کو الفاظ کا پیراہن پہناتے ہوئے گنگنایا ہے کہ ''سندھ کی طرف جانے والے راستے پہ دھول اڑ رہی ہے!''

مگر حقیقت یہ ہی ہے کہ سندھ وہاں نہیں جہاں سڑکیں ہیں۔ جہاں واٹر سسٹم ہے۔ جہاں ہاتھ کی جنبش سے ٹونٹی سے سفید پانی کی دھار گرتی ہے۔ جہاں گیس کے چولہے جلتے ہیں۔ جہاں موبائل فون پر کی گئی فرمائش پر چکن تکے اور ملائی بوٹی آتی ہے۔ جہاں رات دیر تک شاپنگ ہوتی ہے۔ جہاں کمپیوٹر پر ''فیس بک'' اپنوں کو خوشیوں سے بھری ہوئی تصاویر دکھاتا اور ''لائک'' کرواتا ہے۔ جہاں خواتین موبائل فون پر پیکیج کروا کر گھنٹوں تک ساس اور نندوں کی برائیاں کرتی ہیں۔ جہاں ان پڑھ لڑکیوں کو بھی ''ایس ایم ایس'' پر jani لفظ لکھنا آتا ہے۔ جہاں سالگرہ کے کیک کاٹے

جاتے ہیں اور شادیوں پر ڈانڈیا رقص ہوتے ہیں۔ جہاں انڈین ڈراموں کی نقالی کرتے ہوئے "گود بھرائی" کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ جہاں کمسن لڑکیاں بھی اپنے آپ کو کترینہ کیف سے زیادہ خوبصورت سمجھتی ہیں اور سلمان خان کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ جہاں زندگی ایک کیف اور مستی کے مزے لوٹنے کا نام ہوا کرتی ہے۔ سندھ کے موجوہ جغرافیہ میں ہوتے ہوئے بھی وہ علاقے حقیقی سندھ نہیں ہیں۔ جس طرح چیک ادیب ملان کنڈیرا نے لکھا تھا کہ ""Life is Somewhere Else" یعنی: زندگی کہیں اور ہے! اسی طرح سندھ میں ہوتے ہوئے بھی "سندھ کہیں اور ہے" اور وہ سندھ وہیں ہے جس طرف جانے والے راستوں پر دھول اڑا کرتی ہے۔ جب کوئی گاڑی روڈ سے اترتی ہے اور دھول اڑتی ہے تب سندھ کی حقیقی سرحد شروع ہوتی ہے۔

ہاں! سندھ وہاں ہے جہاں لوگ پکے تو کیا کچے مکانوں میں بھی نہیں رہتے۔ جہاں گھاس پھونس کی بنی ہوئی دیواروں کے اس پار بستی ہیں وہ عورتیں جو سارا دن کام کرتی ہیں اور البرٹ کامو کے پیر امیتھوس کی مانند ان کا کام ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جنگلی پھولوں جیسی وہ عورتیں پرندوں کے ساتھ بیدار ہوتی ہیں۔ مگر کانٹوں والی جھاڑیوں کے پنجرے میں قید اڑ جانے کا تصور نہیں کر سکتیں۔ ان کے لیے آزادی کی امید صرف وہ شادی ہوا کرتی ہے جو کمسنی میں ان سے بغیر پوچھے ان کو بغیر کوئی اطلاع دیے طے کی جاتی ہے اور جب ان کے گھر کے قریب ڈھول بجتے ہیں تو ان سے کہیں زیادہ ان کے دل دھڑکتے ہیں۔ اور وہ بچوں کی کہانیوں میں قید شہزادیوں کی طرح سوچتی ہیں کہ کوئی نیک دل اور بہت پیار کرنے والا شہزادہ آئے گا اور انہیں اس قید و بند سے چھڑا کر لے جائے گا۔ ان لڑکیوں کے تصورات یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی Fantasies ہندی فلموں، انگریزی فیس بک اور آزاد ذہن سے لکھے جانے والے عالمی ادب سے نہیں بلکہ ان لوک کہانیوں سے بنتی ہیں جن میں ایک نوجوان سفید گھوڑے پر آتا ہے اور ہر رکاوٹ کو عبور کرتے ہوئے انہیں اپنی بانہوں میں اٹھا کر لے جاتا ہے۔

وہاں! جہاں زندگی ہے۔ جہاں کنول کے پھول ہیں۔ جہاں تتلیوں کا مسکن ہے۔ جہاں سرسوں کے کھیتوں میں بھنورے اڑتے ہیں۔ جہاں خوشی ہے۔ خوبصورتی ہے۔

جہاں شام کے شفق کا سہارا لیکر ایک پردیسی پرندے جیسا ملاح کا گیت اپنی لہروں جیسی صدائیں لیکر آتا ہے اور ان کے آنچل سے اٹکھیلیاں کرتا ہے۔ مہندی کی مہک اور جنگلی کیڑوں کی چہک سے وجود پانے والا وہ ماحول کبھی کسی ناول کسی پینٹنگ میں نمودار نہیں ہوا۔ مگر وہ واہمہ حقیقت ہے۔ وہ لڑکیاں جو ایک خوبصورت وہم سے محبت کرتی ہیں اور خطرناک حقیقت سے ڈرتی ہیں۔ ان کی آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا کراچی کا ساحل سمندر! مگر جب جنوب سے ہوا چلتی ہے اور کپاس کے کھیت سبز سمندر کی طرح جھومتے اور جھولتے ہیں۔ تب وہ تمنا کرتی ہیں ایک ایسی محبت کی جس کے لیے اگر جیا نہیں جاسکتا تو اس کی آغوش میں مرا جائے!

وہ عشق کے خودکش راستے پر چلنے والی لڑکیاں ٹوٹے ہوئے سندھ کی بکھری ہوئی کرچیاں ہیں۔ وہ سندھ ہیں۔ انجان الفت میں جان دینے والیں۔ جو یہ بھی نہیں جانتیں کہ محبت کیا ہوتی ہے؟

"بلھیا کی جاناں میں کون؟"

وہ تو خود سے بھی بے خبر ہوتی ہیں۔ ان کے مقدس دلوں میں عیاشی کا تصور تک نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف پرندے کے آشیانے جیسی آغوش کی متمنی ہوتی ہیں۔ اور ان کو یہ اپنی تمنا زندگی سے بہت دور لے جاتی ہے۔

مرزا غالب کو یہ معلوم نہ تھا کہ تمنا کا دوسرا قدم کہاں ہوتا ہے؟ مگر سندھ کی ان معصوم بیٹیوں کو معلوم ہے کہ وہ موت کی سرحد میں قدم رکھ رہی ہیں۔ مگر وہ رکھتی ہیں وہ اس سرزمین پر اپنا قدم جہاں گھاس نہیں اگتی۔ وہ مقتل محبت کی معصوم مجاہد ہیں۔

جب بھی میں افریقہ کے خانہ جنگی میں جکڑے ہوئے چھوٹے ممالک کے معصوم جنگ جوؤں کی تصاویر دیکھتا ہوں۔ آٹومیٹک گن کے ساتھ، مسکراتے ہوئے تب مجھ سندھ کی کاری کی ہوئیں بچیاں بہت یاد آتی ہیں۔

عشق میر تقی میر کے لیے بھلے ایک "بھاری پتھر" ہو مگر سندھ کی ان ذہنی کمسن بچیوں کے لیے ایک "ٹوائے بم" ہے۔ جو اپنے "سیفٹی پن" جیسے راز افشاں ہونے سے

پھٹ جاتا ہے اور میڈیا میں ان معصوم بچیوں کی ''نا قابل شناخت'' تصاویر شایع ہوتی ہیں۔

فیض احمد فیض کہہ سکتا تھا کہ:

''گنو سب حسرتیں جو خون ہوئیں ہیں دل کے مقتل میں
میرے قاتل حساب خوں بہا ایسا نہیں ہوتا''

مگر شکستہ صراحیوں جیسی یہ لڑکیاں کہہ بھی نہیں سکتیں کہ ''تحقیق! ہمیں اس جرم کی سزا دی گئی جو ہم نے کیا بھی نہیں تھا''

سو! ہم بات کر رہے تھے اس سندھ کی جس کے راستوں پر دھول اڑتی ہے۔ اس سندھ کی دو بچیوں کو ایک ''غیر قانونی عدالت'' نے ''کاری'' قرار دیکر سزائے موت دی ہے اور آرٹ سے محبت کرنے والے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے اس واقعے کا ازخود نوٹس لیا ہے۔

سپریم کورٹ کے موجودہ چیف جسٹس نے اپنے بر سر اقتدار انصاف آنے سے ہی یہ اشارہ دیا تھا کہ وہ ''سوؤ موٹو'' کا راستہ اختیار نہیں کرینگے۔ مگر شیکسپیئر کی دانائی سے دنیا کو دیکھنے والے چیف جسٹس ان کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ ''جہالت جیسی تاریکی اور کوئی نہیں ہو سکتی'' اور ہمارے ملک میں اکثر جرائم کا سبب جہالت ہے۔ وہ لوگ اپنے عقائد اور اپنی روایات کے حوالے سے ایک اچھا کام کر رہے ہوتے ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ ان کی اچھائی اصل میں بہت بڑی برائی ہے۔ روسی ناول نگار نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''جرم اور سزا'' میں اس پہلو کو ٹچ نہیں کیا۔ جب کہ شعور کی تاریخ میں یہ سوال بار بار سر اٹھاتا رہا ہے کہ ''کیا عالم اور جاہل کا جرم ایک ہی سزا کا مستحق ہوتا ہے؟''

سندھ میں کاروکاری کے حوالے ہزار بار احتجاج ہوئے ہیں۔ سینکڑوں سیمینار بھی ہو چکے ہیں۔ اسمبلیوں نے قراردادیں بھی منظور کی ہیں۔ مگر ان سارے مباحثوں میں یہ نکتہ کبھی نہیں اٹھایا گیا کہ ''انسان کی جسمانی اور ذہنی عمر میں جو فرق ہوتا ہے، اس فرق کو بنیاد بنا کر سزا کا تعین کیوں نہیں کیا جاتا! اگر اس حوالے سے ''کاروکاری'' کے واقعات

پر سوچا جائے تو ہمارے سامنے بہت سارے نئے سوالات جنم لیتے ہیں۔ کیوں کہ جس نے بھی دھول والے راستے پر سفر کر کے پسماندہ سندھ کو دیکھا ہے ان کو معلوم ہو گا کہ سندھ میں تعلیم، تربیت اور اس سے کہیں زیادہ اہم چیز یعنی شعور کے نہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر عوام اور خاص طور پر عورتوں دماغی طور پر عقل کی دہلیز پر رک جاتی ہیں۔ وہ جسمانی طور پر تو بڑی ہو جاتی ہیں مگر ذہنی طور پر چھوٹی ہی رہ جاتی ہیں۔ طاہرہ نقوی کے اس کردار کی طرح جو اپنی گود میں گڑیا کو رکھ کر روتے ہوئے کہتی ہے کہ ''چھوٹی سی گڑیا چھوٹی رہ گئی، ممی کی گود میں سوتی رہ گئی'' وہ خواتین جن پر اخلاقی حوالے سے بہت بڑے الزامات لگائے جاتے ہیں وہ اصل میں ذہنی طور پر چھوٹی ہوا کرتی ہیں۔ وہ جسمانی طور پر بوڑھی بھی ہو جاتی ہیں مگر ذہنی اور دلی طور پر بچیاں رہتی ہیں۔ کیا ان بوڑھی بچیوں کو قانون کے کٹہرے میں کھڑا کر کے انہیں وہ ہی سزا دی جاسکتی ہے جو سزا اصل میں ایک باعلم اور باشعور انسان کے لیے بنائی گئی تھی!؟

ہمارے ملک کے باذوق اور باشعور افراد بڑے چاہ سے سنتے ہیں وہ راجستھانی لوک گیت جس کے بول ہیں:

''قیصریا بالما! پدھارو مارے دیس''

وہ دیس جو صرف مٹی والی دھول سے اٹا ہوا نہیں بلکہ معلومات والی دھول کے پردے کے پیچھے موجود اس سندھ دیس کی بڑی بچیوں کا حال دیکھنا چاہئیے جو جدید تعلیم تو کیا قدیم علم کے زیور سے بھی محروم ہیں۔ وہ بچیاں جن کے نام اسلامی ہوتے ہیں۔ بالغ ہونے کے بعد جن کے نکاح پڑھائے جاتے ہیں۔ ان کو نماز تو کیا ٹھیک سے کلمہ پڑھنا بھی نہیں آتا۔ مگر نہ تو ان کے ذہنوں کو علم اور عقل کی روشنی سے منور کیا جاتا ہے اور ان کو بچوں کی طرح تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ مگر ہم انسان کا ذہن نہیں دیکھتے۔ ہم صرف اس کا جسم دیکھتے ہیں۔ ہم اس کی عقل نہیں دیکھتے۔ ہم صرف عمر پوچھتے ہیں اور انہیں قانونی اور غیر قانونی عدالتوں اور جرگوں میں سخت ترین سزا دیتے ہیں۔ سندھ کی وہ عورتیں جسمانی طور پر بالغ ہونے اور شادی کرنے کے بعد بچے پیدا کرتی ہیں اور انہیں جس طرح بچوں کو پالنے کی تربیت دی جاتی ہے وہ اسی طرح بچوں کو

پالتی ہیں۔ مگر بچے تو پرندے بھی پیدا کرتے ہیں۔ پرندے بھی انہیں اپنی چونچ سے پال پوس کر بڑا کرتے ہیں۔ مگر پرندے باشعور نہیں ہوتے۔ اس لیے ہم انہیں جرم اور سزا کے دائرے سے باہر رکھتے ہیں۔ مگر انسان ہونے کے جرم کی سزا ملتی ہے تو کسی ''سارا'' کو تو کسی ''بشیراں'' کو! ان کی بے سمجھی کو بھلا کر انہیں مجرم قرار دیا جاتا ہے اور علاقے کے وڈیرے ان کے متعلق فیصلے کرتے ہیں۔ وہ وڈیرے جو وہاں کے لوگوں سے ووٹ لیکر قانون ساز اسمبلیوں کی زینت بنتے ہیں مگر وہ اپنے علاقوں میں لوگوں کو باعلم اور باشعور بنانے کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ وہ انسان کی صرف جسمانی عمر دیکھ کر انہیں سزا کا مستحق قرار دیتے ہیں اور آئینی عدالتیں ہونے کے باوجود وہ جرگے کرتے ہیں اور ان معصوم بچیوں کو ''کاری'' قرار دیکر انہیں سزائے موت سناتے ہیں۔ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری رہتا آیا ہے۔ مگر اب میڈیا اور قانون کے متحرک ہونے سے سندھ کی سسکیاں منظر عام پر آنے لگی ہیں۔ ایسی دو سسکیوں کو شکارپور کے قریب لکھی غلام شاہ نامی ایک چھوٹے سے شہر کے ایک گمنام گاؤں میں ''کاری'' قرار دیکر دھرتی میں دفن کیا گیا اور اس واقعے کا نوٹس لیتے ہوئے سپریم کورٹ نے سندھ کی آئی جی کو طلب کیا ہے یہ پوچھنے کے لیے کہ ''انہیں کس جرم میں قتل کیا گیا؟''

ایس ایم ایس

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا میڈیا کون سا ہے تو میں جاپان کے زیادہ شایع ہونے والے اخبار "یومی یوری شمبن" یا جرمنی کے "بائلڈ" چین کے "کین کاؤ زیازی" یا برطانیہ کے "دی سن" کا نام نہیں لوں گا۔ حالانکہ ورلڈ ایسوسی ایشن آف نیوز پیپر کے مطابق یہ اخبارات کثیر الاشاعت ہیں۔ لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ بھارت کے "ٹائمز آف انڈیا" سے لے کر ترکی کے "پوستا" تک دنیا کے ایک سو ٹاپ نیوز پیپر بھی اتنے نہیں پڑھے جاتے جتنا وہ میڈیا جس کو ہم "ایس ایم ایس" کہتے ہیں۔

یہ میڈیا صرف پیغام رسانی کا ذریعہ نہیں۔ حالانکہ بہت سارے لوگوں کے لیے یہ میڈیم دلوں کے بیچ بجنے والے اس ساز کی طرح ہے، جس کے نظر نہ آنے والے تار انگلیوں کی سریلی سرگرمی سے محبت کی موسیقی کو جنم دیتے ہیں۔ موبائل فون کا وہ چھوٹا سا "کی پیڈ" کسی پیانو سے کم نہیں ہوتا، جس پر ایک انسان اپنے دل کی دھڑکن اپنی انگلیوں میں منتقل کر کے کچھ حروف لکھتا ہے اور جادو کی طرح وہ حروف کسی اور ہاتھ کے موبائل سیٹ پر کھل جاتے ہیں ایک خوبصورت سے رنگ ٹون کے ساتھ!

معلوم نہیں کہ "شارٹ میسیج سروس" کی معرفت کتنے دل ٹوٹے اور کتنے جڑ گئے ہیں!! مگر یہ سروس صرف دلوں کو توڑنے اور جوڑنے تک محدود نہیں۔ یہ ایک الگ دنیا نہیں تو کم از کم ایک الیکٹرانک اخبار ضرور ہے، جس میں نہ صرف ملکی اور بین

الاقوامی خبریں مل جاتی ہیں، بلکہ قسمت کے حال سے لیکر موسم کے احوال تک ہر قسم کی سچی جھوٹی اطلاع کے لیے یہ ایک مؤثر ذریعہ بن گیا ہے۔

جہاں تک اس سروس کی معرفت پروپیگنڈہ کا تعلق ہے تو اگر یہ میڈیا سیاسی حوالے سے اتنا اثر انگیز نہیں ہوتا تو حکومت وقت عدلیہ کی بحالی کے لیے کیے جانے والے لانگ مارچ کے دوراں اسلام آباد اور پنڈی میں اس سروس کو دو دن کے لیے معطل نہیں کرتی۔

اس سروس میں صرف ایسے میسیج نہیں آتے جو آپ کا موڈ خراب کر دیں، لیکن جب صبح کو ایک خوبصورت نقش کی صورت پرندے کی طرح ایک میسیج آپ کو چہچہا کر جگاتا ہے تو آپ کو جاگ جانے میں کس قدر آسانی حاصل ہو جاتی ہے!! کیوں کہ اس وقت آپ کی نظروں میں ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیوں جیسی سورج کی کرنیں نہیں چھبتیں، بلکہ شبنم میں بھیگا ہوا ایک گلاب چہرہ موبائل کی اسکرین پر ابھر آتا ہے اور آپ کو بتاتا ہے کہ:

''خوشی ایک تتلی کی طرح ہوتی ہے۔ اگر تم اس کے پیچھے بھاگو گے تو وہ تم سے اڑ کر دور چلی جائے گی۔ لیکن اگر تم خاموشی کے ساتھ ایک جگہ ٹھر جاؤ تو ممکن ہے کہ وہ تمہارے کندھے پر آکر بیٹھ جائے۔ تمہارے لیے خوشیوں کی بہت ساری تتلیوں کی تمنا کے ساتھ: صبح بخیر!''

ہمیں تو ایسے ایس ایم ایس نہیں آتے مگر جب کراچی سے احمد ہمیں یہ الفاظ ''سینڈ'' کرتا ہے کہ ''جاؤ قرارِ بے دلاں۔۔۔۔ صبح بخیر شام بخیر'' دل پر پڑا بہت سارا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔

یہ تو سات الفاظ ہیں، سات سمندروں جیسے۔ مگر کبھی تو شبنم کے تنہا قطرے جیسے صرف ایک لفظ کے ساتھ ہی دل کا کنول کھل اٹھتا ہے۔ جب کسی کی طرف سے آتا ہے کہ ''ہائے''! اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا مفہوم انگریزی والا ہے کہ اردو والا!!

اور جب کوئی رات دل پر سیاہ بوجھ بن کر ٹھر جاتی ہے اور نہ تو گلزار کے الفاظ میں ''سلی سلی'' کٹتی ہے اور نہ مسرت نذیر کے والد خواجہ نذیر کے پنجابی کافی کی طرح

''دھمی دھمی'' گزرتی ہے۔ جب وہ زخم کے نیل کی طرح جم سی جاتی ہے تو اس کیفیت میں ''ایس ایم ایس'' کی صورت لیکر آنے والی یہ دعا حوصلہ بڑھانے کے سلسلے میں کس قدر مشکل کشائی کرتی ہے کہ:

''اے خدا! میں اس شخص کو درپیش سارے مسائل کے متعلق نہیں جانتا۔ مگر تجھے اس کی تکالیف کا علم ہے۔

میں نے تو صرف اس کی خاموشی کو سنا ہے مگر تو اس کی گریہ سے آگاہ ہے۔

میں نے تو اسے ہمیشہ ہنستے ہوئے سنا ہے مگر تم نے اس کے آنسو دیکھے ہیں۔

میں نے تو اسے ہمیشہ دیتے ہوئے ہی دیکھا ہے مگر تجھے تو معلوم ہے کہ اس سے کیا کچھ چھن چکا ہے۔

میں نے تو اس کا صاف چہرہ دیکھا ہے مگر تم اس کی روح پر لگے ہوئے داغوں سے واقف ہو!

مجھے اس کے ایمان کا علم ہے اور تو اس کے شکوک کو جانتا ہے!

میں اس کے لیے تمہاری درگاہ میں دعا گو ہوں کہ تم اس کو سب کچھ دو جس کی اس کو ضرورت ہے۔''

اور اس وقت علامہ اقبال کے اس خیال کے آگے عقیدت کا سر مسرت کے ساتھ جھک جاتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ:

''خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر''

ہاں! جب ایک ذہین نوجوان سن زو کی کتاب کے یہ الفاظ ایک جذبے کے ساتھ بھیجتا ہے کہ ''پرانے وقتوں کے اچھے جنگجو پہلے اپنے آپ کو ناقابلِ شکست بنا لیتے تھے اور پھر دشمن کو شکست دینے کے لیے صبر کے ساتھ وقت کا انتظار کرتے تھے''

مگر بیوفائی کے درد کی نوعیت بہت مختلف ہوتی ہے۔ لیکن یہ شعر ایس ایم ایس کی میڈیا سے ایک مرہم کی طرح آتا ہے اور تکلیف والے دل کی اذیت کم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"ابھی وہ درد باقی ہے
اگرچہ وقت مرہم ہے
مگر کچھ وقت لگتا ہے
کسی کو بھول جانے میں
دوبارہ دل بسانے میں
ابھی کچھ وقت لگنا ہے
ابھی وہ درد باقی ہے
میں کیسے نئی الفت میں
اپنی ذات گم کرلوں
کہ میرے جسم ووجداں میں
ابھی وہ فرد باقی ہے
ابھی اس شخص کی مجھ پر
نگاہِ سرد باقی ہے
ابھی وہ عشق کے رستوں کی
مجھ پر گرد باقی ہے
ابھی وہ درد باقی ہے
ابھی وہ فرد باقی ہے"

بھیجنے والا نہیں جانتا کہ کسی کو اس وقت ان الفاظ کی کتنی ضرورت ہوتی ہے جب وہ تنہا بغاوت کرتا ہے اور دنیا اس کے خلاف ہو جاتی ہے، تب وہ ان الفاظ کی قدر کو محسوس کرتا ہے کہ "لاکھوں دوست بنانا بڑی بات نہیں مگر بڑی بات یہ ہے کہ آپ کا ایک دوست اس وقت بھی آپ کے ساتھ ہو جب لاکھوں لوگ آپ کے خلاف ہوں"

اور جب عظمت جیسا اچھا نوجوان مدرسے کی دیوار سے پیٹھ لگا کر آپ کو ایس ایم ایس کی معرفت بتاتا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کی حیات کس طرح کی تھی تو اس وقت انسان میں ایک شعور کی روشنی جل اٹھتی ہے۔

کیوں کہ انسان تو روزی کی تلاش میں پھرتا ہے۔ اسے بسا اوقات غم جاناں سے غمِ روزگار زیادہ دلفریب محسوس ہوتا ہے۔ مگر جب محمودہ بتاتی ہے کہ "چوہے اور بلی کی دوڑ میں چوہا اکثر جیت جاتا ہے۔ کیوں کہ بلی تو کھانے کے لیے دوڑتی ہے اور چوہا جان بچانے کے لیے۔ یاد رکھو! مقصد ضرورت سے زیادہ اہم ہوا کرتا ہے" ایسے الفاظ دوڑتے ہوئے انسان کو ذرا سا ٹھہرا کر تھوڑی سی دیر میں بہت کچھ بتا دیتے ہیں۔

یہ سب کچھ اور اس سے بہت زیادہ، اِس میڈیم پر ہوتا ہے جس کو "ایس ایم ایس" کہا جاتا ہے۔ وہ ایس ایم ایس جس کی وجہ سے اکثر لوگوں کو انگریزی نہ آنے کے باوجود رومن اردو لکھنا آ گئی ہے۔

اگر آج سے کچھ عرصہ قبل کوئی اردو کو رومن میں لکھنے کا تقاضا کرتا تو اردو کے علماء اس کا برا حشر کر دیتے۔ اسے اردو کے خلاف ایک سازش قرار دیتے۔ مگر کون جانتا تھا کہ ایک روشن ذہن اپنے محنت کش ہاتھ کے ساتھ پنجابی زبان کا یہ معصوم شعر رومن میں لکھے گا کہ:

"اج دی رات میں کلاں واں
کوئی نہیں مرے کول
اج دی رات تے سونہیاں ربا
نیڑے ہو کے بول"

مگر ایک ایس ایم ایس ایسا بھی ہوتا ہے، جو بالکل خالی ہوتا ہے۔ جس کو ایس ایم ایس کی زبان میں "بلینک میسیج" بولا جاتا ہے۔ اس ایس ایم ایس میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ بغیر کسی تعلیم کے ہمارے لوگ ایس ایم ایس میڈیا کی معرفت "خاموشی کی زباں" لکھنا اور پڑھنا سیکھ گئے ہیں۔

بکھری ہوئی باتیں

کھڑکی کے شیشے پر بارش کی بوندیں کسی رومانوی مصور کی تصویر کی مانند رک رک کر رواں ہیں۔اور ٹیلی وژن پر اسد امانت علی خان کی دوسری برسی کی خبر نشر ہو رہی ہے۔

گذشتہ تین دنوں سے دارالحکومت کا دامن مسلسل بھیگ رہا ہے مگر مارگلا پہاڑیوں سے اٹھتے ہوئے بادلوں سے مخاطب ہو کر کوئی نہیں کہہ رہا کہ:

''عمراں لنگھیاں پبھاں پار
ہن نہ وس وے کالیا!''

وہ کالے بادل جو برسنے کے بعد سفید ہو جاتے ہیں اور سیاہی مائل سبز پہاڑوں پر ان آنچلوں کی طرح آہستہ سے ڈھلکتے رہتے ہیں، جن کے کونوں سے عہدِ وفا کی گانٹھ بندھی ہوتی ہے۔

وہ رات بہت یادگار تھی جب ہم پیر سوہاوہ سے نیچے اتر رہے تھے اور بل کھاتے راستے کے ایک موڑ پر گاڑی روک کر وہ ستارے دیکھنے لگے جو شہر اقتدار کی روشنیوں پر مسکرا کر کہہ رہے تھے کہ ''دھرتی کے دامن میں دکھوں کے سوا اور ہے ہی کیا!؟''

اس رات اگر ہم گھمبیر موڈ میں ہوتے تو قرۃ العین حیدر کے کرداروں کی طرح اس بحث میں چھڑ جاتے کہ ''سکھ کیا ہے اور دکھ کیا ہے؟ گوتم بدھ نے کیا کہا ہے اور حقیقت کیا ہے!؟'' مگر اس رات ہمارا ایسا کوئی موڈ نہیں تھا۔

عمران اپنی سی ڈیز میں وہ گیت تلاش کرتا رہا جس میں "ابا" گروپ دل کی گہرائیوں سے گا کر بتاتا ہے کہ:

I have a dream a song to sing
To help me cope with anything
If you see the wonder of a fairy tale
You can take the future even if you fail
I believe in angels
Something good in everything I see
I believe in angels
When I know the time is right for me
Ill cross the stream – I have a dream

یعنی "میرا ایک خواب ہے
اور میں ایک گیت گانا چاہتی ہوں
ایک ایسا خواب، ایک ایسا گیت
جو مجھے ہر مشکل سے نمٹنے میں مدد کرے گا
کاش تم اس حیرت کو دیکھ سکتے
جو پریوں کی کہانیوں میں ہوتی ہے۔
اگر تم ناکام بھی ہو جاؤ
پھر بھی مستقبل تمہاری مٹھی میں ہو گا!
میں فرشتوں پر یقین رکھتی ہوں
اور ہر چیز میں اچھا پہلو دیکھتی ہوں
مجھے فرشتوں پر یقین ہے
اور جب میں نے دیکھا کہ یہ مناسب وقت ہے
تو میں اس ندی کو پار کرلوں گی"

لیکن ایک دوست مسلسل اصرار کے جارہا تھا کہ "اپنے انگریزی میوزک کو چھوڑو اور وہ گانا لگاؤ:

"تو جو نہیں ہے کچھ بھی نہیں ہے
یہ مانا کہ محفل جواں ہے، حسیں ہے"

اس دوست کے اصرار کی وجہ سے مجھے اس گیت سے کچھ ملتا جلتا گیت یاد آنے لگا، جس کے بول شاید یہی تھے کہ:

"ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں"

واقعی ان تاروں بھری راتوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا؟ اور وہ بھی اس اسلام آباد نامی شہر میں جو دن کو وعدے کرتا ہے اور رات کو بھول جاتا ہے۔

اور اس ملک کے عوام انتظار کرتے ہیں۔ وہ انتظار جو ظلم کی سب سے مشکل قسم ہے۔

اس شہر میں حکمرانی کرنے والے ایک لیجینڈ لیڈر نے عوام سے ایک معمولی سا وعدہ کیا تھا۔ تین الفاظ پر محیط ایک مختصر سا وعدہ "روٹی، کپڑا اور مکان" کا وعدہ!

اس وعدے کا کیا ہوا؟

اسلام آباد کی بھیگی ہوئی ہوا آج بھی پوچھ رہی ہے۔ مگر ایف ایم گیتوں کے شور میں لوگ دھلے ہوئے درختوں اور نکھرے ہوئے پھولوں کو دیکھ رہے ہیں!

اچھا لگتا ہے یہ سب کچھ! ہلکی پھلکی بوندا باندی میں تھوڑی سی گاڑیاں اور چھتری اٹھا کر چلنے والے چند لوگ۔ کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ دنیا کی ابھی ابھی شروعات ہوئی ہے۔

بارش بہت کچھ دھو دیتی ہے۔ جس طرح انسان کی آنکھوں کے آنسو اس کے دل کے داغ دھو دیتے ہیں، کچھ ویسے ہی بارش میں دنیا کے دکھ دھل جاتے ہیں۔

نہیں معلوم کازانت زاکس نے کیا سوچ کر لکھا تھا کہ "رو، انسان ذات! رونے میں نجات ہے" کیا یہ الفاظ لکھتے وقت اس کی کیفیت بھی کچھ ایسی تھی، جو بارش میں محبت بھرے دل کی ہوتی ہے؟

لیکن یہ بکھرا بکھرا سا کالم میں کیوں لکھ رہا ہوں؟ ایسے کالم نہیں لکھے جاتے۔ ایسے کالم صرف سوچے جاتے ہیں۔ لیکن میں ایک بکھری سوچ کو الفاظ کی صورت

دے چکا ہوں۔ اب مجھے اسے ضایع نہیں کرنا۔ ذیان کوئی بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اس لیے میں اس کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اس لیے مجھے اسد امانت علی خان کے اس گیت کی طرف لوٹ آنا چاہئے جہاں سے میں نے ابتدا کی تھی۔

"عمراں لنگھیاں پبھاں پار
ہن نہ وس وے کالیا"

اور میں سوچ رہا ہوں کہ لوگ موسیقی کیوں سنتے ہیں؟ شاید اس لیے کہ موسیقی نہ صرف انسان کے دل کے زخموں پر مرہم رکھتی ہے، بلکہ اسے اپنے سروں کے ذریعے حوصلہ بھی دیتی ہے۔ مگر افسوس کہ ہماری سیاست میں کچھ نہیں۔

آج ہی کی بات ہے کہ اپنے نام سے "کشمیری" کاٹنے والے ایک دوست نے میری بھول پر کہا کہ "ایک پروفیسر نہا رہا تھا کہ اسے کوئی مشکل سوال سمجھ میں آگیا اور وہ اسی حالت میں باہر نکل آیا۔ اس پر کسی نے اپنے خوبصورت تبصرے کی قبا ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر اسے نہیں تو اس کے خیال کو تو لباس مل گیا"

اور اس وقت میں سوچنے لگا کہ ہمارے خوابوں کو تعبیروں کو لباس کب ملے گا؟ وہ خواب جو طویل انتظار کے باعث بھوکے ہیں، ان کے پیٹ میں تعبیر کی روٹی کب جائے گی؟ وہ خواب جو بارش اور دھوپ میں پانی اور پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں، انہیں تعبیر کا مکان کب ملے گا؟

پھر اندر سے آواز آئی کہ کیا آپ اب تک سمجھتے ہیں کہ آپ کے خواب زندہ ہیں؟ آپ کے سب سے بڑے خواب کا نام کشمیر تھا۔ کیا کشمیر نامی خواب زندہ ہے؟

ضد کی تو بات اور ہوتی ہے مگر یہ خو اچھی تو نہیں!

اس لیے ان حساس سوالات کو چھوڑتے ہیں۔ اور بات کرتے ہیں اس موسیقی کی، جو اب تک اپنے سروں سے خوابوں کے بچے پیدا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ جب انسان کی روح انتظار کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتی، تب اس کے سر اپنا کندھا دیتے ہیں اور انسان کو کچھ آرام میسر آ جاتا ہے۔ کیا آپ کو یہ گیت سن کر ایسا نہیں لگتا کہ ابتدا

میں "ایبا" گروپ کے گیت کا اسپرٹ اس میں بھی موجود ہے۔

"کبھی کبھی آدتی زندگی میں یوں ہی کوئی اپنا لگتا ہے
کبھی کبھی آدتی وہ بچھڑ جائے تو اک سپنا لگتا ہے
ایسے میں کوئی کیسے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکے
اور کیسے کوئی سوچ دے

Everythingsgonnabeok

یعنی "سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"
ہاں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا!

کاش! ہماری سیاست ہمیں اور کچھ نہ دے پاتی لیکن یہ حوصلہ دیتی کہ:

"رات کے بعد ہی سویرا ہوتا ہے"

رات کتنی تاریک ہے۔ اور آسمان ستاروں والے چمکتے ہوئے دانت نکال کر ہم پر ہنس رہا ہے۔

اور ہم کس کی تقریر اور کس کی پریس کانفرنس کے آغوش میں پناہ لیں۔

فیض نے کہا تھا کہ:

"باوفا تو بہت ہیں کوئی حسیں بھی تو ہو
چلو پھر اسی بے وفا کی بات کرتے ہیں"

آئیں ایک بار پھر "روٹی، کپڑے اور مکان" کے وعدے پر مسکرائیں!

اور دل سے کہیں کہ بچوں کی طرح سو جائے پریوں کی وہ کہانیاں سن کر جن میں بہت سارے معجزے ہو جاتے ہیں۔

پاکستان کے صحافیوں کو عراق کے منتظر زیدی اور بھارت کے جرنیل سنگھ کی پیروی کبھی نہیں کرنی چاہئے۔ مگر کبھی کوئی کسی لیڈر سے یہ تو کہے کہ "اگر آپ برا نہ مانے تو آپ سے یہ کہیں کہ اپنی پریس کانفرنس چھوڑ کر قوم کو کہانی سنائیں۔ پریوں والی کہانی۔ ایسی کہانی جس میں ناممکن چیزیں ممکن بن جاتی ہیں۔ اور جس کو سنتے سنتے نیند آ جاتی ہے"

کامریڈ کیا سوچ رہا ہے؟

''آج ''یکم مئی ہے۔ لیکن کل کے اخبار میں یہ ''کل'' بن جائے گی۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے! آخر ہر مزدور کو اس روز تنخواہ کے ساتھ چھٹی تو نہیں ملتی۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کل کے کامریڈوں نے آج اپنے ڈرائیوروں، چوکیداروں، مالھیوں، خانساماؤں اور گھریلو مددگاروں کو چھٹی دی ہے کہ نہیں!!

یا وہ آج کی تاریخ کو اپنی اس دل کی طرح بھول گئے ہیں، جو دل انہوں نے کبھی کابل، ماسکو یا ویانا میں کسی منظر کے لفافے میں محفوظ کرنے کے بعد ٹیک آف کرنے والے جہاز میں ٹونی بینیٹ کا وہ گیت گنگنایا تھا، جس میں کسی اجنبی شہر میں دل چھوڑ آنے کا دکھ انہیں ''رومیو جولیٹ'' سگار کی سلگتی ہوئی خوشبو کی مانند محسوس ہوا تھا۔

ویسے کامریڈ تو اب پانڈا کی نسل بن گئے ہیں، جن کے قیدی جسموں پر حکمران جنرل اپنے سگار بھجواتے تھے لیکن ایسے کامریڈوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے جو ووڈکا کے پہلے پیگ کے ساتھ چیری چباتے ہوئے اپنی کم عمر دوست کو بتاتے ہیں کہ:

''جس دن ڈھاکہ ڈوب رہا تھا، اس دن پارٹی کی میٹنگ بہت افسردہ ماحول میں ختم ہوئی۔ کیوں کہ کریملن والوں نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا تھا کہ اگر ہم نے مداخلت کی تو تیسری عالمی جنگ شروع ہو جائے گی۔ اور ویسے بھی مشرقی پاکستان کی تحریک میں ہمیں محنت کش طبقے کی تحریک کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہے تھے! جہاز کے ذریعے ڈھاکہ سے نکلنا تو ناممکن تھا، اس لیے بنگالی ساتھیوں نے ہمارے

لیے بوٹس کا بندوبست کیا تھا اور بوٹ میں سوار ہوتے ہوئے مجھے ایک بنگالی کامریڈ نے کہا تھا کہ "جب تاریخ طوفان بن جائے تو سرکش شاخ بننے سے کہیں بہتر ہے کہ نرم گھاس بنا جائے۔ یہ جدائی عارضی ہے۔ ہم بہت جلد اکھٹے ہونگے اور شاید چیکو سلواکیا میں نہیں بلکہ چٹاگانگ میں اپنی فتح کا جام نوش کریں۔ اس اندھیری رات میں بوٹ چلتی رہی اور بنگالی ملاح ٹیگور کا گیت گاتا رہا:

"تومار گھورے باتی
تومار گھورے ساتھی
امار تورے راتی
امار تورے تارا
تومار اچھی ڈونگا
امار جولا جول"

ذرا سا قریب سرک کر اور اپنی لامبی پلکیں جھپک کر کامریڈ کی کم عمر دوست پوچھتی ہے کہ اس گیت کا مطلب کیا ہے؟

اور کامریڈ ایک گھونٹ میں باٹم ٹاپ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"تمہارے گھر میں روشنی ہے
تمہارے ساتھ ساتھی ہے
میرے پاس یہ رات ہے
میرے پاس صرف ستارے ہیں
تمہارے پاس مضبوط زمین ہے
اور میرا مقدر سطح آب پر سفر"

دوسرا پیگ بناتے ہوئے کامریڈ کہتا ہے کہ "روشنی کسی کے پاس نہیں تھی۔ ہر ساتھ دم توڑ چکا تھا۔ ستارے ہمارے مقدر پر طنزیہ آنکھوں سے مسکرا رہے تھے اور پانی قہقہے مار رہا تھا۔ بوٹ آگے بڑھ رہی تھی۔ آگے کوئی منزل نہیں تھی۔ ہمیں پتہ تھا کہ ہم بکھر رہیں ہیں۔ ان بکھرے ہوئے جذبوں کو سمیٹ کر فیض نے لکھا تھا کہ:

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد''

یہ غزل میری میوزک ڈوائس میں موجود ہے۔ لو سرچ کرو، فیض کے نام سے یا نیرہ نور کے نام سے ہو گا! ہاں یہی تھوڑی سی آواز بڑھادو!

جب دوسرا پیگ پورا ہونے والا ہوتا ہے تو کامریڈ کہتا ہے کہ:

''ہم نے ماسکو والوں کے ساتھ سخت اختلاف رکھا تھا کہ کابل میں ڈائریکٹ مداخلت نہ کریں۔ لیکن معلوم نہیں خلق اور پرچم والوں نے انہیں کیا پٹی پڑھائی تھی؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود ان کا سکھایا ہوا سبق دہرا رہے ہوں۔

لیکن اس سے کیا ہوا؟ پاکستان میں نہ صرف جمہوریت کی جڑ ختم ہوئی بلکہ امریکہ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس ملک میں اپنے سازشی بنیاد رکھ دی۔

تیسرا پیگ بناتے ہوئے کامریڈ اپنی دوست کو بتاتا ہے کہ:

''لیکن کابل میں بہت اچھا وقت گزرا۔ دن کو میٹنگز اور رات کو رشین ووڈکا۔ انٹر کانٹینینل کا ڈائنگ ہال۔ افغان میوزک۔ پوری دنیا کے دوست!

دانیا آپ کو وہاں پر ملی تھی؟ نوعمر دوست کے سوال پر کامریڈ مسکرا کر کہتا ہے کہ ''نہیں۔ وہ ماسکو میں ملی تھی۔ یوتھ فیسٹیول میں۔ اس نے اپنے ملک میں بہت سفر کیا تھا۔ اس پر بہت ٹارچر ہوا تھا۔ وہ ٹرکش تھی۔ اس کا باپ پارٹی کی بڑی فگر تھا۔ بہت قربانیاں دی انہوں نے۔ تمہیں پتہ ہے کہ دانیا کی ایک آنکھ کی روشنی تشدد کی وجہ سے بجھ گئی تھی۔ اور وہ آنکھ چھوٹی بھی ہو گئی تھی۔ مگر وہ ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی تھی۔ میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی راضی تھی۔ لیکن پارٹی نے سخت مخالفت کی۔ اور ہم دونوں نے قربانی دی!

ہماری تاریخ قربانیوں کی طویل داستان ہے!

چوتھا پیگ کامریڈ کے سر پر سوار ہو کر اسے ماضی اور حال میں ایک جھولے کی طرح جھلاتا جا رہا تھا۔ وہ نہ معلوم کیا کہہ رہا تھا۔

''سب غلط ہو گیا۔ صرف ایک گورباچوف کی غلطی کی وجہ سے۔۔۔ ہمیں

پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔۔۔انقلاب کبھی پیچھے نہیں لوٹتا۔۔۔ مگر ٹراٹسکی کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔۔ وہ جینئس تھا۔۔۔ مگر اسے کیا ملا؟ سر پر ہتھوڑا۔۔۔!!!اسٹالن کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔۔۔۔۔۔۔۔!"

"اور اب !اب کیا؟" شرارت والی آنکھوں سے اس کی نوعمر دوست کچھ پوچھتے ہوئے کہتی ہے۔

وہ سمجھ جاتا ہے۔ اب تم، تمہاری حسین بانہیں۔ ریشمی بال۔ قاتل ہونٹ اور یہ کڑوی ووڈکا!

آپ کیوں پیتے ہیں؟ دوست کے سوال پر مشکل سے آنکھیں اٹھاتے ہوئے کامریڈ کہتا ہے کہ "جینے کے لیے پینا پڑتا ہے۔ ایسی زندگی بغیر پیے نہیں کاٹی جاسکتی۔ یہ زندگی نہیں ایک غداری ہے۔ ہم غدار ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس مضافاتی پوائنٹ پر بہت سارے بچوں کو پیٹ بھرنے جتنا دودھ نہیں ملتا۔ اور میں پانچ ہزار کی بوتل پی رہا ہوں۔ جو بچ جائے گی وہ یہاں رہ جائے گی۔ تمہیں پتہ ہے کہ پانچ ہزار کیا ہوتے ہیں؟ ایک سگھڑ عورت ان سے پورے مہینے کا راشن چلاتی ہے۔

پھر کامریڈ ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "لیکن ہمیں اس سے کیا؟شولوخوف نے لکھا ہے کہ وقت ایک ڈان ہے، جو بہتا رہتا ہے۔ تمہاری آنکھیں بہت نشیلی ہیں۔۔۔!لیکن فیض فرماتا ہے کہ:

"مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے
جا بجا کوچہ و بازار میں بکتے ہوئے جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے

اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجئے
مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ!"

لیکن کامریڈ کے قریب آتے ہوئے اس کی کم عمر دوست کہتی ہے

"لیکن میں تو مانگو گی، یہ میرا حق ہے۔"

کامریڈ زور سے ہنستا ہے "حق۔۔۔۔حق۔۔۔انا الحق۔۔۔تم میرا نہیں کسی اور کا حق ہو! کسی وجیہہ نوجوان کا۔۔ لیکن میں نے دولت کے ذریعے تمہیں اپنے بڑھاپے کی لاٹھی بنالیا ہے"

"ایسا کیوں کہتے ہو؟" نو عمر دوست اس کے قریب آتے ہوئے محبت کی مدہوش مٹھاس سے کہتی ہے۔

اور کامریڈ سوچتا ہے کہ

"کیا اس لڑکی کو میری ڈھلکی ہوئی جلد بری نہیں لگتی اور میرے منہ کی بو!!"

پھر اس کی وحشت جاگ جاتی ہے اور سوچ سو جاتی ہے۔

پرانی شرابوں اور نئی لڑکیوں سے اپنی سوچ کو سلانے والے کامریڈ کتنے ہیں؟ کابل سے لیکر کراچی تک ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں تو اتنی کم بھی نہیں۔

لیکن اس افسانوی حقیقت سے ہٹ کر میں ایک ایسے محنتی اور نیک کامریڈ کو جانتا ہوں جس نے اپنی صلاحیتوں کے ذریعے سرحد کی حکومتی سیاست میں بہت بڑا مقام بنا لیا ہے۔ کامریڈ کہیں بھی چلے جائیں اور کچھ بھی کریں، ان سے اخبارات پڑھنے کی عادت نہیں چھوٹتی۔

آج یکم مئی کے دن وہ کامریڈ کراچی کے اخبارات میں اپنے ہم زباں مزدور ساتھیوں کے بہیمانہ قتل پر کیا سوچتا ہو گا؟

کیا اقتدار احساس کو ختم کر دیتا ہے؟

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

غم، غصہ اور صنوبر

کل کے ''اخبار'' میں ''23 ہلاکتوں'' کے حوالے سے جو خبر ہیڈ لائن بن کر شایع ہوئی ہے، اس میں اتنے ہی الفاظ ہیں، جتنے الفاظ سے ایک جامع کالم وجود میں آتا ہے۔ مگر وہ کالم نہیں ہے۔ بس ایک خبر ہے۔ تیئیس ہلاکتوں اور درجنوں زخمیوں کے نام اور پتے بتانے والی ایک سیدھی سادھی خبر! ایک ایسی خبر جیسی خبر پر گارشیا مارکیز نے بطور ایڈیٹر اپنے رپورٹر سے کہا تھا کہ ''اس خبر میں روح نہیں ہے'' اور سول وار کی ''بیٹ'' کرنے والے رپورٹر نے بھری ہوئی آنکھوں سے سر جھکا کر جواب دیا تھا کہ ''سر! میں ایک معمولی رپورٹر ہوں۔ میں مسیح نہیں کہ مردوں کو زندہ کر سکوں''

اس رات ''تنہا صدی'' کے مصنف کو معلوم ہوا تھا کہ ''غریبوں کی رپورٹنگ امیروں جیسی نہیں ہوتی'' ایسی رپورٹنگ میں مرنے والے کا نام بھی آجائے تو بہت ہے۔ پتہ بھی مل جائے اور عمر بھی معلوم ہو جائے تو بڑی بات ہے!

کراچی کا ایک کرائم رپورٹر کیا کر سکتا ہے؟ وہ تھانوں، مردہ خانوں اور ایمرجینسیز سے صرف تعداد اور اتے پتے ہی اکھٹے کر سکتا ہے۔ وہ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ روٹ نمبر k4 بس کے آخری اسٹاپ پر نامعلوم دہشتگردوں کی فائرنگ سے جاں بحق ہونے والے صنوبر پر کس طرح حملہ ہوا اور اس نے کس طرح جان دی؟ حالانکہ وہ صنوبر کی پوری ''بائیو ڈیٹا'' حاصل کر سکتا ہے اور وہ ''آخری اسٹاپ'' کے کلچر کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ کراچی کی اکثر پبلک ٹرانسپورٹ کے آخری اسٹاپ شہر سے

باہر ہوتے ہیں۔ چھوٹے اور کچے مکانات کے ارد گرد ان جھونپڑا ہوٹلوں والے آخری اسٹاپ جہاں کرسیاں نہیں بلکہ چارپائیاں پڑی ہوتی ہیں اور رات کو دیر سے تھکے ہوئے ڈرائیور سر کے نیچے رومال رکھ کر مسکراتی ہوئی آنکھوں سے ستاروں کو دیکھتے ہوئے، ان زبانوں کے گیت گنگناتے ہیں جن زبانوں میں پہاڑی چشموں کی کھنک اور دریاؤں کی خاموشی ہوتی ہے۔

صنوبر ایک ایسے ہی آخری اسٹاپ پر مارا گیا۔ بیس برس کا نوجوان صنوبر! جو کسی سیاسی پارٹی کا نہیں بلکہ اس قوم کا سرمایہ تھا، جو ابھی تک اس ڈرپوک ہجوم کے بطن سے پیدا ابھی نہیں ہوئی۔ اگر صنوبر کی قوم ہوتی تو وہ اس طرح قتل بھی نہیں ہوتا اور اگر اتفاق سے ایک بے غیرت مجرم اس کو گولی کا نشانہ بنا بھی دیتا تو ایک گھر کے چراغ گل ہونے پر ہزاروں گھروں میں عقیدت اور محبت کی شمعیں روشن ہو جاتیں۔ وہ آخری اسٹاپ ٹیوب روز کے بکیز اور گلاس کینڈلز سے بھر جاتا۔ وہ متوفی نہیں بلکہ شہید قرار دیا جاتا۔ مگر اس منتشر ہجوم کا اس صنوبر سے کوئی تعلق نہیں جو ایک خوبصورت شجر کے نام والا تھا۔ اس منتشر ہجوم کو کوئی احساس نہیں کہ انسان تو دھرتی پر اتری ہوئی خدا کی امانت ہے جب کہ مہذب قومیں تو درختوں کے کاٹے جانے پر احتجاج کرتیں ہیں۔ کیوں کہ درخت اپنے کاٹنے والے کے سر سے بھی سایہ نہیں ہٹاتے! اور یہ لوگ بیحد سکون کے ساتھ ہیں کہ صنوبر کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ انہیں اطمینان ہے کہ صنوبر کے قتل میں ان کا کوئی کردار بھی نہیں۔ حالانکہ یہ لوگ بہت جلد جان لینگے کہ صنوبر کے خون کے دھبے ان لوگوں کے ہاتھوں پر بھی ہیں، جو اپنے دامنوں کی طہارت کے قصے خود بیان کرتے ہیں۔

اس وقت صنوبر صرف ایک مقتول ہے۔ وہ کیوں قتل ہوا؟ اس کو کس نے قتل کیا؟ ہر انسان کی موت ان سوالات کو جنم دیتی ہے مگر صنوبر کے حوالے سے ان سوالات پر ایک میلی چادر پڑی ہوئی ہے۔ وہ میلی چادر جو غربت کا پرچم ہوتی ہے۔ غریبوں کی فوج کا ایک شہید سپاہی، صنوبر۔!

وہ صنوبر جس کا نام رکھتے ہوئے، اس کے والدین نے سوچا ہوگا کہ جب یہ بڑا

ہو جائے گا تب ہم اپنے بڑھاپے کا سفر اس کے سائے میں کریں گے۔ مگر ان کی آنکھوں کے سامنے اس صنوبر کو گولیوں سے کاٹ کر اس سرزمین پر گرادیا گیا، جس سرزمین کا نام کراچی ہے۔ صرف یہ پیغام دینے کے لیے کہ کراچی صنوبروں کی سرزمین نہیں ہے!

لاشوں کی صورت پیغام دینے کا سلسلہ کس نے شروع کیا ہے؟ اگر قارئین کو ایسے سوالات کے جوابات بھی دیے گئے تو پھر صنوبروں کے کٹ کر گرنے کا سلسلہ کس طرح رکے گا؟ جب کہ صنوبروں کے کٹ کر گرانے کا سلسلہ ہر صورت رکنا چاہئے۔ اور یہ قاتل سلسلہ صرف یہ کہنے سے نہیں رک سکتا کہ "یہ شہر تو اب جنگل بن گیا ہے" یہ شہر کوئی جنگل نہیں ہے۔ کیوں کہ جنگلوں میں بھی قانون ہوتے ہیں۔ کچھ دستور ہوتے ہیں۔ وہ شیر جس کا پیٹ بھر جائے وہ حملہ نہیں کرتا۔ درخت سے کسی پرندے کا بچہ گر جائے تو پورا جنگل جاگ اٹھتا ہے۔ لیکن یہاں صنوبر جیسے نوجوان قتل کیے جاتے ہیں تو بھی پورا شہر سویا رہتا ہے، اس سکون کے ساتھ کہ صنوبر کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔

بکھرے ہوئے ہجوم کی یہ بے تعلقی اور بیگانگی ایسے ماحول کو جنم دیتی ہے جس کے باعث بسوں کے آخری اسٹاپوں پر صنوبر قتل کیے جاتے ہیں۔ اور شہر چلتا رہتا ہے، کچھ کم ٹریفک میں سہمے ہوئے مسافروں کی مانند!

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ "غصہ بہت بڑی طاقت کا نام ہے" ایک ایسی طاقت جو غم جیسے طاقتور جذبے کو بھی آسانی سے دبا لیتی ہے۔ مگر اس شہر کو غصہ بھی نہیں آتا۔ منحوس سیاسی اور معاشی مفادات کے لیے ایک دن میں تئیس صنوبروں کو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اور شہر میں غصے کا طوفان تو کیا غم کی ہوا بھی نہیں چلتی۔

اس شہر کے امن پسند اور غیرت مند عوام کو اپنی طاقت کا اندازہ کب ہوگا؟ یہ شہر کروڑوں لوگوں کا ہے۔ اگر چند ہزار لوگ جنرل مشرف کے خلاف ایک قوم بن کر دھرنا دیتے ہیں تو اس کا نام حکمرانی سے کٹ جاتا ہے اور اتنے ہی لوگ اگر ایک معزول چیف جسٹس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں تو حکومت، اسٹیبلشمنٹ اور ریاست کی

ناپسندیدگی کے باوجود بحال ہو جاتا ہے۔ ایسے عظیم واقعات کا حصہ رہنے والے لوگ اپنی طاقت کے ساتھ کراچی میں امن کو یقینی کیوں نہیں بناتے؟ لیکن ایسے کام تبھی ہو پاتے ہیں جب کوئی رشتہ ہو۔ کوئی تعلق ہو۔ چیف جسٹس کے ساتھ عوام کا ایک رشتہ بن گیا تھا۔ اس لیے یہ نعرہ دلوں سے نکلتا تھا کہ "چیف تیرے جانثار۔۔۔ بیشمار"! اور اس عوام نے قوم بن کر جنرل مشرف کے خلاف بھی کامیاب تحریک اس لیے چلائی کیوں کہ انہوں نے مشرف کے ساتھ بھی ایک رشتہ قائم کیا تھا۔ ایک ایسے اختلاف کا رشتہ جس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر عوامی طاقت ملک کو یرغمال بنانے والے مشرف کو ہٹا سکتی ہے تو کراچی کا مشرف تو اس کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

کراچی کا وہ مشرف جو ایسا ماحول پیدا کرتا ہے کہ صنوبر گولیوں سے کٹ کر گر جاتے ہیں۔ مختلف ناموں والے صنوبر۔ مختلف مقامات پر گرائے جانے والے صنوبر! ایک شہر کو سایوں سے محروم کرنے والے مجرم کے خلاف غصہ اس شہر کو آسانی سے بچا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اس غصے کو سیاسی مفاد کے سکے کی طرح استعمال نہیں کیا جائے۔ اور غصے کے لیے بھی ضروری ہے کہ صنوبروں کے قتل پر غم محسوس کیا جائے اور غم تب تک جنم نہیں لے سکتا جب تک کوئی رشتہ نہ ہو۔ اور رشتے کے لیے ضروری تو نہیں کہ ہم اس سے ملیں ہوں۔ کوئی ان دیکھا اور انجانا دوست بھی تو ہو سکتا ہے۔

فیض نے فرمایا ہے کہ

"بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی"

اس امیر شہر کا دل بھلے غریب ہی رہے۔ لیکن اگر وہ ان جانے فرید اور ان دیکھے صنوبر کے لیے درد کا رشتہ قائم کرلیتا ہے تو پھر غم کے اس بیج سے غصے کا درخت بھی پیدا ہو گا۔ وہ درخت جو ان صنوبروں کی حفاظت کرے گا جو بغیر کسی وجہ کے صرف ایک خونخوار پیغام بھیجنے کے لیے قتل کیے جاتے ہیں۔

اور جب وہ مر جاتے ہیں تو کچھ نہیں ہوتا۔ بس ایک گھر کا دروازہ کسی کے انتظار میں کھلا نہیں رہتا اور اس محلے کی ایک مکین کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب رات کو دیر سے

اس سیٹی کی دھن نہیں گونجی گی، جس میں اکثر ایک اداس گیت کے بول صرف اتنا بتاتے تھے کہ:

"مجبور منتظروں کی ملاقاتیں
صرف خوابوں کی سرزمینوں
پر ہی ہوا کرتی ہیں۔۔۔۔!"

صنوبروں کے قتل کیے جانے کے بعد وہ گلیاں خاموش ہو جاتی ہیں، جن گلیوں میں کہیں دور ایف ایم پر چلنے والے اس گیت کے سر گرتے سنبھلتے پہنچتے ہیں کہ:

"سو گیا یہ جہاں، سو گیا آسماں
سو گئی ہیں ساری منزلیں
سو گیا ہے رستہ۔۔۔!"

ایک زرد پھول کی کہانی!

وہ جہاں گھلا، وہ اس کا دیس نہیں تھا۔

وہ تو ایک بیج سی صورت پردیسی پرندے کے پروں سے اس وقت الگ ہو کر جھاڑی میں گرا تھا، جب اس پرندے کو گولی لگی تھی۔ اس لمحے اسے اپنی چوٹ سے زیادہ اس پرندے کا دکھ ہوا تھا، جو ہوا میں ٹانگیں ہلا کر، ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

اور کچھ دیر کے بعد دو آدمی دوڑتے ہوئے آئے۔ ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی اور دوسرے نے اس پرندے کو اٹھالیا۔ جس کے سفید پر سرخ ہو چکے تھے۔ پھر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے کہ "یہ حلال ہے یا حرام؟"

اس کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ تو بس دیکھتا رہا۔ اپنا وہ دوست جس کی چونچ سے خون کے قطرے گر کر ایک اجنبی زمین میں جذب ہوتے رہے۔ وہ بیج دیکھتا رہا اپنا ہمسفر جو کچھ دیر پہلے ایک لمبی پرواز تھا۔ ایک ایسی آواز تھا، جس میں بہت بولیاں تھیں۔ مگر اب تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اور شروع ہو چکا تھی، ایک بیہودہ بحث!

پھر انہوں نے اسے اپنے فتراک میں پھینکا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لیکن جھاڑی کی ایک سوکھی ہوئی ٹہنی پر پڑا بیج اپنے دوست کے خون کے قطرے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ "انسان کتنے برے ہیں"

پھر ایک دن آسمان کا رنگ تبدیل ہو گیا اور بہت زور کی بارش پڑی۔ اس بارش میں نہ صرف مقتول پرندے کے خشک خون کے نشان دھل گئے مگر وہ بیج بھی جھاڑی

کی ٹہنی سے الگ ہو کر نیچے گر گیا اور پہلی بار اس کی ملاقات زمین سے ہوئی۔
زمین نے اس کو اپنی گیلی گود میں لیکر پوچھا کہ "تم کہاں سے آئے ہو؟"
بیج نے اس کو بتایا کہ "وہاں سے جہاں بہت پھول کھلتے ہیں۔" پھر وہ پردیسی بیج اس کو اپنے اس دیس کے بارے میں بتاتا رہا جہاں نیلی جھیلوں پر وہ سفید ہنس اڑتے ہیں، جنہیں مارنا، جرم ہوتا ہے۔ مٹی کی آغوش میں پڑا ہوا وہ بیج بتاتا رہا کہ کس طرح ایک پرندے کے ساتھ یہاں آیا اور اس کا وہ دوست کس طرح گولی کا نشانہ بن گیا۔
مٹی نے ماں جیسی شفقت کے ساتھ اس کو محبت سے سہلایا اور بتایا کہ "یہ وادیِ سندھ کا ایک گاؤں ہے۔ جس کے کھیت میدانِ جنگ کی طرح ہیں۔ جہاں پہلا قتل معصومیت کا ہوتا ہے۔ مگر تم سو جاؤ۔"
بیج سو گیا اور ایک طویل نیند کے بعد جب اس کی آنکھیں کھلی تب وہ ایک انکر بن چکا تھا۔ پھر وہ دھوپ اور چھاؤں میں بڑا ہوتا گیا اور ایک دن وہ ایک خوبصورت زرد پھول بن کر لہرانے لگا۔ ان خاردار جھاڑیوں میں جو اس کا قید بھی تھیں اور تحفظ بھی!
ان جھاڑیوں میں جواں ہوتے ہوئے اس نے ایک چھوٹی سی دنیا جیسے گاؤں کا ہر رنگ دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ جب شبنم سے دھلی ہوئی صبح پھوٹتی تھی تو کہر کے لباس میں اس گاؤں کا منظر وکٹورین دور کے کسی دیوانے مصور کا خواب بن جاتا تھا۔ اور شام تو ویسے بھی بہت خوبصورت ہوتی تھی۔ وہ درختوں کے طویل ہوتے ہوئے سائے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ، مویشیوں کے گلے میں گاتی ہوئی ٹلیاں، اور گھاس کو اپنے سروں پر رکھ کر گھروں کی طرف آنے والی عورتوں کی عجیب مگر بہت دلچسپ باتیں۔ اور وہ بچے جو اپنے کتوں سے دوڑتے ہوئے کھیلتے تھے۔
چڑھتے ہوئے نشے جیسی کیفیت میں اس زرد پھول نے لہرا کر اپنے آپ سے کہا کہ "انسان اتنے بھی برے نہیں ہوتے!"
مٹی نے سنا۔ کچھ سوچا۔ اور مسکرانے لگی!
وہ رات بہت خوبصورت اور خطرناک تھی، جب آسماں سے چاندنی کا آبشار بہہ رہا تھا۔ اس رات کھیتوں کو پانی دینے والے ایک نوجوان کسان کی سیٹی نیند میں ڈوبے

گاؤں کے اوپر گولی کی طرح گزرتی گئی۔ اور اس زرد پھول کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کچھ دیر کے بعد جھاڑی کے قریب ایک سائے کو آتے ہوئے دیکھا۔ ایک سہا ہوا اور تیزی سے سانس لینے والا سایہ، جب اس کے قریب پہنچا تو حیران رہ گیا کہ یہ تو وہی لڑکی تھی جس کے بارے میں گذشتہ دن بھن بھن باتیں اس کے کانوں میں پڑتی رہیں۔ گاؤں کی عورتوں کا خیال تھا کہ "اس لڑکی کا بچنا بہت مشکل ہے" کسی نے پوچھا "کیوں؟" کسی نے جواب دیا کہ "وہ بہت خطرناک خواب دیکھنے لگی ہے"!

رات کے وقت انسان سوتے ہیں اور خواب جاگتے ہیں۔ وہ لڑکی خواب بن کر ایک خواب سے ملنے آئی تھی۔ وہ زرد پھول دو خوابوں کی ملاقات دیکھتا رہا۔ ایک خواب دوسرے خواب کے شانے پر سر رکھ کر کہہ رہا تھا کہ:

"تم اپنی ماں کو ہمارے گھر کب بھیجو گے؟"

دوسرا خواب خاموش تھا۔

پہلے خواب نے پوچھا "چپ کیوں ہو؟"

دوسرے خواب نے کہا "سوچ رہا ہوں"

"کیا سوچ رہے ہو!"

یہ پوچھتے ہوئے پہلے خواب نے اپنا سر اس کے شانے سے اٹھایا اور اس کی ان آنکھوں دیکھنا شروع کیا جو چاندنی میں زہر کے کٹوروں کی طرح چھلک رہیں تھیں۔

"سوچ رہا ہوں کہ ہماری زندگی ایسی کیوں ہے؟" دوسرے خواب نے تلخی کے ساتھ کہا۔

"غصہ مت کرو" پہلے خواب نے کہا "زندگی ہوتی ہی ایسی ہے" اور پھر اس کے شانے سے لگ گیا۔

"وہ کھیت جن کو میں اپنے بچپن سے سینچتا آیا ہوں، وہ میرے کیوں نہیں ہیں؟ جن کو میں سمجھتا ہوں۔ جو مجھے سمجھتے ہیں۔ جس کے وجود کا ہر سایہ مجھ سے جڑا رہا ہے۔ جن سے میں الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اب ان کے لیے مجھے کہا جا رہا ہے کہ انہیں چھوڑ دو!

میں نہیں چھوڑ سکتا۔ نہ تمہیں اور نہ یہ کھیت! تم میرے خاندان کی کھیتی ہو اور ہمارے خاندان کو عزت کے ساتھ جینے کے لیے یہ کھیت چاہئیں۔

لیکن ہم سے کہا جا رہا ہے کہ یہ کھیت ہمارے نہیں۔ ہمارے کھیتوں پر دو وڈیرے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ہر وڈیرے کا دعوی ہے کہ کھیت اس کے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ سب کو چھوڑو۔ ان کھیتوں سے پوچھو کہ یہ کس کے ہیں؟"

پہلے خواب نے نخرے سے اپنے بالوں کی لٹ دوسرے خواب کے گالوں پر مارتے ہوئے کہا کہ "گاؤں والے ٹھیک کہتے ہیں کہ تو پاگل ہے۔ بھلا کبھی کھیت بھی بولتے ہیں؟"

"مجھ سے تو بولتے ہیں۔ مگر اوروں سے نہیں بولتے۔ عورتوں کی طرح! اور یہی تو المیہ ہے کہ یہ خاموش رہتے ہے۔ دنیا کے سامنے یہ گونگے ہو جاتے ہیں۔ کوئی بات نہیں کرتے۔ ایسے نظر آتے ہیں جیسے یہ کمزور ہی نہیں بلکہ مردہ ہیں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں ان کی طاقت کو! جب میں ان میں ہل چلاتا ہوں تب یہ ناراض دوست کی طرح اپنی مٹی کی مٹھی نہیں کھولتے۔ کتنی طاقت لگانی پڑتی ہے مجھے!

جب میں ان میں چاول کی فصل بوتا ہوں تب یہ ہریالی کی صورت اپنے وجود کی طاقت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس وقت یہ کتنے اچھے لگتے ہیں جب ان میں کپاس کی فصل جھاگ والے سمندر کی طرح لہراتی ہوئی گاتی ہے۔

میں ان کی سب زبانیں سمجھتا ہوں۔ جب یہ موسم خزاں میں اداس ہو جاتے ہیں۔ اور سردی میں کہر کی چادر اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔

اور یہ مجھ سے باتیں کرتے ہیں رات کو دیر سے جھینگر کی صورت! مجھ سے پوچھتے ہیں تمہارے متعلق کیا آج تیری دوست نہیں آئی! آج کی رات کس طرح کاٹو گے؟

یہ صرف میرے ہی نہیں بلکہ میری آنے والی نسلوں کے اپنے ہیں۔ مگر حکومت کاغذ دیکھتی ہے۔ کیا زمین سے رشتہ کاغذ بیان کر سکتا ہے؟ جس طرح تمہارے جسم پر میرے ہونٹوں اور ہاتھوں کی تحریر ثابت کر سکتی ہے کہ تم میری ہو، ویسے ہی ان پر چلے ہوئے میرے ہاتھوں کے ہل اور قدموں کے نشانوں کی تحریر سے ثابت ہو سکتا

ہے کہ یہ کھیت کس کے ہیں۔ مگر حکومت اس حقیقی تحریر کو نہیں مانتی۔وہ کہتی ہے کہ کاغذ دکھاؤ!

کیا میری ماں اور میرے باپ یا میرے دادا اور میری دادی کے درمیاں کاغذ کا رشتہ تھا؟

مگر لوگ سات سمندر پار سے آتے ہیں۔ انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ کھیت ان کے ہیں !!۔ کھیت تو ان کے ہیں جو کھیتوں کی زبان سمجھتا ہے۔ یا کھیت ان کی خاموشی کو سمجھ سکتے ہیں۔

جھاڑیوں میں جھولتا ہوا زرد پھول ساری باتیں سنتا رہا!

پھر اس نے وہ دن بھی دیکھا جب انسان خاموش تھے اور بندوقیں بول رہی تھیں۔ ہر گولی گرجدار آواز کے ساتھ یہ دعوی کر رہی تھی کہ یہ کھیت میرے ہیں!

اور کھیت خاموش تھے۔

اور پھر ایک گولی خواب جیسے کسان کے سینے سے پار ہوگئی اور وہ اسی جگہ گر کر تڑپنے لگا، جہاں پردیسی پرندہ گرا تھا۔ مگر وہ پرندہ نہیں، ایک انسان تھا۔ اس کے خون کی پھوار جھاڑی کو بھی رنگین کر گئی۔ اور ایک بوند اس زرد پھول پر بھی گری، جس کو دوسرے دن وہاں سے گزرتی ہوئی خواب جیسی لڑکی نے دیکھا اور رک گئی۔ اس نے جھک کر اس پھول کو توڑا اور اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اس کو چوما۔ اور پھر اس کو مٹھی میں لیکر اپنے گھر روانہ ہوگئی!

اتنی سی مختصر تھی ایک زرد پھول کی داستانِ حیات!

تاریخ کے راستے پر بھٹکتے ہوئے موہن جو دڑو کے معمار!!

اس عورت کا رنگ پابلو نرودا کی سوانح حیات میں بیان کی جانے والی اس عورت جیسا تھا جو اس کے گھر میں ان دنوں کے دوران صفائی کرنے آتی تھی جن دنوں وہ انڈیا میں چلی کے سفیر تھے۔

اس رنگ وروپ والی عورت پر شیخ ایاز نے اپنی یہ مشہور نظم لکھی تھی کہ:

"اندھرا دیش کی سندر ناری
تم کہ کالے پتھر کی اک مورت ہو
کون کہے بدصورت ہو!!؟"

وہ بھی بدصورت نہ تھی۔ مگر اس کا تعلق آندھرا دیش سے بھی نہ تھا۔ وہ اسی دھرتی کی مٹی سے بنی ہوئی مورت تھی اور میلے کپڑوں اور خشکی سے بھرے ہوئے بالوں کے باوجود بھی بہت خوبصورت تھی۔ وہ جو رمضان کے مہینے کو گداگری کا سیزن سمجھتے ہوئے ہر ایک کے سامنے منت کرتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ "اے صاحب! اللہ تم کو حج کروائے۔ بچے بھوکے ہیں۔ آٹا دلوادے" وہ جس کی انگلی تھامے صرف ایک قمیص پہننے والا میلا سا بچہ کھڑا تھا۔ وہ جس کی کمر پر سانولے رنگ کی دس گیارہ ماہ کی بچی اپنا ننھا منا سا انگوٹھا چوس رہی تھی۔ اور اس کے عقب میں ایک بہت بڑا رہائشی اور کاروباری پراجیکٹ تیزی سے آسمان کی طرف بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ اس زیر تعمیر عمارت پر ملک کے مشہور ماڈلز کی تصاویر دیکھنے والوں کی آنکھوں میں خواب بھر رہی تھیں۔

مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ تکمیل کے مراحل تیزی سے طے کرنے والے پراجیکٹ کا بلڈر کون تھا؟ مگر میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ عورت جو بھیک مانگ رہی ہے وہ دراوڑ نسل کی وہ باگڑی عورت ہے جس کو نہیں معلوم کہ وہ کون ہے؟

وہ عورت تھی مگر حقوق نسواں کے لیے متحرک رہنے والے تعارف کے ساتھ ساتھ اس کو صوفی موسیقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا کہ "کی جاناں میں کون؟" بولوں والا کلام چلایا جائے۔ اس نے تو کبھی وہ عارفانہ کلام سنا بھی نہیں ہوگا۔ وہ جو حقیقی طور پر اس کلام کا عکس تھی۔ جس کو کوئی پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے؟ اس کو کہاں جانا ہے؟ وہ جو عورت تھی۔ بیٹی تھی۔ ماں تھی۔ اس کو ہر عورت کی طرح اپنے گھر کا خواب آنکھوں میں سجائے کراچی کی کرچیوں سے بھری ہوئی دھوپ میں چل رہی تھی۔ اس نے کسی سے نہیں کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ پورا وجود چھپانے کو ایک گھر چاہیے۔ اس کو سارے دن کی تھکان اتارنے کو ایک بستر چاہیے۔ اس کو بچوں کی بھوک مٹانے کو ایک کچن چاہیے۔ وہ صرف آنے جانے والے سے رمضان کے مہینے میں خیرات مانگ رہی تھی اور دعا دے رہی تھی کہ اللہ تم کو حج کرائے!!

وہ عورت جس کی گول مٹول اور سرمئی رنگ والے بھالو جیسی بیٹی کا نام "اقرا" تھا۔ وہ عورت جس کو اس نام کا مطلب تو کیا یہ بھی علم نہ تھا کہ یہ ہندو نام ہے یا مسلمان؟ وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ملک میں کس کی حکومت ہے؟ وہ جمہوریت اور آمریت کے درمیاں موجود فرق سے ناآشنا تھی۔ اس کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا ماضی کیا تھا؟ اس کا مستقبل کیسا ہوگا؟ وہ صرف اپنے حال کے حوالے سے پریشان تھی۔ کیوں کہ دھوپ تیز تھی اور رمضان کی وجہ سے لوگ کم تھے اور اس کو اپنے بچوں کی بہت فکر تھی!

وہ عورت جو بہت سارے معاملات سے بے خبر تھی۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ اب سندھ اور سرائیکی بیلٹ میں کام کرنے والے این جی او والے ان کے حوالے سے پراجیکٹ لینے میں مصروف ہیں۔ ان این جی او والوں نے اپنے گورے ڈونرز کو بتایا ہے

کہ پاکستان میں بھی بھارت کی طرح "دلت" نسل کے لوگ موجود ہیں اور بھارت کی طرح ان کے حالات بہت خراب ہیں۔ اس لیے ان کے لیے امداد دیں!! جس وقت پراجیکٹ پائپ لائن میں پہنچے ہیں اس وقت سندھ کے پرنٹ اور سوشل میڈیا پر ایک بحث چل نکلی ہے کہ "کیا یہ لوگ دلت ہیں"

وہ لوگ جن پر خورشید قائم خانی نے "بھٹکتی ہوئی نسلیں" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی اور اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ اس علاقے کے خانہ بدوش ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسپین سے لیکر بدین والے ساحل سمندر تک ان لوگوں میں عجیب مماثلت موجود ہیں۔ ان کی زبانوں کے بہت سارے الفاظ ایک جیسے ہیں۔ تلفظ میں بھی اور معنی میں بھی۔ ان کی رسوم میں بھی ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ وہ لوگ جو ناچتے گاتے چلتے جاتے ہیں۔ مگر وادی سندھ کے مذکورہ لوگ سب کچھ بھول چکے ہیں۔ اپنی مٹی، اپنا مذہب اور اپنا وہ گھر جس کی تلاش میں انسان ساری زندگی بھٹکتا رہتا ہے۔

وہ لوگ جو بہت عجیب ہیں

وہ لوگ جو مسلمان ہیں اور نہ ہندو!

وہ لوگ جن کے پاس کوئی کتاب نہیں!

وہ لوگ جو اپنے مردوں کو جلانے کے بجائے دفناتے ہیں۔

وہ لوگ جو اپنے بچوں پر ہندو نام بھی رکھتے ہیں اور مسلمان بھی۔

وہ لوگ اس سوال پر سوچتے ہی نہیں کہ وہ کیا ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ ان کا کوئی مذہب بھی ہے یا نہیں؟

وہ لوگ جن کے مٹی اور گھانس پھونس سے بنے ہوئے بسیرے ہوتے ہیں۔

وہ لوگ جو اب تک اپنی عبادت گاہ سے محروم ہیں۔

وہ لوگ نہیں جانتے کہ اگر وہ ہندو ہیں تو ان کے دیوتا کون ہے؟

وہ لوگ جن کے پاس پتھر تو کیا کوئی مٹی کی مورت بھی نہیں!

وہ لوگ جن میں سے بہت تھوڑے پڑھ لکھ گئے ہیں اور ان کے پاس ملازمتیں بھی ہیں مگر وہ پھر بھی بہت سہمے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف کے

سائے لہراتے رہتے ہیں۔

وہ لوگ کس کو اچھا اور کس کو برا سمجھیں؟ جب سب ان کے ساتھ ایک سا سلوک کرتے ہیں۔

وہ لوگ جو ہمیں کچھ نہیں کہتے۔ انہوں نے ہم پر کوئی الزام عائد کرتے ہوئے نہیں کہا کہ تم ہمارے مقروض ہو۔ تمہارے علم اور ادب کو یہ قرض ادا کرتے ہوئے بتانا ہوگا کہ ہم کو نہیں؟ نہیں! وہ ایسا کچھ نہیں کہتے۔ وہ خاموش رہتے ہیں اور بہت کچھ سہتے ہیں!!

وہ لوگ جن کو ہر کسی نے استعمال کیا ہے۔ کل پاکستان کی پارلیمانی سیاست میں اپنی نشستیں بڑھانے کے لیے وائن شاپ کے پرمٹ اور سفارشی ٹھیکے لینے والے ہندوؤں نے ان کے پاس آکر ان سے کہا کہ "تم ہمارے ہم مذہب ہو۔ اس لیے اب تم ووٹر لسٹوں میں اپنا مذہب ہندو لکھوانا۔ انہوں نے ان کی بات مان لی اور خود کو ہندو کہلوانے لگے مگر کیا وہ ہندو ہیں؟ کیا سندھ کی ہندو برادری معاشرتی سطح پر ان کو وہ حقوق دیتی ہے جو ہندو ہونے کی وجہ سے انہیں ملنے چاہئیں!

وہ لوگ جن کو کل اپنے مفاد کے ہندو بنایا گیا آج پھر اپنے مفاد کے لیے انہیں دلت بنایا جارہا ہے۔ اس حوالے سے سندھ کے علمی حلقوں میں یہ نام نہاد بحث شروع ہوگئی ہے کہ "کیا یہ لوگ دلت ہیں؟"

وہ لوگ جن کو وادی سندھ کے ہندوؤں نے سیاسی طور پر تو اپنایا مگر سماجی اور مذہبی طور پر نہیں!!

وہ لوگ جو وائٹ کالر ہندو مڈل کلاس کے مندروں میں داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتے!!

وہ لوگ جو کراچی میں دن کو سبزیاں اور شام کو غبارے فروخت کرتے نظر آتے رہتے ہیں!!!

وہ لوگ جن کی ٹین ایج لڑکیاں ایک بچہ کمر پر اور ایک بچہ کوکھ میں لیے لڑکھڑا کر چلتی ہیں!!!

وہ لوگ جن سے آج تک کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ "تم کون ہو؟ اور کہاں سے آئے ہو؟"

وہ لوگ جن کی بھیک مانگنے والی بیٹیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ "تمہارا رنگ گورا اور آنکھیں نیلی کیوں ہیں؟"

وہ لوگ جنہیں کل تک جپسی لکھا جاتا تھا اور آج ان کے سانولے جسموں پر "دلت" نامی مہر لگانے کی کوشش کی جارہی ہے!

وہ لوگ جو نہیں جانتے کہ پہلے انہیں "شڈیول کاسٹ" پھر انہیں "ہندو" اور اب انہیں "دلت" کیوں قرار دیا جارہا ہے؟

وہ لوگ جو مغلوب ہیں اور غالب کے اس شعر جیسی زندگی جیتے ہیں کہ "صبح کرنا شام کالانا ہے جوئے شیر کا"

وہ لوگ جو "کبھی اِس نگر کبھی اس نگر" بھٹکتے رہتے ہیں!

وہ لوگ جنہیں بلدیہ کراچی کے متنازعہ پلاٹوں پر بسایا جاتا ہے!

وہ لوگ جنہیں قبضے کے لیے بٹھایا جاتا ہے اور انگلی کے اشارے سے اٹھایا جاتا ہے!

وہ لوگ جو سیاست اور سماج کے بارے میں نہ کچھ جانتے ہیں اور نہ کچھ سوچتے ہیں!

وہ لوگ وطن میں جلاوطن ہیں!!

وہ لوگ جنہیں "دلت" سے قبل "دراوڑ" قرار دیا گیا!

وہ لوگ جن کے لیے کہا جاتا تھا کہ "وادی سندھ کی تہذیب" ان کے آباؤاجداد نے رکھی!

وہ لوگ جو "موہن جو دڑو" کے معمار تھے!

وہ لوگ جن کو آج سر پٹخنے کے لیے کوئی پتھر کی دیوار میسر نہیں!

وہ لوگ جو شکستہ پرچموں سے بنے ہوئے خیموں میں بستے ہیں!

وہ لوگ جو نہیں جانتے کہ ان کی تاریخ ان سے چھینی گئی ہے۔

وہ لوگ جنہیں یہ امید بھی نہیں کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا جب ان پر اس سچ کو آشکار کیا جائے گا کہ یہ لوگ نہ آج ہندو ہیں اور نہ کل ہندو تھے۔ جس طرح گنگا جمنا کے ساحلوں پر "ہندو" رہتے تھے اسی طرح دریائے سندھ کے کناروں پر "سندھو" بستے تھے۔ وہ لوگ بھارتی ہندوؤں کی طرح ظالم نہ تھے۔ وہ ستی کی رسم ادا کرتے ہوئے بیوہ عورتوں کو مردہ مردوں کے ساتھ نہ جلاتے تھے۔ انہوں نے مذہب کو کبھی استحصال کا ذریعہ نہ بنایا۔ انہوں نے کبھی کسی کو مقدس اشلوک سننے کی سزا نہیں دی۔ ان کے پاس مقدس اشلوک تھے بھی نہیں۔ وہ جنہوں نے مٹی سے دیوی یا دیوتا کا مجسمہ نہیں بنایا۔ انہوں نے پوری دھرتی کو دیوی قرار دیا۔ اپنی مٹی کو ماں اور آسماں کو باپ سمجھنے والے ان لوگوں کی پلکوں پر شب و روز کا بوجھ کب ہلکا ہو گا؟ کب انہیں نجات ملے گی؟ کب ان کو انسانی حقوق حاصل ہونگے؟ کب انہیں ہندو مذہب اور دلت نسل سے دور اپنے حقیقی تاریخی تعارف سے پکارا جائے گا؟؟

وہ لوگ جو اس وقت بھی ہر نگر کی ڈگر پر بھٹک رہے ہیں وہ لوگ اپنے گھر کب جائیں گے؟

لاگا چنری میں داغ

"فیس بک" پر "فالو" کرنے والے لوگوں کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ تھی۔

مگر اس کی نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد ایک سو بھی نہیں تھی۔

سوشل میڈیا کی وہ سپر اسٹار ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک چھوٹے سے قبرستان میں دفن کر دی گئی۔

وہ لڑکی جو عریانی کی علامت تھی۔

وہ لڑکی جو بہت سارے لوگوں کی نظر میں بہت بری تھی۔

وہ لڑکی جس کے بارے میں تھوڑے سے لوگ اب یہ موقف اپنا رہے ہیں کہ "وہ اصل میں ایسی نہیں تھی؟"

اس کی اصل حقیقت کیا تھی؟

یہ سوال بھی اس کے ساتھ دفن ہو چکا ہے۔

وہ لڑکی جس کی کاجل سے بھری ہوئی آنکھوں میں انگنت چمکتے دمکتے خواب تھے۔

ایسی لڑکیوں کے لیے ان کے سفید ریش والد میلی پگڑی کے پلو سے بھیگی پلکیں خشک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میری بیٹی بہت اچھی تھی مگر خوابوں نے خراب کر دی"

کیا اس کو صرف خوابوں نے خراب کیا؟ وہ بڑے بڑے خواب۔ وہ خواب جن کا

ڈنڈھورا ہمارا میڈیا دن رات پیٹتا ہے۔ ہاتھوں سے پھسلتے ہوئے ریشم جیسے خواب۔ قدموں کی آہٹ سے کھلتے ہوئے شاپنگ سینٹرز کے خودکار دروازوں کے خواب۔ شوکیسوں میں بکھرے ہوئے بے ترتیبی والی ترتیب سے سجائے جانے والے خواب۔ برینڈز والی شاپنگ۔ دل لبھاتے لباس۔ امپورٹڈ گھڑی۔ بیش قیمتی بریسلیٹ۔ جدید اور مہنگا ترین موبائل۔ فیشن کی دنیا میں حسرت سے دیکھا جانے والا میک اپ۔ بلیک کلر کی نئی گاڑی۔ پانچ لاکھ کا پرس۔ دو لاکھ کے سینڈلز۔ اور شہرت کو چار چاند لگانے والے اسکینڈلز!!

اور ایسے بہت سارے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ جن سے ایک دیہاتی فوزی قندیل بلوچ بنتی ہے۔ وہ قندیل بلوچ جس کو وہ لڑکیاں حسرت سے دیکھتی ہیں جو ہر قیمت پر اپنے طبقے کی سرحد عبور کرنا چاہتی ہیں۔ وہ لڑکیاں جو سمجھتی ہیں کہ:

"تھوڑا ریشم لگتا ہے
تھوڑا شیشہ لگتا ہے
ہیرے موتی جڑتے ہیں
تھوڑا سونا لگتا ہے"
تب فوزی قندیل بنتی ہے۔

مگر وہ لڑکیاں یہ نہیں جانتی ہیں کہ تھوڑے رشیم، تھوڑے شیشے، تھوڑے ہیرے اور تھوڑے موتیوں کے لیے ایک فوزی کو قندیل بننے کے لیے کتنی قیمت چکانی پڑتی ہے!!

برطانیہ کے دانشور وزیر اعظم چرچل نے کہا ہے کہ "جہاں ساسیج (sausage) بنتے ہیں اگر کوئی وہاں جائے تو وہ ساری زندگی ساسیج نہ کھائے۔ سیاست بھی اس طرح ہوا کرتی ہے" مگر اس حقیقت اور سراب کے درمیان سیاست سے زیادہ شوبز کی وہ دنیا ہوتی ہے جس میں اکثر لڑکیاں پہلے سگریٹ، پھر چرس اور پھر ہیروئن استعمال کرتی ہیں۔ کوکین اور ایکسٹیسی کی حد میں تو کوئی کوئی لڑکی لڑکھڑانے والا قدم رکھ پاتی ہے۔ بہت ساری لڑکیاں "ری ہیبلیٹیشن سینٹرز کے گرم بیڈز پر کھلی اور خالی آنکھوں

سے اپنے اوپر بجلی کا وہ پنکھا چلتا دیکھتی رہتی ہیں جس پر مہینوں کی میل جمی ہوئی ہوتی ہے۔

قندیل تھوڑی حسین اور تھوڑی ذہین تھی۔ وہ اتنی چالاک بھی نہ تھی کہ کسی بہت بڑے شخص کی غیر قانونی بیوی بن جائے۔ اس میں عقل اور صلاحیتوں کا اتنا ہی تیل تھا کہ وہ ملتان کے ایک غریب سے گھر میں ایک سستی سی چارپائی پر سسک کر بجھ جائے۔

اور سمندر کی جھاگ جیسی شہرت کی وجہ سے اس کا کیس ہائی پروفائل بن جائے مگر اس کی لاش اٹھائی جائے ایدھی کے رضاکاروں کے ہاتھوں اور اسے ڈالا جائے اس ایمبولنس میں جو ایک تنگ گلی سے سائرن بجاتے ہوئے نکلتی ہے۔ اس کی شادی کی شہنائیاں تو کسی نے نہیں سنیں لیکن اس کے سائرن کی آواز اب تک میڈیا میں گونج رہی ہے۔ مگر بہت جلد یہ آواز بھی خاموشی کے اس سمندر میں ڈوب جائے گی جس کے ساحل پر انتہائی مقبول اداکاراؤں اور بیحد مشہور ماڈلز کی بدن دریدہ لاش دیکھنے کوئی نہیں جاتا۔

وہ لاش جو بظاہر ایک گاؤں کے ایک چھوٹے سے قبرستان میں مدفون ہے مگر ہم سب تو جانتے ہیں اور نہیں جانتے تو ہم سب کو جاننا چاہیئے کہ اس کی لاش بہت سارے سینوں کے سرد خانوں میں اب تک پڑی ہے۔ وہ لوگ جو اس قندیل کو جلد از جلد بھلانا چاہتے ہیں جو ان کے عیش کدوں میں آدھی رات کو جلتی تھی۔ ان گناہگاروں میں بہت سارے ایسے بھی ہیں جو اس گھر کی مدد کرنا چاہتے ہونگے۔ جہاں باربی کیو اور پزا نہیں آتا۔ جہاں سرسوں کا ساگ پکتا ہے۔ مگر صرف اس ڈر سے ان کا دست سخاوت رکا ہوا ہو گا کہیں وہ اس اسکینڈل میں پھنس نہ جائیں۔ وہ جذباتی مرد جن کی سنجیدہ مزاج خواتین دوست انہیں محبت کے ساتھ سمجھاتی ہیں کہ ”غریب لوگ غلط حد تک لالچی ہوتے ہیں“

ہمارا جدید اور جلتر نگ میڈیا اپنا احساس جرم اس سوال سے چھپانا چاہتا ہے کہ ”قندیل کو کس نے بجھایا؟“ جبکہ اس سے اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ ”فوزی کو

قندیل بنا کر کس نے جلایا؟"

وہ کون تھے؟ جو ایک پنڈ کی کڑی کو شوبز کے جھوٹے آسمان کا اسٹار بنانے کے لیے اس سے سارے رشتے چھین لیے۔ وہ لڑکی جو صرف ایک بیٹی اور ایک بہن نہیں ایک ماں بھی تھی۔

وہ لڑکی جس کو صرف شہرت اور دنیا کے سامنے اپنا نرم امیج پیش کرنے کے لیے پاکستان جیسی ریاست نے اپنی بیٹی کے طور پر قبول کیا ہے اور اس کے قتل کے مقدمے میں "غیرت کی دفعہ" بھی درج کی ہے۔ وہ ریاست جو اس کیس میں ایک بھائی کو اپنی بہن قتل کرنے کے جرم میں قید کر کے اس کے رمانڈ میں توسیع کر چکی ہے۔ کیا یہ ریاست اس کیس میں ان سارے کرداروں کو شامل تفتیش کرے گی جنہوں نے گاؤں کی شبنم گوری کو شہر کی شعلہ چھوری میں تبدیل کرنے میں اپنا کردار ادا کیا!!!؟

مانا کہ اس کو خوابوں نے خون کیا مگر وہ خواب کس نے دکھلائے؟

کیا ہمارا میڈیا اس خون ناحق کے چند چھینٹے اپنے مہنگے دامن پر پڑنے دے گا؟

وہ لڑکی جو "غیرت کے نام" پر قتل ہوئی۔ کیا کوئی اس لڑکی کا سفر تفصیل سے بیان کرے گا؟

کیا کوئی بتائے گا کہ اس راہ پر اس کو کس نے گھسیٹا جس راہ پر اس کے جسم میں پیوست ہوئے تھوڑے شیشے اور جن کے باعث لگنے والے زخموں کی سلائی ہوئی تھوڑے ریشم سے اور بعد میں ہیرے موتی بھی آئے مگر کلیوں کا چمن بننے کے اس شرمناک مرحلے میں کون کون شامل تھا؟

ہم جانتے ہیں کہ اویس شاہ کو اغوا کرنے اور اغوا کرانے والوں کے نام تو منظر عام پر آ بھی سکتے ہیں مگر قندیل کے قتل میں ملوث ان سارے ملزمان کے نام صیغہ راز میں رہیں گے، جن سب نے ایک لڑکی کے ساتھ نشے میں وہ سارے وعدے کیے جو کبھی پورے نہیں ہوتے۔

قندیل کی لاش اب تک میڈیا اسکرین پر موجود ہے مگر وہ اس لاش کا منظر ویسا ہی ہے جیسا منظر یونان کے ایک انقلابی ناول نگار نے ان الفظ میں پیش کیا تھا کہ "کونج

مری پڑی ہے۔ اس کے پر دھرتی پر ایسے کھلے ہوئے ہیں جیسے وہ اپنی نامہربان ماں کو گلے سے لگا رہی ہو"

قندیل کی حقیقت صرف ایک لاش نہیں۔ قندیل ایک سفر بھی ہے۔ کانٹوں پر سفر !!!

اس کے بے لباس بدن کو تو میڈیا نے بہت اچھالا مگر کسی نے دیکھے اس کے وہ پیر جس میں بہت سے کانٹے چبھے ہوئے تھے؟

ہر کوئی جانتا ہے اس کی تمنائیں۔ سب کو خبر ہے کہ وہ "بگ باس" میں جانے والی تھی۔ مگر کس کو پتہ ہے کہ وہ واپس گھر آنا چاہتی تھی۔ وہ جو اپنی ماں کیساتھ پیکیج والے نمبر سے بہت دیر تک باتیں کرتی تھی، اس وقت جس وقت ساری محفل سو جاتی تھی۔ اس وقت ایک گاؤں کے کچے گھر میں کے آنگن میں گرم ہوا میں لیٹی ہوئی ایک ماں اپنی بیٹی سے کہتی تھی "فوزی لوٹ آؤ۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا" اور فوزی کہتی تھی "نہیں ماں! بہت مشکل ہے۔ اب سب کچھ بگڑ چکا ہے"

وہ لڑکی اب قبر میں سو رہی ہے جو اپنے ماں کو سسک سسک کر سمجھاتی تھی کہ "اب تیری بیٹی بہت بگڑ چکی ہے۔ تیرے ہاتھوں سے پکے ہوئے سرسوں کے ساگ میں بہت لذت ہے مگر اب میں وہ کھانا ہر روز نہیں کھا سکتی۔ تیری بیٹی کو چکن کباب اور مٹن کڑھائی کی لت لگ چکی ہے۔ اب وہ گرمیوں میں بھی اے سی والے کمرے میں کمبل اوڑھ کر سونے کی عادی ہو چکی ہے اور صرف میں نہیں سب بدل چکے ہیں۔ سب کو ایزی منی کا انتظار رہتا ہے اور کون قبول کرے گا تمہاری اس بیٹی کو جس کے وڈیوز ہر موبائل فون پر چل رہی ہیں"

وہ لڑکی جو سوشل میڈیا والے سمندر کی ایک لوٹتی ہوئی لہر ہے۔ تھلی ماندی۔ میلی اور مقتول!!

جیسی بھی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اب عورت مشرقی معاشروں میں بھی ابھر رہی ہے۔ ایسے ماحول میں اس بات کی بیحد ضرورت ہے کہ نوجوان لڑکیوں کو شوبز کی شیطانی دنیا کے بارے میں بتایا جائے۔ انہیں اس حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ اس

جھاگ اڑاتے پانی میں امیر لڑکیاں بھی اپنی عزت کا تحفظ نہیں کر پاتیں۔ اس دنیا میں غریب لڑکیاں تو عیاشی کا ایندھن بن جاتی ہیں۔

وہ لڑکیاں جو یہ نہیں جانتیں کہ سوشل میڈیا ایک سفاک سراب ہے۔ شیشے کی بوتل والا منرل واٹر پیاس گھٹاتا نہیں بڑھاتا ہے۔

وہ لڑکیاں جو بالوں میں نیم کی نمبولیاں ڈالتی ہیں انہیں جب امپورٹڈ شیمپوز کے لیے شرم کے کارڈ کا آخری اماؤنٹ بھی ''ڈرا'' کرنا پڑتا ہے تب وہ اپنے کرائے کے فلیٹس میں ''چھٹی والے دنوں کے دوراں'' اس گانے کو بار بار سنتی ہیں کہ:

''لاگا چنری میں داغ

مٹاؤں کیسے؟

گھر جاؤں کیسے؟''

اس کشمکش کے دوراں جب وہ ٹوٹے بکھرے خاندان کے ساتھ عید منانے کے لیے ملتان جاتی ہیں تو واپس آکر ایک اور اسکینڈل بنانے کے بجائے ایک خبر بن جاتی ہیں۔

یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟

بنگلہ بھاشا کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا مشہور قول ہے کہ "جنم لینے والا ہر بچہ اپنے ساتھ یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا ابھی تک انسان ذات سے مایوس نہیں ہوا"

مگر ترکی کے ساحلوں سے لیکر بمباری کے زد میں آنے والے حلب کی بستیوں میں مرنے والے شامی بچے جب خدا کی طرف واپس بھیج دیے جاتے ہیں تب ان کے پاس کون سا پیغام ہوتا ہے؟

وہ معصوم بچے جن پر بم برسائے جاتے ہیں۔ وہ معصوم بچے جن کے گھر بارودی بارش میں گر جاتے ہیں اور جو کئی گھنٹوں کے بعد ملبوں سے نکالے جاتے ہیں۔ وہ بچے جو خون میں خاک میں لتھڑے ہوئے اور خون میں نہلائے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بچے جن کی نبض بہت تیز اور جن کی سانس بہت آہستہ چلتی ہے۔ وہ جو اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے اس دنیا کو آخری بار دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بچے وہ معصوم اور کمسن بچے جو نہیں جانتے کہ جنگ کیا ہوتی ہے؟ لوگ کیوں لڑتے ہیں؟ جو ذاتی مفادات سے بلند اور سیاسی مفادات سے پاک ہوتے ہیں۔ ان معصوم بچوں کو جب قبر جیسے گھروں سے کھود کر نکالا جاتا ہے تب کسی کے ہاتھ میں بھالو ہوتا ہے اور کسی کی جیب میں ٹافی!! اور جنگی محاذوں پر فوٹو گرافی کرنے والے پروفیشنل فوٹو گرافران کے ادھڑے ہوئے جسموں کو کیمرا میں محفوظ کرتے ہوئے روتے ہیں۔ اور بمباری میں تباہ ہونے والے ہوٹلوں میں واپس جا کر ان تصاویر کو لیپ ٹاپ میں محفوظ کرتے ہوئے بہت جذباتی ہو جاتے ہیں اور رات کو سونے کے بعد خواب دیکھتے

ہیں کہ بہت سارے چھوٹے بچے ستاروں سے سجے ہوئے نیلے عرش کے فرش پر خون والے اپنے چھوٹے پیروں کے نشاں چھوڑتے ہوئے خدا کی بارگاہ میں غمگین چہروں سے داخل ہورہے ہیں اور وہ ان کے آخری سفر کی تصویر بھی بناتے ہیں مگر وہ تصویر دنیا کے کسی کیمرا میں محفوظ نہیں ہو پاتی اور رہ جاتی ہے ایک پریس فوٹوگرافر کی بھیگی ہوئی آنکھ میں!!

یہ بچے جنہیں دنیا کی مائیں اس لیے جنم دیتی ہیں کہ وہ ہنسیں، کھیلیں، کودیں، بھاگیں ور بہت آگے تک جائیں مگر جب انہیں قتل کیا جاتا ہے۔ جب ان سے جینے کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ جب انہیں سفاکی کے ساتھ چھوٹے سے لاشوں میں تبدیل کیا جاتا ہے تب وہ اپنی ماں کی طرف نہیں لوٹ پاتے۔ وہ جنہیں اندھیرے میدانوں اور ویران قبرستانوں میں دفن کیا جاتا ہے۔ جن کی قبروں پر کتبے بھی نصب نہیں کیے جاتے اور جن کے حوالے سے کسی اخبار، کسی جریدے، کسی ویب سائٹ، کسی کتاب اور کس دیوار پر کوئی کہانی نہیں لکھی جاتی۔ وہ بچے بہت ہیں۔ وہ گمنام اور معصوم شہید انگنت ہیں۔ شام کے علاقے حلب کا علی اور عمران تو صرف ان بچوں کے نمائندے ہیں۔ وہ بچے بہت زیادہ ہیں۔ ایک اخبار کے سارے الفاظ سے بھی زیادہ!!

وہ بچے صرف شہید گلابوں کی دھرتی تک محدود نہیں۔ وہ شہید بچوں کا وطن صرف وہ شام نہیں جس کے حساس شاعر نزار قابانی نے لکھا تھا کہ "انہوں نے میرے وطن کے ان بچوں کو قتل کیا جن کے ہاتھ شبنم کے قطروں سے بھی چھوٹے تھے" مگر وہ بچے صرف بلقیس الراوی کی سرزمین تک محدود نہیں۔ ان معصوم، مظلوم اور مقتول بچوں کی ایک الگ دنیا ہے۔ وہ دنیا جو سرحدوں سے ماورا ہے۔ اس دنیا میں جو بھی زبانیں بولی جاتی ہیں ان زبانوں میں پیار ہوتا ہے۔ محبت ہوتی ہے۔ وہ مٹھاس ہوتی ہے جس سے ہاتھ چپچپے ہوئے جاتے ہیں۔ وہ بچے صرف عراق اور شام کے درمیاں درد کے فاصلوں کی صورت نہیں۔ وہ بچے وہاں بھی ہیں جہاں بہت برس قبل ناظم حکمت نے ایک نظم لکھی تھی۔ وہ نظم جو جاپان میں ایٹم بم کی وجہ سے جل جانے والی بچی کے بارے میں تھی۔ وہ جاپانی گڑیا جو ایک پوری دنیا کو بتانا چاہتی ہے کہ اس کے شہر پر بم کیسے گرا؟ کس طرح دھرتی سے اٹھتے ہوئے شعلے آسماں تک پہنچے؟ کس طرح ان شعلوں میں اس کا گھر بھی گھر گیا؟ وہ بچی تفصیل کے

ساتھ بتاتی ہے کہ کس طرح آگ اس کے کمرے میں داخل ہوئی؟ کس طرح آگ نے اس کے براؤن بالوں کو لپیٹ میں لیا؟ اس کا فراک کس طرح جل گیا اور ایک پل میں وہ خود کس طرح خاک کی مٹھی بن گئی۔ وہ جاپانی لڑکی جس نے تفصیل کے ساتھ ساری دنیا کی آنٹیوں اور انکلز کو بتایا ہے کہ بارودی آگ میں جل جانے والے بچے ٹافیاں اور چاکلیٹ نہیں کھا سکتے۔ مجھے تو اس حق سے محروم کر دیا گیا ہے مگر میرے دوستوں کے اس حق کے تحفظ کے لیے آگے آئیں اور اس دنیا میں امن کا پرچم پھیلائیں اور دنیا کو ایسا بنائیں جس میں ہر بچہ ٹافی اور چاکلیٹ کھا سکے!!

یہ ترک شاعر کی تحریر ہے۔ یہ تحریر پڑھنے کے بعد جو بھی شخص ہیروشیما، ناگاساکی پر گرائے جانے والے ایٹم بم کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے گہرائی میں جائے گا وہ اس واقعے کے حوالے سے یہ المیاتی حقائق جان پائے گا کہ ایک پل میں ایک لاکھ چالیس ہزار انسانوں کو لقمہ اجل بنانے والے جس پائلٹ نے اپنے جہاز سے ایک ہنستے بستے شہر پر بم گرایا تھا اس جہاز کا نام اس نے اپنی ماں کے نام پر "اینولا گے" رکھا تھا اور یہ بات بھی ہماری دکھتی ہوئی یاداشت کا حصہ ہونی چاہیے کہ امریکہ نے ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم کا کوڈ نیم رکھا تھا "چھوٹا بچہ"

ایک بھیانک بم چھوٹا بچہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ بم جس کی وجہ سے ہزاروں بچے اپنے کھلونوں اور کتابوں کے ساتھ جل کر خاک ہوئے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اب تک اس دنیا نے بچوں کی ہلاکت کا سلسلہ ختم نہیں کیا۔ اب تک ان بستیوں پر بم برسائے جاتے ہیں جہاں بچے بھی بستے ہیں۔ وہ علاقے جہاں بدامنی کی وجہ سے لوگ نقل مکانی کرتے ہیں اور بہت بڑے سمندروں میں چھوٹی سی کشتی الٹ جاتی ہے اور ایک بچہ ساحل سمندر پر لاش کی صورت پایا جاتا ہے اور اس مردہ بچے کی تصویر سوئی ہوئی انسانیت کو جگانے کا سبب بننے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اس وقت جس وقت شام کی آسماں سے بم گرتے ہیں اور سینکڑوں بچے اپنے گھروں میں دفن ہو جاتے ہیں اور ملبے سے نکالا جاتا ہے عمران دقنیش کو!!

وہ عمران دقنیش جو خاک اور خون میں لتھڑا ہوا ہے اور اس کی تصویر ایک بار پھر عالمی

میڈیا کی معرفت عالمی ضمیر کو جگانے کی مہم کا حصہ بن جاتی ہے۔ مگر معصوم بچوں کی معصوم کوششوں کو ناکام بنانے والے حکمران اور ان کے چہیتے جنرلز ایک بار پھر معصومیت پر حملہ آور ہوتے ہیں اور پھر سے معصوم بچے اس طرح جل کر مرنے لگتے ہیں جس طرح چیری کے درختوں والے جنگل میں آگ لگ جائے اور بہت ساری تتلیاں اپنے رنگوں کے ساتھ آگ کی چنگاریوں میں تبدیل ہو جائیں۔ حلب میں بھی ایسا ہوا۔ حلب جہاں بمباری میں زخمی ہونے والا شامی بچہ تو اپنے ملک اور دنیا کے معصوم بچوں کو بچانے کے لیے بچ گیا مگر اس حملے میں زخمی ہونے والا اس کا بڑا بھائی نہ بچ سکا اور گذشتہ روز عالمی میڈیا میں اس خبر کو نم آنکھوں کے ساتھ لکھا اور پڑھا گیا کہ "دنیا کو ہلانے والے شامی بچے کا زخمی بھائی چل بسا"

بچوں کی اس دنیا کو غیر محفوظ مقام کے طور پر دیکھنے والی مصری ادیبہ لیلی بغلقی نے لکھا تھا کہ "میں بچوں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ اس لیے میں نے اپنی کوکھ سے کسی بچے کو جنم نہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیوں میں میں نہیں چاہتی کہ میرا بچہ اس دنیا میں آئے جو دنیا بہت غیر محفوظ ہے" لیلی بغلقی جیسی عرب دنیا کی ماڈرن عورت تو اپنی مرضی سے ماں نہ بننے کی اذیت افورڈ کر سکتی ہے مگر شام کی وہ ماں اتنا بڑا بغاوت بھرا انٹلیکچوئل فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اس نے اپنے غیر محفوظ ملک میں بچوں کو جنم دیا اور اس کے ملک میں جاری جنگ کی وجہ سے اس کا ایک بچہ خاک میں دفن ہونے والا پھول بن گیا اور اس کا دوسرا بچہ ایک زخمی تصویر بن کر جنگ کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔

کیا وہ جنگ کے خلاف جنگ جیت پائے گا؟

وہ بچہ جو اپنے بڑے بھائی علی کو نہیں بچا پایا! کیا وہ اس دنیا کے بہت سارے بچوں کو بچا پائے گا؟ کیا اس کی تصویر کو دیکھ کر جنگی پائلٹ بموں سے بھرے ہوئے جہاز اڑانا چھوڑ دینگے؟

کیا اس کی تصویر سے امن کا ایک نیا تصور جنم لے گا؟

کیا یہ دھرتی امن کا گھوارہ بن پائے گی؟

کیا وقت انصاف کرے گا؟

کیا تاریخ اپنے زخمی ہونٹوں سے مسکرائے گی؟

آخر جنگ کی وجہ سے اپنے وطن میں جلاوطن بن جانے والے خاندانوں کی

خوبصورت اور خوب سیرت مائیں اپنے بیمار بچوں کو پناہ گزیں کیمپوں میں کب تک لوریاں سنا کر سلانے کی کوشش کرتی رہیں گی؟

شام سے تعلق رکھنے والے بچے جو سمندر کے ساحلوں پر سراپا فریاد بن جاتے ہیں یا اپنے گھروں کے ملبوں سے خاک اور خون کے پھول بن کر دریافت ہوتے ہیں وہ دنیا میں امن قائم کرانے کی کوشش میں تو ناکام ہی رہتے ہیں مگر وہ ہمیں اردو کی یہ بھولی بسری نظم یاد دلانے میں کامیاب ضرور ہو جاتے ہیں، جس نظم کو ایک اداس لوری کی صورت لکھتے ہوئے ابن انشا نے یہ سوالیہ منظر قلمبند کیا تھا کہ:

"یہ بچہ کیسا بچہ ہے
جو ریت پہ تنہا بیٹھا ہے
نہ اس کے پیٹ میں روٹی ہے
نہ اس کے تن پر کپڑا ہے
نہ اس کے سر پر ٹوپی ہے
نہ اس کے پیر میں جوتا ہے
نہ اس کے پاس کھلونے ہیں
کوئی بھالو ہے کوئی گھوڑا ہے

نہ اس کا جی بہلانے کو
کوئی لوری ہے کوئی جھولا ہے
نہ اس کے جیب میں ڈھیلا ہے
نہ اس کے ہاتھ میں پیسہ ہے
نہ اس کے امی ابو ہیں
نہ اس کی آپا خالہ ہے

یہ سارے جگ میں تنہا ہے
یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟

میرا پیا گھر آیا

سینہ بہ سینہ سفر کرنے والی صوفی کہانیوں کا کہنا ہے کہ "جب بابا بلھے شاہ کو بتایا گیا کہ قلندر لال شہباز کے خلیفہ خاص حضرت عنایت شاہ بخاری ان کے مہمان بننے والے ہیں تب ان پر وجد طاری ہو گیا"

سندھ اور سرائیکی بیلٹ کے صوفی کہتے ہیں کہ ابھی انہوں نے سیہون سے سفر شروع کیا تھا۔ ابھی راستے کی دھول دم سادھے ان کے پیروں کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی تو چولستان بہت دور تھا مگر ریگستان کی ریت ہوا کے ساتھ ہاتھ ملا کر رقص کرنے لگی تھی۔ اور موسم نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ ابھی تو پپیہے ساون کے بادلوں کو بلا رہے تھے اور مدھو مکھی گہری نیند میں غلطان تھی۔ دریائے سندھ سوئے ہوئے ساز کی طرح سمندر کی طرف بہتا جا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سینوں سے محبت بھرا سانس ٹکرایا اور دل کے درخت کی سوکھی پتیاں جھڑ گئیں اور امڈ آئیں وہ کلیاں جن کے نرم ہونٹوں پر بابا بلھے شاہ کا یہ گیت تھا مچل رہا تھا کہ:

"میرا پیا گھر آیا
میرا پیا گھر آیا
ہن گھڑیال دیو نکال نی!
میرا پیا گھر آیا"

یہ ایک عجیب محبت تھی۔ جو پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں والے عمر رسیدہ فقیر

ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ وہ عقیدت کی لہر جو عشق کے کناروں سے ٹکراتی تھی۔ اس کو نثر میں بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے صوفی فقیر یا تو خاموش رہتے تھے یا گیت گاتے تھے۔ کیوں کہ یہ محبت صرف موسیقی کے ذریعے اپنا اظہار کر پاتی تھی۔
اور اس محبت میں سب سے اہم اور بنیادی بات تھی انتظار!
موسمیں گذر جاتیں! بادل بھر آتے اور اپنے آپ کو چولستان کی سسکتی ہوئی صحرا پر خالی کر جاتے! گرمیاں جاتیں اور سردیاں آجاتیں! ننھے پودے قد آور درخت بن جاتے مگر انتظار ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا!!
کہتے ہیں کہ اس عشق کی ریاضت میں عاشق کے سر کی پلکیں سفید ہو جاتی تھیں!
وہ عمر کا آخری حصہ جس میں پہلو میں پڑا منظر بھی دھندھلا دھندھلا سا ہو جاتا ہے۔ جس میں مرید اپنے مرشد کے مقبرے کی کلس بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اس لمحے جب ان کے دل دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ تو ان فاقہ کش فقیروں میں کائنات کی تمام توانائی سمٹ آتی ہے۔ ان کے نزار بدن میں جوانی کا جادو مست ہو کر رقص کرنے لگتا ہے۔
اور اس وقت، اس لمحے، اس پل پیار کا پہلا اور آخری گیت جنم لیتا ہے۔
ایسے ہی ایک گیت کا جنم ہوا اس بابا بلھے شاہ کے سونے اور سنسان دل میں!
کہتے ہیں کہ: سانت کی مدھم موسیقی میں سوئے ہوئے ان کے من میں ایک انہد باجا بجا۔
اور ان کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر یہ صدا گونج اٹھی کہ:
"ہن پیالہ دیوو کلال نی"
کیوں؟
کیوں کہ
"میرا پیا گھر آیا"
اور پیا کو ملانے والے رراستوں کا کوئی تذکرہ نہیں۔ سرکاری سہولیات تو اس ملن میں پلیدی کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ ملاقات اس دنیا والوں کی دَین نہیں۔ یہ

ملاپ تو مقدر بنانے والے کیا ہے۔ یہ تحفہ آیا نہیں۔ اترا ہے!

بلھے شاہ خود گواہی دیتے ہیں کہ:

"پیا گھر آیا

سانوں اللہ ملایا"

کیا تین سو برس قبل محبت کے اس مقدس گیت کو تخلیق کرتے ہوئے پنجاب کے روحانی رہبر بابا بلھے شاہ کو اس بات کا شائبہ بھی ہو گا کہ یہ گیت صدیوں کا سفر طعہ کرنے کے بعد کمرشل گھنگھروؤں کی گونج میں گونجے گا اور ایک رات کے لاکھوں روپے لینے والی رقاصائیں محبت کے اس مقدس گیت پر بھنگڑے ڈالیں گی۔

مگر اس گیت کی شان تو دیکھو!

اس کے معصوم حسن کو ایک خراش تک نہیں آئی۔

اس گیت کو مال و دولت والی دنیا نے بہت دہرایا اور گندے ہاتھوں سے اس گیت کو بہت مسلا گیا مگر پھر اس گیت کا کوئی بھی مصرحہ میلا نہیں ہوا۔

اور صرف بارڈر کے اِس پار کی بات نہیں۔

اس پار بھی بالی ووڈ کی بیوپاری اسٹیج پر مادھوری ڈکشٹ نے اپنے نخروں کو آخری نہج تک پہنچانے کی کوشش کی مگر پھر بھی یہ گیت گناہوں کی گنگا سے میں مقدس لہر کی طرح محور قص رہا کہ:

"میرا پیا گھر آیا

میرا پیا گھر آیا!"

وہ پیا آخر آہی گیا جس کے لیے فضا میں ایک اکتاہی ہوئی جنجناہٹ تھی۔ ایک بور سی ساعت سسکتی رہی۔ اور پھر آواز آئی۔ اور پورا جنگل منگل ہو گیا!!

محبت کا یہ مقدس گیت منتظر تھا کہ وہ آئے اور سونے درختوں کی ہر کونپل گائے:

"میرا پیا گھر آیا"

کوئی آیا اور ایسے نہیں آیا کہ کسی نے تڑپ کر پوچھا:

"اماں وہ آیا؟"

اور اس کو جواب ملا
"نہیں یہ پردہ میری پیاری
ہوا نے لہرایا"
ایسا سوال تھا نہ جواب!
ایک سچی آہٹ کے ساتھ وہ آیا۔
اور نہ جانے کے لیے آیا۔
کیوں کہ:
"ہن وچھڑن ہویا محال نی
ہو! لال نی
میرا پیا گھر آیا"

یہ وہ گیت ہے جو صدیوں سے دل کی دھڑکن پر بجتا رہا۔ وقت کے ساتھ ساز بدلتے رہے۔ سازوں کے تار تبدیل ہوتے رہے۔ مشرقی موسیقی میں مقامی ثقافتوں کر رنگ ملتے رہے۔ اور جب سائنس نے سمندروں میں راستے بنائے تب مغربی موسیقی بھی مشرقی موسیقی سے ہم آغوش ہوئی۔ ترنم کی نئی دنیا تخلیق ہوئی۔ مگر وقت کے ساتھ آنے والی ہر تبدیلی سے جو گیت بلند رہے ان گیتوں میں ایک گیت بابا بلھے شاہ کے دل سے نکلنے والی وہ صدا تھا جو بار بار پکار کر کہتی ہے کہ:
"میرا پیا گھر آیا"

اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اکثر صوفی گیت فراق میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان گیتوں میں درد کی دھیمی آنچ سلگتی رہتی ہے۔ وہ گیت جدائی میں برسنے والے بادلوں جیسی آنکھوں والے ہوتے ہیں۔ وہ گیت غمگین ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں دوری کا درد ہوتا ہے۔ وہ گیت اپنے پیار کو پوری شدت سے پاس بلاتے ہیں۔ اس لیے گیتوں کی پلکیں بھیگی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ گیت ایسے ہوتے ہیں جیسے بارش کے قطروں سے بھاری ہونے والے درخت! جو ہوا کے جھونکے پر سفید قطروں کے موتی برساتے ہیں۔ ان درختوں کی شاخوں پر چھوٹا سا پنچھی بھی بیٹھے تو پتوں سے پانی گرنے لگتا ہے۔

ایسی کیفت ہوتی ہے ان صوفی گیتوں کی جو درگاہوں پر دھمالوں میں گونجتے سنے جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں کوئی کوئی ایسا گیت ہوتا ہے جس کی آنکھیں نہ روکھی سوکھی ہوتی ہیں اور نہ جس کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے سجے ہوتے ہیں۔ چمکتی ہوئی آنکھوں والا خوشی کا گیت صوفی موسیقی میں شاذرونادر ہوا کرتا ہے اور یہ گیت ایسا ہے۔ یہ غم کا نہیں خوشی کا گیت ہے۔ یہ گیت اعلان ہے کہ اب فراق کا موسم ختم ہوا۔ اب وصال کی رت شروع ہوئی۔

خوشی کا یہ گیت اس دھرتی کے مظلوم اور محکوم انسانوں کے مقدر میں کبھی کبھی آتا ہے۔ وہ لوگ جن کے سامنے ہمیشہ ”دکھاں دی روٹی“ اور ”سولاں دا سالن“ رکھا جاتا ہے اور وہ ہر نوالہ زہر کی طرح گلے کے نیچے اتارتے ہیں، ان انسانوں پر جب قدرت مہربان ہوتی ہے۔ جب ان کے سوکھے وجود پر مسرت کی بارش امڈتی ہے اور جب ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگتے ہیں۔ جب انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے خواب سچ کے سوہے لباس پہن کر لہک رہے ہیں تب ان کے ہونٹوں پر کھل اٹھتا ہے بابا بلھے شاہ کا یہ گیت ”شکر کا اظہار“ بن کر۔ یہ گیت جو امیدوں اور آرزوؤں کی تکمیل کا اعلان ہے۔ مگر اس حاصلات کے ہونٹوں پر پھر بھی ایک دعا ہے کہ کہیں خوشی کے اس منظر کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ یہ منظوم شکریہ اور موسیقی سے بھرا ہوا محبت کا اظہار اس دیس کے ثقافت کی شناخت ہے۔ جب کسی بزرگ، کسی درویش کی درگاہ پر عرس کی تقریب ہوتی ہے تب سیاہ اور نارنجی لباس میں ملبوس صوفی فقیر اپنے اکتارے بجا کر گاتے ہیں:

”میرا پیا گھر آیا“

اور یہی صدا دیہاتوں میں اس وقت آسمان کی طرف پنجرے سے اچانک آزاد ہونے والے پرندے کی طرح اڑنے لگتی ہے جب گھاس پھونس کی دیواروں سے بنے ہوئے گھروں کے آنگنوں میں خوشیوں کے سائے لہراتے ہیں۔

یہ عوامی گیت مڈل کلاس اور اپر مڈل کلاس طبقات میں اس وقت مقبول ہوا جب عالمی شہرت حاصل کرنے کے بعد نصرت فتح علی خان نے اپنے مخصوص انداز میں بابا

بلھے شاہ کے اس گیت کو مسرت کا ترانہ بنا دیا۔ یہ گیت اب ہر خوشی کے محفل میں لازمی بن گیا ہے۔

اس گیت کے حوالے سے لکھے ہوئے کالم کو ”گیلانی ہاؤس“ کا موڑ دیتے ہوئے عجیب تو محسوس ہو رہا ہے مگر ہر خاندان کو خوشیاں منانے کا حق حاصل ہے۔ تین برس کے بعد جب ایک شخص اپنے گھر واپس آتا ہے تو ان سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں اس گیت کی دھن ضرور بجے گی۔

گیلانی خاندان کو علی حیدر کی واپسی مبارک ہو۔ مگر ایسی مبارک باد پر ان غریب خاندانوں کا بھی حق ہے جن کے افراد پرویز مشرف کے دور میں گھروں سے اٹھائے گئے اور وہ اب تک واپس نہیں لوٹے۔

انتظار میں سوکھی ہوئی ان آنکھوں کو بھی حق ہے کہ ان میں مسرت کا موتی چمکے!
ان خاموش آنگنوں کے مقدر میں بھی موسیقی کا وہ پل کیوں نہیں آئے؟
جب کمزوری کے باعث پیلے ہاتھ تالی بجائیں!
اور خشک ہونٹ خوشی کا یہی گیت گائیں:
”میرا پیا گھر آیا
سانوں اللہ ملایا
ہن گھڑیاں دیو ونکال نی“

پچھلی کرسمس پر!!

وہ آرٹسٹ اب اس دنیا میں نہیں رہا جس دنیا میں اس کا وہ گیت بہت سارے برسوں سے بجتا رہا ہے اور بہت سارے برسوں تک بجتا رہے گا۔

جارج مائیکل کی یاد میں کتنی پلکوں سے آنسو چھلکے ہونگے۔ وہ اس نسل کا نمائندہ گلوکار تھا جو اب جاتی ہوئی جوانی کو اداس آنکھوں سے دیکھتی ہے۔

وہ نسل جب تک جئے گی، تب تک جارج مائیکل کے گیت اس کی سماعتوں میں سر بکھیرتے رہیں گے۔

کیا محبت کے جذبے کو زمان اور مکان کے دائرے میں قید کیا جاسکتا ہے؟

جب بھی کرسمس کی رات ستاروں کے کارواں دھرتی پر لائے گی۔ جب بھی کسی ہاتھ سے شیمپئن کا گلاس چھوٹے گا۔ جب بھی چاندی کے صلیب سے سجے ہوئے سینے کے پیچھے کوئی دل ٹوٹے گا۔ جب بھی سردرات برف کی سفید چادر پہن کر غمگین عورت کی طرح سو جائے گی۔ تب امریکہ سے لیکر انگلینڈ تک پہلے پیار کی پہلی بیوفائی کا شکار ہونے والی ہر لڑکی وہ گیت گائے گی!!

وہ گیت جس کے بکھرے بولوں کو جارج مائیکل نے اپنے سروں میں سمیٹتے ہوئے پوری دنیا کو بتایا تھا کہ ”وقت ہر درد کی دوا نہیں ہوتا“

Timecannevermend

Carelesswhisperofagoodfriend

جارج مائیکل نے اپنے اس گیت میں کسی باغی بنجارے کی طرح کہا تھا کہ:
"تکلیف میں کوئی راحت نہیں ہوتی"
وہ گیت واقعی غیر معمولی ہے جس گیت میں ایک پر عزم بغاوت بھی ہے اور ایک اعترافِ شکست بھی!!
وہ گیت جس میں شہر جیسی نقلی بستی میں بسنے والا شاعر بے وفائی کی گہری چوٹ برداشت کرنے کی کوشش کرنے والی ایک لڑکی کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"پچھلی کرسمس پر
میں نے تم کو دل دیا
مگر دوسرے دن
تم نے اس کو توڑ ڈالا
اس سال میں نے سوچا ہے
کسی اور سے دل لگاؤں گی
کسی اور کی ہو جاؤں گی!!"

اور پھر وہ رونے والے ردھم میں اس بے وفا لڑکے کو بتاتی ہے کہ:

"اب میں کسی اور کے ساتھ
اس طرح رقص نہ کر پاؤں گی
جس طرح میں تمہارے ساتھ
جھومی تھی!
جس طرح میں تمہارے گرد
گھومی تھی!"

یہ باتیں اس دنیا کی ہیں جس دنیا میں رشتے لباس کی طرح پہنے اور اتارے جاتے ہیں مگر پھر بھی دل سے کوئی کسک کبھی نہیں جاتی۔
روشن اور حسین آنکھیں تو ستاروں کی طرح انگنت ہیں

مگر پروین شاکر کا یہ شعر بنا ہر معشوق دید مقدر نہیں ہوتا:
"جاتے جاتے اس کا وہ مڑ کر دوبارہ دیکھنا"
کسی کے نیلے نین اس وقت سمندر بن جاتے ہیں
جب وہ کسی ادا کے ساتھ اس طرح دیکھتا ہے
جس طرح کوئی ڈوبتا ہوا شخص ساحل کو دیکھے!
اور آخری بار۔۔۔۔!!
پریشان بالوں کی لٹ تو
بہت ساری پیشانیوں پر لہرا سکتی ہے
مگر کسی کا اس لٹ کو کانوں کے پیچھے اڑنے کا انداز!!
مگر ہر خوبصورتی کے بس میں وہ بات کہاں؟
جو لائے وہ ادائیں جو حسن کو لازوال بنا دیتی ہیں!!!
یہ بات صرف وہ جان سکتے ہیں
جو دل سے مانتے ہیں کہ:
"حسین ہونٹ نہیں،
مسکراہٹ ہوتی ہے"
اور محبت کا وہ انداز!!!
کوئی کہاں سے لائے؟
کوئی کس کو کس طرح سمجھائے؟
"کمال شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا
خلاف اس کے یہ دل ہو سکا ہے اب بھی نہیں!!"
یہ شخص جو محبت میں مار دیتا تھا
وہ جو قاتل بھی تھا، دلدار بھی تھا!!
اس کا وہ خفا ہونا
اس کا وہ جدا ہونا

اس کا وہ لوٹ آنا
اس کا وہ لڑنا
اس کا وہ پٹنا
اس کا الزامات کی بارش برسانے والا بادل بن جانا
اس رخساروں پر رینگتا ہوا کاجل بن جانا
اس کا وہ آسانی سے حاصل ہونا
اور حاصل ہوتے ہوئے ہی
لاحاصل بن جانا!!
اس کا وہ بچوں جیسا ہنسنا
اس کا وہ بوڑھوں جیسی باتیں کرنا
اس کا وہ عمروں کے ساتھ کھیلنا
اور اس کھیل میں کھو جانا
جس کا باتیں کرتے ہوئے
سکون سے سو جانا!!
ایسی حسین راتوں کو کوئی کس طرح فراموش کر سکتا ہے؟
جب کوئی ناراض دوست نیند میں مسکراتا نظر آئے!!!
ایسی ڈیٹس ڈپریشن کا سبب نہیں بنتی
جس میں کوئی بے سبب روٹھ جاتا ہے
جس میں کوئی بے سبب مناتا ہے!!
جس ڈیٹ پر کوئی لڑکا
کسی لڑکی کے لیے
وہ گیت گاتا ہے
جو اس کی ماں کا پسندیدہ گیت تھا!!
وہ پرانا اور پیچیدہ جذبات سے بھرا ہوا گیت

جس کے سر لوری جیسے ہوتے ہیں
بہت دھیمے، بہت پاکیزہ!
بہت دل گداز مگر مسکراتے ہوئے!!
اور ان آرٹسٹک باتوں میں
ایک احمق قہقہہ
ایک اسٹوپڈ سی حرکت
اور ایک جذباتی لڑکی کا فوراً کہنا
"آپ میرے تصور سے بہت مختلف ہیں"
وہ سب باتیں ٹھیک
مگر حماقت بھری حرکت کے سبب
اس دوست کی دوری کو برداشت کرنا
جو کہ اک شخص بھی تھا
اک شہر بھی تھا
اک ملک بھی تھا
اور دنیا کے دیوان کا
ایک شرمیلا شعر بھی تھا!!
وہ شخص جو ایک خواب تھا
تعبیر بھی تھا
وہ شخص جو تعمیر تھا
تسخیر بھی تھا!!
ہاں اسی شخص کے بارے میں وضاحت کی ہے!
ہاں! اسی شخص کے بارے میں لکھا اس نے
"محبت تو مل جائے گی
مگر تم نہیں ملو گے!!"

جی ہاں!
وقت ہر درد کی دوا نہیں ہوتا!

Time can never mend
Careless whisper of a good friend

یہ گیت لکھا تھا اس آرٹسٹ نے
جواب اس دنیا میں نہیں ہے
یہ دنیا جو ایک تنگ جوتے جیسی تھی
اس دنیا کو اتار کر
ننگے پیروں کے ساتھ
وہ شخص اتر گیا اس وادی میں
جس وادی سے کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آتا!!
وہ شخص جو ایک آرٹسٹ تھا
وہ شخص جو بہت خیالی تھا
وہ شخص جو مغرب میں بھی ایک موالی تھا!!
وہ شخص جو گیت لکھتا تھا
دھن بناتا تھا
اور گاتا تھا

Time can never mend
Careless whisper of a good friend

"وقت ہر درد کی دوا نہیں"
کیا اس کو معلوم تھا؟
شاعری فراق کی تخلیق ہوا کرتی ہے!
وہ شخص جس کی شکل جوانی میں بہت خوبصورت
اور بڑھاپے میں بہت بد صورت تھی!!
مگر ایک دنیا

اس کے جانے کے درد میں
جل رہی ہے
موم بتی کے مانند!!
اور پیانو پر
ایک ٹپسی لڑکی
مخروطی انگلیوں کو رقصاں کرتے
دھن بجا رہی ہے

Time can never mend
Careless whisper of a good friend

دھیمے سر دل کو الگ طرح سے چھوتے ہیں!!

Time can never mend
Careless whisper of a good friend

"وقت ہر درد کی دوا نہیں ہوتا"
جارج مائیکل نے لکھا تھا
اور سروں میں سجایا تھا
اور ایک وجد جیسی کیفیت میں گایا تھا
یہ گیت:

Time can never mend
Careless whisper of a good friend

"وقت ہر درد کی دوا نہیں ہوتا!!"
وقت جو آسمان پر رینگتا
اور دھرتی پر اڑتا رہتا ہے!
وقت جو سب سے کہتا رہتا ہے
"میں ہر درد کا معالج نہیں ہوں"
وقت جو بوڑھا بھی نہیں

اور اک بچہ بھی نہیں!
وقت جو جھوٹا بھی نہیں
وقت جو سچا بھی نہیں!
ہاں اسی وقت کے دامن پہ گرا ہے یہ گیت
Time can never mend
Careless whisper of a good friend
"وقت ہر درد کا مداوا نہیں کر سکتا"
وقت جو سرکش ہے بہت
اور بہت قہر آلود
وقت امرت بھی ہے
اور بہت ہے زہر آلود!
وقت بے حرم بھی ہے
وقت بہت رحم بھی ہے
ہاں اسی وقت کے دامن سے گرے ہیں سر یہ کچھ
یہ جو سر ساز کی تاروں پہ سسکے ہیں بہت!
ان ہی تاروں نے کیا ہے ارشاد!
کیا تم بھول گئے؟
کیا تم کو نہیں یاد؟
ہاں وہ اک درد کہ تھا
جس سے یہ جیون آباد!!
ہاں! اسی درد کے ڈالی پر
مہکا ہے یہ ہے پھول!
یہ پھول
یہ خوشبو کا سفر

اور یہ شاعری!
ہاں یہی شاعری
جس نے بتایا سب کو

Time can never mend
Careless whisper of a good friend

اور اسی گیت کا شاعر
وہ مغنی اور وہ موسیقار
وہ تو اب ایک خبر ہے
بہت غمگین بہت
آنکھ سے بہتے ہوئے آنسو سی
تھوڑی بے چین باتوں سی
اور نمکین بہت!
یہ وہ گیت ہے
جو ہر سال سنا جائے گا
جب بھی آئے گا کرسمس
تو کوئی گائے گا
"پچھلی کرسمس پر
میں نے تمھیں دل دیا"
وہ اور ایک گیت گاتا ہے
اور بار بار بتاتا ہے

Time can never mend
Careless whisper of a good friend

"وقت ہر درد کا درمان نہیں"
وقت جو رینگتا ہے
جسم پہ

اور روح پہ بھی!!
وقت جو درد بھی درمان بھی ہے
وقت شناسا بھی ہے
اور انجان بھی ہے!!
"وقت ہر درد کا درمان نہیں بن سکتا"
وقت جو جیتنے کی کوشش تو بہت کرتا ہے
مگر وہ ہمیشہ ہار جاتا ہے!!
مگر اس بار وقت نہیں ہارا
اس نے جارج مائیکل کو
کرسمس کے دن مارا!
وہ جارج مائیکل جو پھول کی ٹہنی بن کر
لہراتا تھا
اور گٹار بجاتے ہوئے
آنکھیں بند کر کے گاتا تھا
"پچھلی کرسمس پر
میں نے تمہیں دل دیا!!"

کرسمس، کرائسٹ اور ایک کمیونسٹ شاعر

آج اس عظیم شخصیت کا جنم دن ہے
جس کے لیے خلیل جبران نے لکھا تھا:
"یہ جو صلیب پر لٹک رہا ہے
وہ سب سے پیار کرتا تھا
سوائے اپنے آپ کے!"
آج اس کا جنم دن ہے
جس کے لیے آرتھر کوسلر نے
اپنی کتاب "کال گرلز" میں
یہ محسوسات مرتب کیے تھے:
"وزنی صلیب کے نیچے
اس کا کندھا چھل رہا تھا
اور وہ آسمان کی طرف دیکھ کر
کہنا چاہتا تھا
تم نے پھونکوں سے ہٹائے ہیں پہاڑ
ایک پتھری میرے تلووں میں

چبھ رہی ہے بہت!
تو خداوند ہے
اس کو تو ہٹا!!
ایک مکھی میرے ماتھے کے زخم میں
گھس آئی ہے
بھنبھناتی تو بہت درد دیتی ہے مجھے
اپنی انگلی سے ذرا اس کو اڑا!!"
آج اس کا جنم دن ہے
جو صلیب پر لٹکا تھا
اور آج ہر خوبصورت لڑکی کی
گلے میں لٹک رہا ہے!!
آج اس کا جنم دن ہے
جو حقیقت اور افسانے کے درمیاں
درد کی تصویر ہے
مغرب کا مقدر
اور مشرق کی تقدیر ہے!!
جو موم بتیوں کی لو میں
لہلہاتا ہے اور گاتا ہے
"مظلوموں کی محبت میں
محکوموں کی ہمت میں
ایک قدم آگے بڑھاؤ!"
آج اس کا جنم دن ہے
جو محبت ہے
مسیحا ہے!!

اور اک ذرد بھی ہے!!
وہ انسانیت ہے پوری
اور اک فرد بھی ہے!!
وہ دہکتا ہوا شعلہ بھی ہے
اور سیاہ رات کے مانند
بہت سرد بھی ہے!!
آئیں!!
اور اس کے جنم دن پر
ایک سفید آنسو کے ساتھ
ایک کمیونسٹ شاعر کا
یہ نذرانہ عقیدت پیش کریں:
"پس دیوار زنداں کیا ہے؟
ستارے ہیں؟؟
کہ آنکھیں ہیں؟؟؟
کہ انگارے دہکتے ہیں؟؟؟؟
محافظ کچھ نہیں کہتے!
اگرچہ جام و ساقی قید ہیں
صلیبوں پر سہی
پیغمبروں کی حکمرانی ہے!"

کہاں ہے وہ سندھ؟

(اگر رسول حمزاتوف داغستان کے بجائے وادیٔ سندھ میں پیدا ہوتے تو ”کلچرل ڈے“ کے موقعے پر وہ یہ الفاظ ضرور لکھتے کہ ”وہ ٹوپی اور اجرک تو خرید لایا ہے مگر دریا خان جیسا دل کہاں سے لائے گا؟“)

رسول حمزاتوف نے اپنی مشہور کتاب ”میرا داغستان“ میں لکھا ہے کہ ”میں جب فرانس سے واپس آیا تب گاؤں کے بہت سارے لوگ ملنے آئے اور ان لوگوں میں میرے گاؤں کی ایک عورت بھی تھی جس کے بیٹا پیرس میں رہتا تھا۔ اس عورت نے مجھ سے پوچھا ”کیا تمہاری ملاقات میرے بیٹے سے ہوئی؟“ میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے بیٹے سے ملا تھا۔ اس نے مجھ سے پہلا سوال یہ پوچھا کہ ”تم دونوں نے کس زبان میں بات چیت کی؟“ میں نے اسے بتایا کہ ”ہم نے روسی زبان میں بات کی“ یہ بات سن کر اس عورت کو شدید صدمہ پہنچا۔ اس نے حیرت اور افسوس سے پوچھا کہ ”کیا میرے بیٹے نے تم سے اپنی آوار زبان میں بات نہیں کی؟“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ”دراصل ہمارے وفد میں اور بھی لوگ تھے اس لیے ہماری بات چیت روسی میں ہوئی“ میری وضاحت سن کر وہ عورت خاموش ہوگئی اور اس نے اپنے چہرے پر سیاہ کپڑا ڈال لیا۔ ہمارے گاؤں میں جب کسی عورت کا بیٹا مر جاتا ہے تو وہ اپنے چہرے پر سیاہ کپڑا ڈال دیتی ہے!!

ثقافت کے وجود میں زبان ریڑھ کی ہڈی سمجھی جاتی ہے۔ معاشرتی معاملات میں

زبان کی بہت بڑی حیثیت ہوا کرتی ہے۔ بعض اوقات زبان جغرافیہ سے زیادہ جذبات کی حامل ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فلسطین کے ایک جلاوطن شاعر نے اپنی ایک نظم میں لکھا تھا کہ:

"ہم وہاں جانا چاہتے ہیں
جہاں کھیتوں میں فصل
ہماری زباں میں بوئی جاتی ہے
اور ہماری زباں میں کاٹی جاتی ہے
جہاں سمندروں میں مچھلی کا شکار
ہماری زباں ہوتا ہے
جہاں باغات سے پرندوں کو
ہماری زباں میں اڑایا جاتا ہے
جہاں کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں
ہماری زباں میں نکلتا ہے"

یہ زباں ہی ہے جس کے لیے ایک جرمن ادیب نے لکھا تھا کہ "زباں حسن کا گھر ہوا کرتی ہے۔ یہ ہمارے لیے سوچتی ہے اور ہمارے جذبات کا اظہار کرتی ہے"

برازیل کے انقلابی ماہر تعلیم پائلو فراری نے لکھا ہے کہ "جلاوطنی کی کیفیت اذیت بھری ہوا کرتی ہے۔ مگر اپنے وطن سے دور جب کسی جلاوطن شخص کو اتفاق سے کوئی ہم زباں مل جاتا ہے تب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اسے تھوڑی دیر کے لیے وطن کی سرزمین مل گئی ہے"

زباں کی اتنی زبردست اور حساس حیثیت ہونے کے باوجود بھی ہم اسے مکمل ثقافت قرار نہیں دے سکتے۔ مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے کلچر کو لباس تک محدود کر دیا ہے!

آج جب سندھ میں سندھی زباں بولنے والے "کلچرل ڈے" منا رہے ہیں اور کشمور سے لیکر کراچی تک سندھی گیتوں کی گونج میں سندھی لوگوں کے سروں پر

سندھی ٹوپیاں پھولوں کی طرح کھل اٹھی ہیں اور اجرک کے رنگوں سے اس غریب سرزمیں پر ثقافت کی بہار آئی ہوئی ہے، تب بھی سندھ کے سنجیدہ ذہن اجرک کو ثقافتی فتح کا پرچم قرار دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اجرک جو اہلیان سندھ سے محد سے لیکر لحد تک ساتھ رہتی ہے۔ وہ اجرک جس کے حوالے سے سندھی ادب میں بہت سارے خوبصورت اشعار بھی ہیں۔ وہ اجرک جس کے لیئے ایاز نے لکھا تھا کہ:

"ٹھٹے کی ہوا میں گلابی بدن
اجرک میں لپٹا ہے خوشبو کا تن"

وہ اجرک جس کا پرنٹ سندھ کی روایات اور رومانس کی ایک تاریخ محسوس ہوتا ہے۔ وہ اجرک بھی موجودہ حالات میں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے افلاس زدہ سندھ کے وجود پر موجود ایک گہرے زخم پر بندھی ہوئی پٹی!!

اور وہ رلی جس پر سندھ کے لوگ جنم لیتے ہیں اور جس پر وہ آخری سانس لیتے ہیں اور جس کو سندھ کی مظلوم عورتیں اپنی صد چاک روح کی طرح سیتی ہیں۔ وہ رلی بھی اس ثقافت کی روح نہیں جس ثقافت کی جڑیں روایات کی سرزمیں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ وقت کے سفر میں سندھ ان روایات کو کھو چکا ہے۔ وہ روایات جو دراصل معاشرتی معیارات کا مجموعہ ہیں۔

اگر قدیم اور جدید سندھ کے درمیاں پل جیسی شاعری کے یہ بول کسی کے ہونٹوں پر آتے ہیں کہ:

"میں تجھے پھر ڈھونڈتا ہوں اروشی
میں کہ وکرم بھی ہوں کالی داس بھی"

تو یہ تلاش ان روایات کی ہے جن روایات سے سندھ کی موجودہ نسل محروم ہو چکی ہے۔ سندھ کی نسل نو جب لوک کہانیوں میں ان روایات سے جڑی ہوئی داستانیں سنتی ہے تب ان کی روح میں ایک چیخ اٹھتی ہے اور وہ پوچھتے ہیں کہ "کہاں ہے وہ سندھ؟"

کہاں ہے وہ سندھ جس کی ایک پہچان مہمان سے کیے جانے والا محبت بھرا

سلوک تھا۔

وہ روایات جدید دور میں ختم ہوتے ہوئے جزیروں کی طرح نظر آتی ہیں جب ایک امیر میزبان بھی ایک غریب مہمان کے ہاتھ خود دھلواتا تھا۔

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس کے لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ پتھر پر کھنچی ہوئی لکیر تو مٹ سکتی ہے مگر مرد کی زباں سے کیا ہوا وعدہ کبھی نہیں مٹ سکتا۔

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس میں کہا جاتا تھا کہ ''بیٹی کا مطلب سات قرآن''

کہاں ہے سندھ ؟

جس میں دروازے پر آئے ہوئے دشمن کو خون معاف کیا جاتا تھا۔

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس کا اس بات پر ایمان تھا کہ ''مہمان اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے''

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس میں ''مرد کی زباں ایک ہوا کرتی تھی''

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس میں آس پاس کے لیے کہا جاتا تھا کہ ''محلہ تو ماں باپ ہوا کرتا ہے''

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس میں کسی کو شرمندہ کرتے ہوئے یہ کہاوت پیش کی جاتی تھی کہ ''چڑیل بھی دس گھر چھوڑ کر شکار کرتی ہے''

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جو اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ''کہو کم اور کرو زیادہ''

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس کے مجرم صفت افراد بھی کلچرل کوڈ سے بندھے ہوئے تھے۔

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس میں کہا جاتا تھا کہ "وہ چور کمینہ ہے جو گاؤں کے گھر کا صفایا کرے"

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس کے ڈاکو عورت سامنے آنے کی صورت میں لوٹا ہوا مال معافی کے ساتھ لوٹا دیا کرتے تھے۔

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس میں لوگ دودھ فروخت کرنے کو عیب سمجھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "کیا کوئی درخت اپنی چھاؤں بیچا کرتا ہے!!؟"

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جس کے لوگ فخر سے کہا کرتے تھے کہ "عشق اور انتقام کبھی پرانے نہیں ہوتے"

کہاں ہے وہ سندھ ؟

جو سختی سے سمجھاتا تھا کہ "محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز نہیں ہوتی"

وہ سندھ اب تاریخ کا ایک بھولا بسرا باب بن گیا ہے۔

وہ سندھ اب کہاں ہے ؟

جس میں کمزور پر ہاتھ اٹھانا نامردی سمجھا جاتا تھا۔

وہ سندھ تاریخ کے سیلاب میں غرق آب ہوا جو ان روایات کے ساتھ جڑا تھا جو روایات سندھ کے لوگوں کی پہچان تھیں۔

وہ سندھ اب کہیں نہیں جس کے لیے ذوالفقار علی بھٹو نے کال کوٹھڑی میں لکھا تھا کہ "میں سندھ کا رانو ہوں"

وہ سندھ جو مومل تھا۔ جو انتظار کی آگ میں جلنے کا فن جانتا تھا۔

وہ سندھ جو سسی تھا۔ جو ویرانوں میں پیار کی پکار تھا۔

وہ سندھ جو سوہنی تھا۔ جو سیاہ رات میں کچے گھڑے کے سہارے سرد دریا پار کیا کرتا تھا۔

وہ سندھ جو موکھی تھا۔ جو مۓ کشوں کے بغیر بے معنی تھا۔

وہ سندھ جو نوری تھا۔ جو کینجھر جھیل کا کبھی نہ کملھانے والا کنول تھا۔
وہ سندھ جو ماروی تھا۔ جو قید و بند میں وطن سے وفا کی علامت تھا۔
وہ سندھ کہاں گیا؟
جو بھٹ شاہ پر بجتی ہوئی وفا کا ساز تھا۔
وہ سندھ جو ایک مقدس تصور تھا۔
وہ سندھ جس کو سیاسی سوداگروں نے ایک کارڈ بنادیا۔
اس سندھ کا کلچر شادیانوں میں تلاش کرنا عبث ہے۔
وہ سندھ تو ایک نعرہ مستانہ تھا۔

وہ اداس سندھ جس کی جھلک اب بھی ان سروں کے پردے سے اپنی جھلک دکھاتا ہے جب عابدہ پروین وجد میں آکر گاتی ہے کہ:

"سندھ میری اماں"
وہ سندھ جو ہجر و فراق کی ایک صدا ہے۔
وہ سندھ جو کوئل کی کوک ہے۔
وہ سندھ جو سینے سے اٹھتی ہوئی ہوک ہے۔
وہ سندھ غم ہے گداز ہے!
وہ سندھ جو ساز ہے آواز ہے!!
اس گم گشتہ سندھ کا پتہ کس سے پوچھیں؟

جو صحرائے تھر میں نیم کے درخت کے نیچے منتظر مائی بھاگی کی سسکتی ہوئی صدا ہے۔

وہ سندھ تو جرمِ وفا کی سزا ہے!!

اگر رسول حمزاتوف داغستان کے بجائے وادی سندھ میں پیدا ہوتے تو "کلچرل ڈے" کے موقعے پر وہ یہ الفاظ ضرور لکھتے کہ "وہ ٹوپی اور اجرک تو خرید لایا ہے مگر دریا خان جیسا دل کہاں سے لائے گا؟"

دھرتی کے سپوت بازاروں میں نہیں بکتے۔ وہ تو تاریخ کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔

وہ مال کمانے نہیں تاریخ بنانے آتے ہیں۔ ان کا کردار کلچر بن جاتا ہے۔ وہ کلچر جس کی روح آہستہ آہستہ وداع ہو جاتی ہے اور پیچھے رہ جاتا ہے صرف دکھاوے جیسا جسم!

اور اجرک کا ثقافتی پرچم بن جاتا ہے اس سرزمین کا کفن!!

جو اپنی دھرتی میں دفن ہونے کی تمنا کا اظہار کچھ اس طرح کرتی ہے:

"دفن کر دو مجھے کہ سانس آئے
نبض کچھ دیر سے تھمی سی ہے!!"

کتابوں کی باتیں

میں ایک ایسی لڑکی کو جانتا ہوں جو کتابوں سے محبت کرتی ہے۔اس لیے نہیں کہ کچھ کتابوں میں محبت کے سوکھے پھول محفوظ ہوتے ہیں۔ مگر اس لیے کہ کتاب تو بذات خود ایک پھول ہوا کرتا ہے۔ ایک ایسا پھول جو کاغذی ہوتے ہوئے بھی کاغذی نہیں ہوتا۔ اس میں ایک خوشبو ہوا کرتی ہے۔ خیالات اور کاغذات کے سنگم سے عود اور لوبان کو ایک ساتھ جلانے سے پیدا ہونے والی مہک سمائی ہوا کرتی ہے ان کتابوں میں جن کو پڑھنے والے پاگل ہو جاتے ہیں اور وہ اس دنیا سے اختلافات رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ کتابیں جن کی سطروں کے بارے میں احمد سلیم نے لکھا تھا کہ ''جسم پر ابھرے ہوئے نیلوں کو پڑھو'' ایسی کتابیں جن کے بارے میں ''امریکہ'' اور ''مقدمہ'' جیسے ناول تحریر کرنے والے فرانز کافکا نے لکھا تھا کہ ''جو کتاب تیرے سر پہ مکہ مار کر تجھے سوچنے پر مجبور نہیں کرتی وہ کتاب ہی نہیں ہے'' مگر ایسی کتابیں بھی تو ہیں جو آنچل کھینچے جانے والے سروں پر دست محبت دھرتی ہیں۔ وہ کتابیں جو باجے کی طرح بجتی ہیں۔ جن کے ہر لفظ میں اک لے اور ہر سطر میں ایک سر سمایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ کتابیں جنہوں نے دنیا بدل ڈالی۔ وہ کتابیں جو مشعل راہ بنیں۔ وہ کتابیں جو جادو پر نہیں تھیں مگر ان میں ایک جادو تھا۔ ان کے ہر صفحے پر محبت کا ''منترا'' تھا۔ عشق کو مشک بنانے والی کتابیں۔ وہ کتابیں جو شایع ہونے کے لیے نہیں لکھی گئیں۔ وہ کتابیں جو شایع ہوئیں تو جلائی دی گئیں۔ وہ کتابیں جو مشعلیں بن گئیں۔ جنہوں نے اپنے دور

کا اندھیرا کم کیا۔ وہ کتابیں جو فریادیں تھیں۔ وہ کتابیں جو تاریخ کا فیصلہ بنیں۔ وہ کتابیں جو ابھی تک قلم سے الجھی ہوئی ہیں۔ وہ کتابیں جو سلجھی ہوئی سیاہی سے لکھی گئیں اور جنہوں نے دنیا کو اس دانائی سے آشنا کیا جو صرف ذاتی مفاد کا طواف نہیں کرتیں۔ کچھ کتابیں سمندر جیسی ہوا کرتی ہیں۔ گہری اور بے چین! مگر کچھ کتابیں ساحل سمندر ہوا کرتی ہیں۔ ایسا ساحل سمندر جن پر سپنوں کے سوداگر اترتے ہیں اور ان آنکھوں کو خوابوں سے بھر دیتے ہیں جن آنکھوں میں کوئی خواب مسافر کی طرح بھی نہیں ٹھہرتا۔ جس طرح یہ دنیا مختلف انسانوں کا مجموعہ ہے اسی طرح کتابوں کی بھی بہت ساری اقسام ہوا کرتی ہیں۔ کچھ کتابیں غلاموں جیسی ہوتی ہیں اور کچھ کتابیں آقاؤں جیسی! کچھ کتابیں اطاعت کی تلقین کرتی ہیں اور کچ کتابیں انسانوں کو بغاوت پر آمادہ کرتی ہیں۔ کچھ کتابوں کی سطریں انسانوں کو زنجیروں کی طرح جکڑ لیتی ہیں اور کچھ کتابیں انسانوں کو آزاد کروانے میں ایک عظیم کردار ادا کرتی ہیں۔ کتابیں ایک طرح کی نہیں ہوتیں کتابیں بہت ساری ہیں۔ مگر کتابوں سے لگن رکھنے والے انسان بھلے کچھ کتابوں سے محبت کریں مگر وہ عزت سارے کتابوں کی کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہر کتاب ایک سیپ کی طرح ہوا کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر سیپ میں موتی ہو!! مگر ہر سیپ جانتی ہے کہ علم کا سمندر کتنا گہرا اور کشادہ ہوا کرتا ہے۔

ایک پشتو ٹپہ ہے کہ:

"اے کتاب جلدی سے ختم ہو جاؤ
میں وطن میں بیمار چھوڑ آیا ہوں"

کتابیں انسان کو شفا دیتی ہیں۔ کتابیں معالج بھی ہوا کرتی ہیں۔ مگر وہ بھی تو کتابیں ہیں جو انسان کو بیمار بنا دیتی ہیں۔ بدھ مت کا بانی گوتم کہا کرتا تھا کہ "کتاب ایک کشتی کی طرح ہوا کرتا ہے۔ آپ اس کتاب پر سوار ہو کر بے علمی کا دریا عبور کریں مگر کنارے پر پہنچ کر اس کشتی کو اپنے کندھے میں اٹھانا عقلمندی نہیں" علامہ اقبال بھی کتابوں کا بوجھ اٹھانے والے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا کرتا تھا۔ کیوں کہ باعمل صوفی بننے کی تلقین کرنے والے اقبال کی نظر میں کتاب منزل نہیں بلکہ راستہ ہے۔ پنجاب کے عظیم

صوفی درویش حضرت باہو فرماتے ہیں کہ:

"گلیاں دے وچ پھر نمانے
بغل کتاباں چائی ہو۔۔۔!!"

کتاب جب انسان میں غرور اور گھمنڈ پیدا کردے تب وہ مثبت نہیں رہتی۔ مگر یہی کتابیں ہیں جنہوں نے انسان کی انا کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دنیا میں ایسے عالم بھی ہیں جو کتابوں کی دیواروں میں قید ہو کر رہ گئے مگر اس قید خانے کے تالے کی کنجی بھی تو ایک کتاب ہی ہے۔ آسمانوں سے اترنے والی کتابوں سے لیکر زمین پر لکھی جانے والی کتابوں تک ایک بہت لمبی تاریخ ہے ان کتابوں کی جو کبھی پتھروں کی سلوں پر کندہ ہوا کرتی تھیں جو کبھی لکڑی کے تختوں پر لکھی جاتیں تھیں اور کاغذ کی ایجاد سے پہلے وہ کھجور کے پتوں اور کپڑے کے ٹکڑوں پر تحریر ہوا کرتی تھیں۔ مگر بیش قیمت کاغذ سے لیکر کمپیوٹر کی اسکرین پر پڑھی جانی والی کتابوں کے سارے سفر میں انسانی شعور نے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور یہ حاصلات ایک سرمایہ علم ہے۔ مولا علی کا فرمان ہے کہ "میں خدا کا ممنون ہوں کہ اس نے ہمیں علم سے نوازا اور جاہلوں کو دولت سے" علم کی اس وادی میں داخل ہونے کا راستہ اور شعور کے خزانے تک رسائی کا نقشہ بھی تو وہ کتابیں ہی ہیں جو سب کے لیے نہیں بلکہ ان آنکھوں کے لیے بہت پر کشش ہوا کرتی ہیں جن میں علم کے لیے چاہ ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم یونان کی وہ تہذیب جس کا عروج اور زوال ابھی تک ایک پہیلی ہے، اس میں سقراط جیسے استاد کو کسی بادشاہ یا امیر کے بیٹے سے نہیں بلکہ اپنے اس غریب شاگرد سے محبت تھی جس کے گھر میں سب سے زیادہ کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے سقراط اپنے شاگرد افلاطون کا نام لینے کے بجائے اسے "کتابوں والا" کہہ کر بلاتا تھا۔ انسانی تاریخ میں ہتھیار چلانے والوں نے حکومت کی ہے مگر چین کے عالم جنگ سن زو کی کتاب "فن جنگ" نے سارے سورماؤں کے دلوں پر حکومت کی ہے۔ آج جب دنیا ڈرون طیاروں اور روبوٹ سپاہیوں کے دور میں داخل ہوگئی ہے تب بھی سن زو کی "آرٹ آف وار" کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ ایک عظیم کتاب کی شناخت یہی ہوتی ہے کہ وہ وقت گذرنے

کے ساتھ ساتھ زیادہ اہم ہوتی جاتی ہے۔ لیکن دنیا میں سائنس، سیاست اور نظریات پر ہی لکھی گئی کتابوں کو اہمیت نہیں ملی۔ اس دنیا میں ان کتابوں کو بھی پیار سے پڑھا گیا جن میں محبت کی باتیں تھیں۔ جن کتابوں کو انسانوں نے نفع اور نقصان کے خیال سے بالاتر ہو کر پڑھا۔ ان کتابوں نے انسانوں کو بتایا کہ یہ دنیا صرف دولت اور طاقت کی بازی نہیں۔ اس میں کچھ محبت ہے۔ کچھ حسن ہے۔ کچھ نیکی اور بہت بڑی سچائی ہے!!

اب تو کتابیں ترقی کے جانب جانے والے راستے کے سنگ میل بن گئی ہیں۔ اب تو کتابوں کو لوگ اس لیے پسند کرتے ہیں کیوں کہ ان کو معلوم ہو چلا ہے کہ کتابیں بلندی کی طرف اوپر اٹھنے والی سیڑھی کے زینے ہیں۔ اگر زندگی میں خوشحالی لانی ہے۔ اگر دنیا میں اپنے آپ کو ایک کامیاب انسان بنانا ہے تو اپنی بنیاد میں کتابوں کو ڈالو۔ کیوں کہ کتابیں ہماری شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں۔ ہمیں اس دنیا میں دھوکوں اور فراڈوں سے بچانے کا بندوبست کرتی ہیں۔ وہ ہمیں ایک اچھے دوست کی طرح سمجھاتی ہیں کہ ہماری بھلائی کس میں ہے؟ کتابیں ستاروں کی طرح زندگی کی صحرا میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کا مختصر مگر مضبوط وجود ہمیں ایک سہارے کی طرح محسوس ہوتا رہتا ہے۔ کتابوں کو اپنی حیات کہنے والے لوگ اتنے سادہ اور بے بوجھ تو نہ تھے! ان کو معلوم تھا کہ اکثر کتابیں اپنے راقموں کے روح پر پڑا ہوا شعور کا وہ قرضہ ہوا کرتی ہیں جو انہیں ہر حال میں اتارانا ہوتا ہے۔ اس لیے تو ایک ادیب اپنی کتاب لکھنے کے بعد بالکل ایسی کیفیت محسوس کرتا ہے جیسی کیفیت ایک عورت بچے کو جنم دینے کے بعد محسوس کرتی ہے۔ اسے اس وقت اپنی زندگی تکمیل کی طرف ایک بڑا سفر طے کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

کتابوں کو حیات کا سب سے بڑا سہارا اور سرمایہ سمجھنے والے حساس لوگ جب سڑک پر کسی کاغذ اٹھانے والے بچے کو دیکھتے ہیں یا جب ان کی نظر ایک بھیک مانگنے والی نوجوان لڑکی پر پڑتی ہے تب انہیں بہت غصے کے ساتھ یہ خیال آتا ہے کہ کاش! وہ اس کے ہاتھ سے بھیک والا کٹورا چھین کر اس کے ہاتھوں میں موٹے موٹے اور چمکتے ہوئے کاغذات والے اور دلکش سرورقوں سے آراستہ کتابیں دیکر اسے کالج بھیج دیں۔

کیوں کہ کتابیں ملنے کے بعد انسان کی آنکھوں میں خود بخود وہ خواب ابھرنے لگتے ہیں جو انہیں نیند عطا نہیں کر سکتی۔ نیند میں تو ہمیں وہ خواب ملتے ہیں جو ہماری جلتی ہوئی جاگ کی راکھ ہوا کرتے ہیں مگر جو خواب شعور کی کوکھ سے پھوٹتے ہیں، ان کی بلندی تو کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

تو میں بات کر رہا تھا اس لڑکی کی جس کو کتابوں سے بہت محبت ہے۔ وہ لڑکی جو ایلس نہیں ہے مگر جب وہ کسی لائبریری میں جاتی ہے تو اس کا دل کرتا ہے کہ کاش! اس کا وجود بہت چھوٹا سا ہو جائے اور وہ کتابوں کی دنیا میں بہت گہرائی تک چلی جائے اور ان باتوں میں کھو جائے جو باتیں عام دنیا میں نہیں کی جاتیں۔ نہیں سنی جاتیں۔ وہ لڑکی جو اس معاشرے میں رہتی ہے جہاں اپنے بزرگ بھی لڑکیوں کو کتابوں سے دور رکھتے ہیں۔ جب انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کی بچی اسکول اور کالج جانا چاہتی ہے تو انہیں ایک قسم کی تشویش سی لاحق ہو جاتی ہے اور وہ عدم تحفظ کا احساس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور سارے بزرگ اور والدین ایسے نہیں ہیں۔ اس معاشرے میں ایسے افراد بھی ہیں جو اپنے بچیوں کے لیے تعلیم کو ہی سب سے اچھا زیور سمجھتے ہیں۔ جس طرح سونے کی کان میں مزدوری کرنے والا باپ اپنی بیٹی کو پیتل کی بالیوں میں بیاہ دیتا ہے۔ ویسے ہی بہت مہنگے اسکول کے گیٹ پر گارڈ کی ڈیوٹی دینے والا باپ بھی شدید ترین خواہش کے باوجود اپنی بیٹی کو اچھی تعلیم نہیں دلوا پاتا۔

یہ دنیا انسانوں کی حاصلات پر تو پہرے بٹھا سکتی ہے مگر آج تک خوابوں کو قیدی کرنے کا کوئی طریقہ ایجاد نہیں ہوا۔ اس لیے غربت اور افلاس کے گھیرے میں زندگی بتانے والی لڑکیاں علم اور تعلیم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ وہ جو کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتی ہیں ایک کامیاب اور شعوری شہرت حاصل کرنے کے، انہیں کتابوں کی طرف ایسی کشش محسوس ہوتی ہے، جیسی کشش ایک تتلی پھول کے لیے اپنے رنگین اور مختصر وجود میں محسوس کرتی ہے۔ جس طرح تتلی اپنی تھوڑی سی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے مخالف رخ میں چلنے والی ہوا کی مزاحمت کرتی ہوئی ایک پھول پر پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح کتابوں سے بہت پیار کرنے والی لڑکیاں بھی اس طرح جانا چاہتی ہیں مکتبوں

میں جہاں علم دولت سے ملتا ہے۔

آپ کی طرح میں بھی ایک ایسی لڑکی کو جانتا ہوں جو کتابوں سے بہت محبت کرتی ہے۔ جو علم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ جو دنیا میں اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کرنا چاہتی ہے۔ وہ بھی چاہتی ہے دنیا کے حکمرانوں سے ملنا۔ اسے بھی پسند ہے میڈیا پر عزت کے ساتھ آنا۔ وہ بھی چاہتی ہے کہ اس کو اقوام متحدہ کی اسٹیج پر بلایا جائے۔ مگر وہ لڑکی کامیابی کے اس مقام پر کس طرح پہنچ پائے؟ کیوں کہ اس کا باپ نہ امیر ہے نہ عیار! اور نہ عالمی طاقتیں اسے اپنے اسکیم کے ڈرامے کا مرکزی کردار بنانا چاہتی ہیں۔ اس لیے اس کے خواب کٹ کٹ کر آنسوؤں میں گرتے ہیں اور اس کے درد کا کسی کو علم نہیں ہے۔ دنیا میں بہت سارے درد باپردہ ہوا کرتے ہیں۔ بے پردہ دردوں پر داد دینے والو! باپردہ دردوں کے احساسات کو محسوس تو کرو!! بے پردہ درد تو سب کو نظر آتے ہیں مگر دیدہ بینا تو وہی ہوا کرتی ہے جو در پردہ دکھوں کو دیکھ پائے!!

ڈاکٹر زواگو

"تم کیوں نہیں سمجھتے کہ ہمارے حالات ایک جیسے نہیں۔ تمہیں بادلوں سے بھی اوپر اڑنے کے لیے پر ملے ہوئے ہیں مگر میں عورت ہوں۔ مجھے دھرتی کے ساتھ جڑ کر جینا ہے اور اپنی جوانی کا تحفظ کرنا ہے" یہ الفاظ ہیں "ڈاکٹر زواگو" کی ہیروئن "لارا" کے جو روس کے انقلابی طوفان میں گلاب کی پنکھڑی کی طرح اڑ جاتی ہے اور حالات کے ہاتھوں میں ایک مجبور مورت بن کر جیتی ہے۔ وہ لارا جس کے لیے نوبیل انعام یافتہ ناول نگار بورس پاسترناک نے لکھا تھا کہ:

"اس کے اتنے نام تھے جتنے اس کے پاس پیٹی کوٹ بھی نہ تھے"

وہ لارا جو کامریڈ پاشا کی منگیتر تھی۔ وہ پاشا جس نے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے اسے کہا تھا کہ:

"انقلاب ذاتی زندگی کا اختتام ہے"

وہ لارا پھر بھٹکتے ہوئے ایک اور بھٹکنے والے شخص ڈاکٹر زواگو سے ملتی ہے۔ جو اس کے بارے میں برفاب وادیوں میں بیٹھ کر پیار کے گیت لکھتا ہے اور حد نظر تک پھیلی ہوئی برف کی سفید چادر کو دیکھتے ہوئے لارا کے لیے لکھتا ہے کہ:

"تم سے میری محبت جنگلی ہے۔ یہ پیار ایک پاگل پن ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والا جنون!!"

مگر پیشے کے حوالے سے ایک ڈاکٹر جب خلوت کے عالم میں کھو سا جاتا ہے تب

پاسترناک اس کے لیے ان الفاظ کا انتخاب کرتا ہے کہ:

"زبان جو حسن اور معنی کا مسکن ہے۔ جو انسان کے لیے خود سوچتی ہے اور خود ہی اظہار کرتی ہے۔ اپنے خارجی بول سے نہیں بلکہ داخلی روانی سے تیز رفتاری کے ساتھ موسیقی میں بدل جاتی ہے۔ پھر ایک بھرپور ندی کی طرح پتھروں کو چمکاتے ہوئے پون چکیوں کو گھماتی ہے۔ زبان کی روانی اپنے انداز سے ترنم پیدا کرتی ہے اور بہت ساری صورتیں بناتی ہے۔ وہ صورتیں جو آج تک تلاش نہیں کی گئیں اور نہ سوچی گئیں اور انہیں کوئی نام دیا گیا ہے۔ اس وقت یوری محسوس کرتا تھا کہ اس کے کام کا بڑا حصہ اس نے خود نہیں کیا بلکہ ایک ایسی طاقت نے کیا ہے جو اس سے ماورا تھی اور جس نے اسے ایک ضابطے میں رکھا تھا"

اس یوری نے صرف لارا کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی باتیں نہیں سنی تھی۔ زندگی کے اس عجیب سفر میں قیدیوں کے ٹرین میں وہ اس شخص سے بھی ملا تھا جس نے اپنی ہتھکڑی کو لہراتے ہوئے یوری سے کہا تھا کہ "میں اس ٹرین میں واحد آزاد انسان ہوں" اور پھر جب اس باغی نے اپنی جیب سے آدھا سگریٹ نکال کر سلگایا تھا اور زواگو نے سخت سردی میں صرف ایک کش کے لیے اس کی طرف درخواستی دید سے دیکھا تب اس نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا تھا کہ "اس وقت پورے ماسکو میں یہ آخری آدھا سگریٹ ہے" مگر لارا کے ساتھ چند دنوں میں پوری زندگی جینے والا یوری جب برسوں کے بعد ماسکو میں لارا کو ٹرام پر سوار ہوتے دیکھتا ہے اور اس کے پیچھے دیوانوں کی طرح "لارا۔۔۔۔ لارا۔۔۔۔ لارا" کہتے ہوئے لپکتا ہے اور وہ سفید بالوں والا یوری سڑک پر گر جاتا ہے اور مر جاتا ہے!!

انقلاب کے دوران محبت کی یہ کہانی کس قدر حقیقی تھی۔ یہی سبب تھا کہ کمیونسٹ پارٹی نے اس ناول پر پابندی عائد کر رکھی تھی مگر وہ کتاب پھر بھی باذوق روسیوں کے گھروں میں خفیہ دستاویز کی طرح موجود ہوا کرتی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی آف سویت یونین کے ہر سیکریٹری کے ساتھ روس کی پالیسیاں کچھ حد تک تبدیل ہوتی رہیں مگر جس طرح شیخ ایاز نے سرمد پر لکھی ہوئی ایک نظم میں کہا تھا کہ:

"دارا کی تقدیر نہ سوچے
ویسے سب درباریں سوچیں"

اسی طرح بورس پاسترناک کی تخلیقی تقدیر نے اس ناول کی اشاعت کے بارے میں 1956 تک نہیں سوچا۔ اس ناول کے بکھرے ہوئے پیراگرف لوگ پڑھتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ ایک دن انہیں یہ ناول پڑھنے کو ضرور ملے گا جو ناول ڈچ خفیہ سروس کا ایجنٹ جوپ وانڈر ولڈن 1958 کے دوراں ایک خاکی لفافے میں ڈال کر ماسکو سے لے آیا۔ سی آئی اے نے اس ناول کو خفیہ طور پر شایع کروایا تھا اور یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اس نال کو بیلجیم میں ہونے والی عالمی نمائش میں رکھا جائے گا تاکہ اس نمائش میں شرکت کرنے والے روسی اس ناول کو اپنے ساتھ لے جائیں۔

یہ وہ ناول تھا جس کے مسودے پاسترناک نے کچھ غیر ملکی ادیبوں اور صحافیوں کے حوالے بھی کیے تھے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ یہ ناول اس کی زندگی میں شایع ہو جائے۔ جس ناول کی اشاعت کی قیمت ادا کرنے کے لیے پاسترناک فائرنگ اسکوائڈ کے سامنے کھڑے ہونے کے لیے بھی تیار تھا۔ مگر سرد جنگ کے دوراں شایع ہونے والا یہ ناول جب دنیا میں پہنچا تب اس کے تراجم بہت ساری زبانوں میں ہوئے۔ سیاسی دانشور کہتے ہیں کہ اس ناول کو سی آئی اے نے روس کے خلاف ایک محاذ کے طور پر استعمال کیا جب کہ سوشلسٹ نظریات رکھنے والے نقاد اس وقت بھی کہا کرتے تھے کہ "اس ناول میں ایسی کیا بات ہے جو سوشلسٹ نظام کے لیے خطرہ بن سکے؟" مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ 1988 تک یہ ناول روس میں شایع نہیں ہوا اور جب یہ ناول سوویت یونین میں شایع ہوا تب اس کا تخلیقار ناول کے ہیرو یوری زواگو کی طرح اس دنیا میں نہیں تھا۔ اب تو دنیا کے نقشے پر سوویت یونین بھی نہیں مگر یہ ناول پھر بھی پیار اور محبت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ سی آئی اے نے تو اس ناول سے اپنا کام نکال کر اسے بھلا بھی دیا اور اب تو اسے مذکورہ ناول کے حوالے سے اپنی خفیہ کاوشوں کے تفصیل بھی منظر عام پر لانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر دنیا کے باذوق قارئین آج بھی اس ناول کی رومانوی داستان کو محبت کے ساتھ پڑھتے اور پڑھ کر سوچتے ہیں کہ "نظام بدل

جاتے ہیں۔ دنیا کے حالات وہی نہیں رہتے۔ مگر محبت کی باتیں پڑھ کر انسان پھر بھی اداس رہتا ہے۔ اس اداسی کو نہ کل سوشلزم ختم کر سکا اور نہ آج اسے جمہوریت پورا کر پائی ہے"

اسی لیے تو سرد جنگ کے دوران بھی سوشلسٹ ممالک میں رہنے والے شاعر اور ادیب لکھا کرتے تھے کہ "محبت ایک مسلسل انقلاب ہے" ایک چیک شاعر نے تو یہ بھی لکھا تھا کہ:

"جب پوری دنیا میں انقلاب آجائے گا
اور کوئی شخص بھی استحصال کا شکار نہیں ہو گا
تب بھی تم دیکھو گے
ڈھلتے ہوئے سورج کی شام میں
ایک جوڑے کو
ایک دوسرے کے کندھے پر جھکا ہوا
اور خاموش!!"

مگر جس طرح ہم خوبصورت خوابوں کو بھول جاتے ہیں اسی طرح ہم قیمتی کتابوں کو بھی فراموش کر دیتے ہیں مگر بی بی سی کے مارٹن ونارڈ کے مشکور ہیں جنہوں نے سرد جنگ کے دوراں سی آئی اے ادبی محاذ پر ادا کرنے والے کردار کے حوالے س ڈاکٹر زواگو کا تذکرہ کر کے ہمیں وہ بھولی بسری محبت یاد دلادی جو سائبیریا کی سردی میں بھی آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکتی ہے۔ وہ محبت جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کا انسان کے ساتھ مقدس رشتہ محبت کا ہوا کرتا ہے۔ وہ مقدس رشتہ جو تاریخ کے طوفانوں میں اتنا بھی نہیں لرزتا جتنا وہ موم بتی لرزی تھی جو زواگو میں کمرے میں جل رہی تھی جب لارنے دوروازہ کھولا تھا۔ محبت کی وہ جھلک کبھی ختم نہیں ہو سکتی جو یوری زواگو نے وکٹر کے ساتھ جانے والی لارا کو ددھند میں ڈھکے ہوئے شیشے کو صاف کر کے دیکھی تھی۔

مگر کتنا برا ہوا کہ اس ناول کو صرف سیاست کی میلی نظر سے دیکھا گیا اور دونوں اطراف سے! سی آئی اے نے بھی اس کو سیاسی اوزار کی طرح استعمال کیا اور کے جی بی

نے بھی اس ناول میں پنہاں پیار کی وہ بات نہیں دیکھی جو اس ناول کی اصل روح ہے۔ سوشلسٹ حقیقت پسندی کے حوالے سے ادبی نظریات رکھنے والے سوچتے رہے کہ یہ ناول سوویت انقلاب پر تنقید ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ یہ ناول دنیا کے ہر انقلاب کے دوراں ملتے بچھڑتے رشتوں کی کہانی ہے۔ یہ ناول اپنے آپ میں وہ سارے انقلابات سماتا ہے جو آج تک اس دھرتی پر آئے اور ان انقلابات کو بھی اپنی آغوش میں لیتا ہے جو ابھی آنے والے ہیں۔

جس طرح شولوخوف نے اپنے ناول "اور ڈان بہتا رہا" کے بارے میں کہا تھا کہ "میرا ناول اس دریائے ڈان کے بارے میں نہیں ہے جس کے کناروں پر تبدیلیاں آتی رہیں مگر وہ پھر بھی بہتا رہا۔ میرا ناول اس انسانی دل کے بارے میں ہے جس کا ایک عکس ہمیں دریائے ڈان کی صورت میں نظر آتا ہے" ادب تو دل کی دستاویز ہوا کرتا ہے۔ ادب تو تخلیق کا ایک ایسا کارنامہ ہوا کرتا ہو جو کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ لوگ معمر ہو جاتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں مگر ادب ہمیشہ جوان اور امر رہتا ہے۔ اس لیے شیخ ایاز نے ہندی زبان کے بہت ہی قدیم شاعر کالی داس کے حوالے سے کتنی خوبصورت بات لکھی تھی کہ:

"کالی داس نے اپنا ڈرامہ شکنتلا پڑھا
اور پھر گھمنڈ کے ساتھ قریب رکھی ہوئی برہما کی مورتی کو دیکھنے لگا
اس کے جی میں آیا کہ کمر پر رکھ کر پھیرے
اور پھر دھرتی پر گرادے
اس نے نفرت سے مورتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
"تم نے مٹی سے یہ جگ بنایا
اور میں نے زبان سے دشینت، شکنتلا اور رشی کنو بنائے
تمہارا بنایا ہوا منش گھٹنوں کے بل رینگتا نظر آیا
وہ بھوک میں رونے لگا
دکھ میں سمجھ گیا وہ وہ پھر مٹی سے مل کر مٹی بن جائے گا

مگر میں نے اپنی کلپنا سے منش کو بلند کیا
اس کو ایسی چیز بنایا جس سے خواب بنائے جاتے ہیں
صدیاں بیت جائیں گی مگر میرے منش وقت کی گردش کو مات کرتے رہیں گے
دنوں کے سوکھے ہوئے پتے اور راتوں کی اجڑی ہوئی بیلیں
اس بہار کو شکست نہیں دے پائیں گی
جس سے میں نے شکنتلا کو سمایا ہے
تیرے بنائے ہوئے منش میری طرح مرتے رہیں گے
مگر میرے بنائے ہوئے منش تیری طرح زندہ رہیں گے"

یہی بات لینن گراڈ میں کھڑے ہو کر وہ بورس پاسترناک کرنا چاہتا تھا جو اب موجود نہیں ہے۔ اب تو کچھ بھی موجود نہیں ہے نہ وہ پولٹ بیورو اور نہ وہ احکامات جن کے جاری ہونے سے روس کی دنیا لرز جایا کرتی تھی۔ مگر زواگو آج بھی موجود ہے۔ وہ محبت کی کتاب کبھی نہیں مر سکتی۔ اگر وہ ایک سیاسی سازش ہوتی تو سوویت یونین کے بکھر جانے سے اس کا وجود باقی نہ بچتا۔ مگر وہ پیار کی کہانی آج بھی لوگ پڑھ رہے ہیں زیر زمین ٹرینوں میں سفر کرتے ہوئے اور کسی پب میں بیٹھ کر اس کو ختم کرتے ہوئے سوچتے ہیں کہ:

"اگر انقلاب روس نہ آتا تو لارا اور زواگو کے کردار کس طرح تخلیق ہوتے!!؟"

لارا اور زواگو کی محبت کی داستان دنیا میں تب تک رہے گی جب تک ایک عورت کے دل میں محبت کی موم بتی جلتی رہے گی اور ایک مرد کی پریشانی میں پیار کا پیانو بجتا رہے گا!!

کنارے پر کافکا

"یادیں تمہیں اندر سے گرماتی ہیں مگر یہ تم کو توڑ بھی دیتی ہیں"

یہ الفاظ ہیں اس ادیب کے جس کی کتابوں کو جاپان کی چپٹی ناک والی لڑکیاں ایئرپورٹوں پر اس طرح پڑھتی ہیں جس طرح کوئی محبوب کا پہلا یا آخری خط پڑھتا ہے۔

"اگر تم مجھے نہیں بھولی تو پھر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ باقی سب مجھے بھلا چکے ہیں"

اپنی مرضی کی زندگی کے کنارے پر نکل جانے والے جاپانی لڑکے "فیس بک" پر ان الفاظ کا اسٹیٹس اس طرح اپلوڈ کرتے ہیں، جیسے یہ ان کی اپنے اندر کی آواز ہو۔

"ٹالسٹائی نے ٹھیک کہا تھا۔ خوشی ایک تمثیل اور غم ایک افسانہ ہے"

کڑکتی بجلیوں والی بارش کی رات میں دیر تک جاگتے ہوئے یا حد نظر تک بچھی ہوئی برف والی صبح کو دیکھتے ہوئے جاپانی بوڑھوں کو یہ دو جملے بہت جذبہ دلاتے ہیں کہ وہ اپنی سوانح حیات لکھیں۔

یہ تینوں جملے جو ہاروکی موراکامی کی ایک ہی کتاب "کنارے پر کافکا" سے اخذ کیے گئے ہیں۔ وہ کتاب جو ایک ناول ہے۔ وہ ناول جو کہانی ہے اس کافکا کی جو جدید جاپانی معاشرے میں ایک ماڈرن مانک ہے۔ دور حاضر کا درویش اور باغی!!

وہ لڑکا جو سائنس کی بھول بھلیوں سے بھاگ کر ان کتابوں میں پناہ لیتا ہے جن میں ایک ناکام محبت کی خوشبو بسی ہوتی ہے۔ اپنے ساتھ بہت کم سامان رکھنے والا وہ لڑکا جو ایک بلی سے اس طرح محبت کرتا ہے جیسے وہ ایک لڑکی ہو اور ایک لڑکی کو اس طرح چاہتا ہے جیسے وہ ایک بلی ہو۔

اس ڈیجیٹل کلچر میں جنم لینے والا وہ لڑکا ایک راکٹ بننا نہیں چاہتا۔ وہ ایک درخت کی طرح اگنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے وجود پر وہ پھول کھلیں جنہیں توڑ کر بچے اپنا تاج بناتے ہیں۔ وہ پھول جو کوئی کسی کے لیے لیتا ہے مگر دے نہیں سکتا۔ اس لیے ان پھولوں کو وہ اپنے دل کے آتشدان میں رکھ دیتا ہے اور ایک ایسی وڈیو گیم کھیلتا ہے جو اس سے وہ یادیں ایک پل کے لیے لے لیتی ہیں جو یادیں دل کے کندھوں پر بڑا بوجھ ہوا کرتی ہیں۔

یہ کہانی اس روبوٹ کی ہے جو روتا ہے۔ جس طرح جرمن ادیب برٹالٹ بریخت نے اپنی مختصر ترین کہانی میں لکھا تھا کہ "جب وہ مجھ سے ملی تب وہ پندرہ برس کی تھی۔ پھر وہ مجھ سے بچھڑ گئی۔ سات برس کے بعد جب وہ مجھ سے دوبارہ ملی تب وہ مجھ سے لپٹ گئی اور کہنے لگی: دل کے سوا میرے جسم کا کوئی انگ کنوارا نہیں" ویسے ہی یہ روبوٹ نما لوگ اپنے ہارڈ ویئر سے الگ ہو کر سافٹ ویئر میں سماتے ہیں تب یہ ایک سرد سانس بن جاتے ہیں۔

اس بیوروکریٹ کی طرح جو ملازمتوں کی خواہشمند خواتین سے خوش ہوتے ہوئے جب رٹائرڈ ہو جاتا ہے تب ایک بھولے بسرے شاعر دوست کو آدھی رات فون کرتے ہوئے پوچھتا ہے کہ "عشق کیا ہے؟" اور وہ اس سے کہتا ہے کہ "میں اس وقت ایک شعر پڑھ رہا ہوں۔ سنو گے؟" دوسرے طرف سے صرف "ہوں" کی آواز آتی ہے اور وہ اسے یہ نظم سناتا ہے کہ:

"بانہہ ٹہنی سی تھی
ہاتھ تھا پھول سا
میری محبوب کا
چاندنی جم گئی
رات پالا پڑا
پھر بھی نکھرا رہا
اس کا رنگ حنا
میرے گھوڑے کے
باگوں پہ آ کے رکا

ہاتھ وہ پھول سا
کوئی کہنے لگا
"تم کہاں جا رہے ہو سلونے پیا؟"
لو لگتی رہی
میں چلا ہی گیا
اب تو لڑتے ہوئے شام ہونے لگی
اور لہو کی مہک رنگ کھونے لگی
لاشیں بکھری پڑی ہیں کئی زیت پر
ایک سوکھے ہوئے کھیت پر
اب کھڑا سوچتا ہوں کہ
کیوں جھڑ گیا؟
ہاتھ وہ پھول سا
میرے محبوب کا!!"

یہ نظم سنتے ہوئے بہت کچھ پانے کے باوجود سب کچھ کھونے کی کیفیت میں رونے والا وہ شخص اس درد کو سمجھ سکتا ہے جس کو جاننے کے لیے "علم" کی نہیں بلکہ اس "عشق" کی ضرورت ہوا کرتی ہے جس پر اصرار کرتے ہوئے بھلے شاہ نے کتنے غصے سے کہا تھا کہ:

"اکو حرف سانوں درکار
علموں بس کریں او یار
علموں بس کریں او یار"

وہ لفظ جس کے لیے امداد حسینی نے لکھا تھا کہ:

"پیار ہی ایک لفظ ہے
پہلا اور آخری
یوں تو ہیں سننے کو
الفاظ بے معنی بہت"

وہ لفظ اس شخص کے لیے ایک کائنات ہے۔ جس کے مداحوں نے سمجھا تھا کہ اس بار نوبیل انعام اس کو ملے گا جو "درد رقم کرتا ہے"

مگر اسے نظر انداز کیا گیا۔ غریب لڑکی کی محبت کی طرح!!

اور ادب کا عالمی انعام دیا گیا اس فرانسیسی ادیب کو جو اب تک پیرس کی گلیوں میں "روحانی رپوٹر" بن کے گھومتا ہے۔ جو اس محاصرے کی مذمت کرتا ہے جو کب کا گزر چکا۔ اب ہٹلر حال نہیں۔ ایک ایسا ماضی ہے جسے جرمن بھلانا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک جرمن شخص سیاہ سمندر کی رات میں اپنی فرینچ محبوبہ کو یہ احساس دلانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے کہ وہ ہٹلر کا بچہ نہیں۔ مگر وہ خاموش رہتا ہے اور اس سے بہت دور وہ فرینچ ادیبہ اپنا مختصر ناول لکھ چکی "خوش آمدید اے درد" وہ فرانسز ساگان اب ایک حوالہ ہے۔ وہ لڑکیاں پیرس میں ناپید ہو چکی ہیں جو بڑی عمر کے مردوں سے عشق کرتی تھیں۔ اب بات صرف دولت کی ہے!!

اب سب مایا ہے۔
سب اڑتی پھرتی چھایا ہے
اس عشق میں ہم نے
جو کھویا جو پایا ہے
سب مایا ہے!!"

مگر سب مایا ہوتے ہوئے بھی سب مایا کہاں ہے؟

اس دنیا میں داعش بھی ہے۔ اور سود خور بینک بھی۔ اس دنیا میں "امن" ایک مظلوم لفظ ہے "محبت" کی طرح! جنگی جنون میں مبتلا لوگ اور انہیں استعمال کرنے والی ریاستیں! میڈیا کی سیاست اور اس میں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے والی ترکیبیں! بات صرف سرخ مخمل میں لپٹی ہوئی اس "رائل سلیوٹ" کی نہیں جسے ایک مشہور ماڈل ناز و ادا کے ساتھ کھولتی ہے۔ جھاگ اڑاتی ہوئی شیمپین سے ذرا دور زندگی کا ایک رخ وہ زہر بھی جسے غریب موالی شراب سمجھ کر پیتے ہیں اور سرکاری ہسپتالوں میں شرمناک موت مر جاتے ہیں اور ان کے ورثاء احتجاج کے بغیر ان کی لاشیں اٹھا کر چلے

جاتے ہیں۔ یہ حکومتیں اور ان کی کبھی اکھڑتی اور کبھی پیر جماتی ہوئی رٹ! یہ دھرنے جن میں صرف جذبات پوری طاقت سے نعرے نہیں لگاتی بلکہ ان کے حوالے سے پس پردہ مفادات سرگوشی میں بات بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ فیشن اور فن کی دنیا اور یہ خطرناک ہتھیاروں کے انبار۔ یہ جاسوسی کرنے والی خوبصورت لڑکیاں اور انہیں کوکین فراہم کرنے والے کردار۔ یہ فلموں کے مہنگے سیٹ اور ان میں جھوٹ موٹ کی محبت کرتے ہوئے کوئی یادوں میں کھو جانے کی عادی زخمی روح والی اداکارہ جو اپنے آئی پیڈ پر مارلن منرو کی باتیں محبت سے پڑھتی ہے۔ یہ سچ فروشی کے تماشے اور ادب سے صحافت میں داخل ہونے والے لوگ اور صحافت کو ادب میں استعمال کرنے والے لکھاری۔ ہر دن نت نئے ڈرامے اور واقعات کی بھرپور برسات جس میں ماضی قریب کاغذ کی کشتی کی طرح گل جاتا ہے۔ جب حالات کا مزاج ایسا نہیں تھا تب بھی مایاکووسکی لکھتا تھا کہ "جب عشق کی کشتی حالات کی لہروں سے ٹکرا کر ٹوٹ جائے تب یہ حساب مت کرو کہ کس نے کتنی بے وفائی کی" اب تو ساحل اور سمندر ایک دھوکہ ہیں۔ اور کشتی کو صرف ڈوبنے کا کردار ادا کرنا ہے۔ جب ہر شے پہلے سے طے شدہ ہو تو پھر بے ساختگی کی معصومیت کس طرح بچ سکتی ہے؟ غالب نے لکھا تھا کہ "بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے" اور ایاز نے اس سے پوچھا تھا کہ "یہ فاشی سپاہی جو میرے سینے پر بندوق رکھے کھڑا ہے کیا اس نے ہاتھوں میں کھلونہ پکڑا ہوا ہے؟"

اب جو کہتے ہیں کہ درباری ادب ختم ہو چکا۔ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ ادبی دنیا کے ولین، وہ بدمعاش جنہوں نے دھرتی کا سبز اور سانولہ چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ وہ ہی لوگ مخصوص انداز سے مہنگے لباس پہن کر آتے ہیں اور آ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ اس بار ادب کا عالمی انعام کس کو دیا جائے؟ اس مخصوص ٹولے نے اس بار ہارو کی موراکامی کو نوبیل انعام کے لیے منتخب نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے پتریک مودیانو کو عالمی ادب کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اب فرانس کی سرزمین ادبی محد نہیں بلکہ ادبی لحد بن چکی ہے۔ وہ "زوال" جس کی نشاندہی کامو نے کی تھی۔ اب اس زوال نے اس پیرس کی روح کو کھوکھلا کر دیا ہے جس کے چوراہوں پر کبھی سارتر

سائمن ڈی بوار کے ساتھ پمفلیٹ بانٹا کرتا تھا۔ اب یورپ میڈیا اور گلیمر کے پلیگ میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اور خوف کو پھیلانے والے چوہے مگرمچھ کی کھال سے بنے ہوئے قیمتی پرس اور ان کلیویز سے نکل آتے ہیں جنہیں پاپارازی فوٹوگرافروں کے کیمرے بڑی مہارت سے فوکس کرتے ہیں۔

اب اس راز بے پردہ ہونے کے باوجود بہت پر اعتماد ہے کہ نوبیل پرائز دینے والی کمیٹی کسی فرد کے تخلیقی کمال کو نہیں بلکہ اس کے ملک کے سیاسی حالات کو نظر میں رکھتی ہے۔ یہ ادارہ جس کو الفرڈ نوبیل نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے جرم کے احساس کو ختم کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔ اب وہ عالمی سیاست کا ایک مورچہ بن چکا ہے۔ اس لیے بات صرف ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی نہیں بلکہ اپنے ارد گرد کے حالات سے باخبر رہنے والے قارائین بھی اب جان چکے ہیں کہ نوبیل پیس پرائز کمیٹی کے سینوں میں دل نہیں بلکہ دماغ دھڑکتے ہیں۔

یہ انعام الجیریا کی ناول نگار خاتون آسیہ جبار کو بھی مل سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کا نام بھی اس لسٹ میں موجود تھا جس میں پتریک مودیانو کے لیے کم امکانات تھے۔ مگر نوبیل پرائز والوں نے نہ آسیہ جبار کو انعام دیا اور نہ البانیا کے اسماعیل کنڈارے کو۔ انہوں نے بیلورشیا کی سویت لانا کا نام بھی اپنی لسٹ میں شامل کیا تھا جو تحقیقی صحافت میں اہم مقام رکھتی ہے مگر ان سب کا اس جاپانی ادیب سے کیا مقابلہ جو انسان اور کمپیوٹر کے درمیاں کم ہوتے ہوئے فاصلے کو بڑھانا چاہتا ہے۔ وہ جاپانی ادیب جس نے جدید دنیا کو قدیم دنیا سے جوڑنے کے لیے اپنے قلم کو سوئی کی طرح استعمال کیا ہے۔ اس کے چاہنے والوں کو نوبیل انعام والی کمیٹی کے اس فیصلے پر غصہ آیا ہو گا۔ مگر اس غصے اور غم سے بہت دور درد کی جھیل کے کنارے بسنے والا وہ شخص جس کا نام ہاروکی موراکامی ہے۔ اس نے نوبیل انعام نہ ملنے کا کوئی سوگ منانے کے بجائے اس موضوع کو ماورائے حقیقت والے انداز میں ملا کر ایک ایسی کہانی کا پلاٹ تیار کر لیا ہو گا جو نوبیل انعام دینے والوں پر ادبی ایف آئی آر کے طور پر پڑھی جائے گی۔

سیاسی کھیت

اقتداری سازشوں نے سندھ کی سیاست کو ایک بار پھر اس اوپن ائیر جیل میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں ووٹ دینے والے غلام قید ہیں۔ وہ قید ہیں قبائل کے نام پر! وڈیرے کی وفاداری کے نام پر! پیری مریدی کے دام میں اب اس سندھ کا دم نہیں گھٹتا جو جمہوری جدوجہد کی صاف ستھری ہوا میں سانس لیتا تھا۔ ایسا نہیں کہ وہ لوگ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ انہیں گاؤں کی سرحد عبور کرنے کی اجازت حاصل نہیں۔ وہ آزاد غلام ہیں۔ جہاں جائیں آزاد ہیں۔ جو کریں آزاد ہیں۔ چاہیں تو کھیتوں میں ہل چلائیں۔ چاہیں تو بھنبھناتی مکھیوں والے دیہاتی ہوٹلز پر دودھ پتی چائے پئیں اور رات دیر تک جنریٹر پر چلتا ہوا ٹی وی دیکھیں۔ چاہیں تو چور بن جائیں۔ اور چاہیں تو بوریا بستر باندھ کر کراچی کے طرف آنے والی کوچ میں بیٹھ جائیں اور یہاں کسی نجی سکیورٹی کمپنی میں گارڈ بن جائیں اور کلاشنکوف کی طرح نظر آنے والی ایک زنگ آلود گن لیکر کسی بنک کے دروازے پر کھڑے ہو جائیں۔

وہ آزاد ہیں۔

اس ترکی نظم کی طرح جس میں سرد جنگ کے دوراں گرم گیت لکھنے والے شاعر نے استنبول سے بہت دور بستے ہوئے اس ہم وطن کسان کے لیے لکھا تھا کہ:

"وہ آزاد ہے
چاہے اپنے سر کی جوئیں

نکالے یا نہیں!"

اسی طرح بیوی پر حملے کی طرح محبت کرنے والا وہ دیہاتی سندھی آزاد ہے جو کچھ نہیں کماتا۔ اور پڑوسی کی بیوی کے ساتھ ""مس کال" والی محبت کرتا ہے۔ اس کی ""پیکیج" والی پوزیشن بھی نہیں۔ وہ اپنی چارپائی پر تنہا لیٹ کر ""مس کال" دیتا ہے اور ""مس کال" لیتا ہے۔ وہ اس دوسری چارپائی کی طرف دیکھتا تک نہیں جہاں اس کی محنت کش بیوی چار بچوں کے ساتھ گہری نیند میں غرق ہوتی ہے۔

وہ شخص شہر میں آزاد اور گاؤں میں غلام ہے۔ وہ جو گھر والی پر تشدد کرتا ہے۔ مگر وڈیرے کی اوطاق پر ذلیل ہوتا ہے۔ وہ چھوٹے گاؤں کا چھوٹا وڈیرہ جو ولائتی بوتل میں لوکل شراب پیتا ہے اور آوٹ ہو کر سب کو گالیاں دیتا ہے۔ اور جب صبح ہوتی ہے تب ""ایس ایچ او صاحب" کی دعوت کو مینیج کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ وڈیرہ جو اپنے کمدار سے کہتا ہے کہ ""ایس ایچ او صاب صرف کھانے پینے تو نہیں آ رہا۔ باقی انتظام بھی کر لیا ہے؟"

""جی سائیں" کمدار پروفیشنل انداز میں کہتا ہے۔

پھر صحت مند مرغی کٹتی ہے اور بیمار لڑکی ناچتی ہے۔

محفل آدھی رات تک چلتی ہے!

دوسرے دن دوپہر کے کھانے پر منسٹر صاحب کا مقامی ایجنٹ آتا ہے اور وڈیرے کو بتاتا ہے کہ ""صاحب نے اس بار بلدیاتی انتخابات میں اپنے بھانجے کو کھڑا کیا ہے اور اس کو کامیاب کرنا ہم سب کی عزت کا سوال ہے"

رات کی محفل کا تھکا ہوا وڈیرہ انگڑائی لیتے ہوئے کہتا ہے کہ ""وزیر صاحب کی عزت ہماری عزت ہے۔ میرے دو پولنگ اسٹیشن اور دو ہزار ووٹ ہیں۔ وہ نوٹوں کی طرح سائیں پر نچھاور کر دیں گے"

وزیر کا مقامی ایجنٹ خوشی سے مسکراتا ہے اور وزیر صاحب کو فون ملاتا ہے اور اس کا آفیشل سیکریٹری بتاتا ہے کہ ""صاحب ابھی تیار ہو رہے ہیں" اور مقامی ایجنٹ خوشی میں کھل کر کہتا ہے ""ٹھیک ہے" اور فون کال کو آف کرتے ہی وڈیرے کو بتاتا

ہے کہ "صاحب وزیر اعلی کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہیں مگر میرا وعدہ ہے کہ صاحب آپ سے خود بات کریں گے"

اور وڈیرہ امید سے چہک اٹھتا ہے۔ اور کہتا ہے "کوئی بات نہیں۔ وزیر صاحب فون نہ بھی کریں تب بھی ہمارے ووٹ آپ کے ہوئے"

وزیر کا مقامی ایجنٹ مسکرا کر کہتا ہے "آپ کو ایک ووٹ کے پانچ سو مل جائیں گے"

"صرف پانچ سو!!!!؟" یہ کہتے ہوئے وڈیرے کا چہرہ اتر جاتا ہے۔ اور وہ وزیر کے مقامی ایجنٹ سے کہتا ہے کہ "مجھے ایک ووٹ کے پانچ ہزار روپیے کی آفر ہے۔ مگر میں نے کہا کہ ہم وفادار ہیں۔ اس لیے معافی کے طلبگار ہیں۔ مگر آپ بھی تو سوچیں کہ پانچ سو میں کیا ہو گا؟ اس سے اچھا ہے ہم آپ کو اپنے سارے ووٹ مفت دے دیں"

مقامی ایجنٹ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر وڈیرہ اسے روکتے ہوئے کہتا ہے کہ "اب ایک کوڑی لینا بھی حرام ہے۔ ووٹ آپ کے ہوئے۔ بس۔۔۔۔۔!!"

"بس نہیں" وزیر کا مقامی ایجنٹ ذرا قریب کھسک کر وڈیرے سے کہتا ہے کہ "آج کل صاحب ذرا بڑے خرچوں میں آگئے ہیں مگر صلہ ملے گا۔ شاید ان انتخابات کے ہوتے ہی صاحب وزیر اعلی بن جائیں۔ پھر ٹھاٹھ کرنا۔۔۔۔! ٹھاٹھ۔۔۔۔۔!!"

وزیر کا مقامی ایجنٹ مصنوعی مسرت کا مکمل اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اور آخر میں ایک ووٹ پندرہ سو پر بات طے ہو جاتی ہے۔

وڈیرہ ایڈوانس لیتا ہے اور کمدار کو دیتا ہے اور مقامی ایجنٹ کو رات ٹھہرنے کی دعوت دیتا ہے۔

"نہیں۔ مجھے ابھی جانا ہے۔ آج شام کو کراچی روانہ ہونا ہے۔ واپسی پر پہلی دعوت آپ کی" یہ کہتے ہوئے مقامی ایجنٹ بوسکی کی قمیض کی سلوٹیں ٹھیک کرتے ہوئے اٹھتا ہے اور وڈیرہ اسے کار تک چھوڑنے آتا ہے اور روایتی طور پر رخصت ہو کر کمدار سے پوچھتا ہے "پیسے گن لیے؟"

"جی سائیں! پورے بیس لاکھ ہیں" کمدار خوش ہو کر بتاتا ہے۔

اور دوسری دوپہر کو سارے گاؤں والوں کو بلاتا ہے اور وڈیرہ ان کو بتاتا ہے کہ ”کل وزیر صاحب نے مجھ سے ایک گھنٹہ فون پر بات کی اور کہا کہ ”تمہارا بھانجا الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہے۔ تم چاہو گے تو جیتے گا۔ نہ چاہو گے تو ہار جائے گا۔ اب تمہاری مرضی ہے۔ کامیاب کرو یا ناکام؟؟ میں نے وزیر صاحب سے کہا کہ آپ کی عزت ہماری عزت ہے۔ مگر مجھے اپنے لوگوں سے مشورہ کرنا ہے۔ تو کیا ہے مشورہ آپ کا؟“
وہ سب سر جھکا کر کہتے ہیں ”جو حکم سائیں!!“

اور سائیں خوش ہو جاتا ہے۔ وہ سائیں جس کا کراچی میں ایک چھوٹا سا فلیٹ بھی ہے۔ جہاں وہ منسٹر صاحب سے ملنے کے لیے دس بارہ دن ٹھہرا رہتا ہے اور سندھ سیکریٹریٹ سے لیکر سندھ اسیمبلی تک کلف والے کاٹن کے کپڑے پہن کر خوار ہوتا رہتا ہے۔ منسٹر کے اسٹاف کی دعوتیں کرتا ہے اور پھر بھی اس کا کام نہیں ہوتا اور پھر گاؤں واپس لوٹتے ہوئے سپرہائے پر ڈرائیور سے شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ”پورا ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوگیا اور کام بھی نہیں ہوا۔۔۔خیر آنے دو انتخابات۔۔۔کہاں جائے گا یہ منسٹر؟“ پھر پانچ برس پرانی کرولا کی اے بُر کنڈیشنڈ ہوا میں اسے نیند آنے لگتی ہے اور وہ کراچی میں قیام کے دوراں کی جانے والی عیاشی کو یاد کرتے ہوئے سو جاتا ہے۔ اور جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تب وہ اپنے سر پر ٹوپی کو سیدھا کرتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھتا ہے ”حیدرآباد آگیا؟“ ڈرائیور ٹول پلازہ کا اسپیڈ بریکر عبور کرتے ہوئے گاڑی کو دوسرے گیئر میں اٹھاتا ہے اور کہتا ہے ”سائیں بائے پاس پر ہیں۔ حیدرآباد چلنا ہے؟“ وڈیرہ دریائے سندھ کی لہروں پر چمکتی ہوئے سورج کے کرنوں پر نظر ڈال کر کہتا ہے کہ ”نہیں۔ گاؤں چلو۔“ اور پھر جیب سے موبائل فون نکال کر کمدار کو فون کرتا ہے اور اس کو کہتا ہے کہ ”دو گھنٹوں میں پہنچنے والا ہوں۔ گاؤں میں خیریت ہے؟“ کمدار اسے کچھ بتانا چاہتا ہے مگر وہ اسے ڈانٹ کر کہتا ہے کہ ”ولی محمد تمہارے سارے بال سفید ہوگئے ہیں مگر تمہیں ابھی تک عقل نہیں آئی۔ ایسی باتیں فون پر نہیں کی جاتیں۔ جانتے بھی ہو کہ آج کل کیسے حالات چل رہے ہیں۔ دو گھنٹوں میں پہنچ رہا ہوں۔ باقی باتیں روبرو“

وہ وڈیرہ شام کو گاؤں کی کچی سڑک پر دھول اڑاتے ہوئے اپنے پکے مکان کے دروازے پر پہنچتا ہے۔ کمدار "بسم اللہ بسم اللہ" کہتے ہوئے اس کا عزت سے استقبال کرتا ہے۔ اور وڈیرہ گھر میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں اس کی چھوٹی بیوی شہر سے آنے والے تحفے کے انتظار میں ہے اور بڑی بیوی نئے کپڑے پہنے اس کی طرف کچھ شوق اور کچھ شکایت سے دیکھتی ہے۔ چھوٹے گاؤں میں شام کا سورج ڈھلنے سے قبل یہ خبر عام ہو جاتی ہے کہ "سائیں واپس آگیا" مگر اس رات وہ اوطاق پر محفل نہیں جماتا۔ وہ رات وہ گھر پر گزارتا ہے۔ بڑی بیگم کی شکایتیں سنتا ہے۔ چھوٹی بیگم کو محبت سے مناتا ہے۔ اور دوسرے دن صبح کو کمدار بتاتا ہے کہ "عاقل خان ملنا چاہتا ہے" وڈیرہ مکھن سے پراٹھا کھاتے ہوئے کہتا ہے کہ "اس کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ اسے کہو آج رات دیر سے آئے" کمدار جھک کر کہتا ہے "جو حکم سائیں"

پھر وہی اوطاق، وہی وڈیرہ! دن کو فیصلے اور رات کو محفلیں!!

وہ وڈیرہ جو اب یہ جان گیا ہے کہ زراعت میں وہ آمدنی نہیں جو سیاسی کاروبار میں ہے۔ وہ اپنے گاؤں اور آس پاس کے لوگوں کو ڈاکوؤں کی معرفت ڈرا کر رکھتا ہے اور ڈاکوؤں کو پولیس والوں سے اور پولیس والوں کے اعزاز میں محفلیں منعقد کرتا ہے اور جب ایس ایچ او ذرا مخمور ہو کر وڈیرے سے پوچھتا ہے کہ "بھوتار! اس بار شہر میں کچھ زیادہ دن ٹھہر گئے" تب شہر کی ذلتیں یاد کرتے ہوئے وڈیرہ کہتا ہے کہ "ایس ایچ او صاحب! کیا کریں؟ ہر رات منسٹر صاحب کی دعوت!! ہر بار کہتے رہے کہ نورل خان کبھی کبھار تو ہمارے مہمان بنتے ہو۔ تم کو ایسے نہیں چھوڑیں گے" ایس ایچ او خوشامدی قہقہہ لگاتا ہے اور وڈیرہ موچھوں کو تاؤ دیتا ہے!!

پھر اس رات کی صبح ہوتی ہے۔ مجبور لوگ اوطاق پر انتظار کرتے ہیں۔ کسی کی بیٹی اٹھائی گئی اور کسی کا بیٹا لاکپ ہوا۔ سوالی لوگوں کی حسب حیثیت بے عزتی کرنے والا وڈیرہ بار بار فون ملاتا رہتا ہے اور کسی سے نیچی آواز میں تو کسی سے گرج کر بات کرتا ہے اور دوپہر کو تھک ہار کر حویلی کی طرف جاتا ہے۔ جہاں اس کی دونوں بیویاں کسی دن آپس میں محبت کے ساتھ باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ اور وڈیرہ خوش ہو کر کہتا ہے کہ آج

سورج کس طرف سے طلوع ہوا تھا؟ وڈیرے کی بات سن کر دونوں مسکراتی ہیں اور بڑی بیگم ذرا نخرے سے کہتی ہے کہ "میں چھوٹی کو کہہ رہی تھی کہ اپنے میاں سے کہو کہ کبھی اوطاق سے اٹھ کر کھیتوں کا چکر بھی لگا کر آئے" چھوٹی بیگم آنکھیں مٹکا کر کہتی ہے "جی"

اور وڈیرہ کہتا ہے کہ "جو فائدہ سیاسی کھیتوں میں ہے وہ زرعی کھیتوں میں کہاں؟ مگر تم عورتوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی!!"

دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے وڈیرہ ہاتھ دھوتا ہے۔ بڑی بیگم کھانا لگاتی ہے۔ چھوٹی شرما کر کھاتی ہے۔ اور دیوار پر بیٹھا ہوا کوا ملک کی سیاسی صورتحال پر کسی اینکر پرسن کی طرح بولے چلا جاتا ہے۔۔

عرب خزاں میں جھڑنے والے پھولا لو داع

اب جاؤ!
اور پابلو نرودا کی طرح
ارنیسٹ ہیمنگوے کی قبر کشید کرو
اور اس کو ٹائی سے کھینچ کر اس ساحل پہ لاؤ!
جہاں ایلان کی وہ لاش پڑی ہے
جو سمندر کی لہروں سے لڑتی ہوئی!!
اس ترکی کے ساحل پر پہنچی
جو صرف "میر اسلطان" نہیں ہے!

اگر "وداع جنگ" کے مصنف نے اپنی شکاری بندوق سے خودکشی نہ کی ہوتی اور وہ اس وقت بھی زندہ ہوتا تو "بچہ اور سمندر" کے عنوان سے ایک اور ناول لکھتا اور اس قطرے کو سمندر بنا دیتا جو سبز، سیاہ اور بھوری آنکھوں میں ایک آنسو بن کر تیر رہا ہے۔

ایلان! نیلی نکر اور سرخ رنگ کی شرٹ پہن کر یونان کی اس سرزمین پر اترنے کی تمنا لیے کشتی میں سفر کر رہا تھا جہاں انسانی تہذیب نے جنم لیا تھا۔ مگر اس معصوم بچے کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ وہ اس یونان میں جانے کی تمنا کر رہا ہے جس یونان نے سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا تھا۔

اس لیے بات ایلان کرودی کی موت کی نہیں۔ اصل بات سقراط کو پھر سے زہر پلانے کی ہے۔ اور اس دور کا سقراط وہ ایلان تھا جو سارے سمندر کا زہر پی گیا۔

سمندر سب کو ڈبو دیتا ہے۔ ایلان نے سمندر کو ڈبو دیا۔ اور ایک ناکام بحر دیوانگی کے عالم میں دنیا کے ہر ساحل سے سر ٹکرا رہا ہے۔

اور اعتراف کر رہا ہے کہ "ایلان" نے مجھے شکست دے دی!!

یہ سمندر مفتوح ہے۔ جس کے ساحل پر اس مردہ اور معصوم ہیرو کی لاش پڑی ہے۔ جس کا نام "ایلان" ہے۔

اس ایلان نے اس دنیا سے کیا لینا چاہا؟

نہ شامی حکومت کا تخت! نہ سعودی حکومت کا تاج!

اس کی تمنا ایک غبارہ اور ایک آئس کریم تھی!!

اسے سلطنت نہیں۔ ماں کی آغوش چاہیئے تھی۔ وہ ماں۔ جو اس کو بچاتے ہوئے اس طرح ڈوب گئی جس طرح "ٹائٹانک" میں "جیک" ڈوب گیا تھا۔

ہم کچھ نہیں جانتے کہ ایلان کس طرح ڈوبا؟

مگر ہم تصور تو کر سکتے ہیں اس ماں کا، جو سمندر کی لہروں میں سیفٹی بوٹ کا انتظار کرتے ہوئے، اس ایلان کو آخری بار وہ لوری سنا رہی تھی جو اس نے اپنی ماں سے سنی تھی۔ جو اس کی ماں نے اپنی ماں سے سنی تھی۔

وہ ماؤں کا گیت سنتے ہوئے ایلان سمندر میں سو گیا۔

....

وہ ایلان جس نے اس شام میں جنم لیا۔ جس شام کی مٹی سے نزار قابانی کی شاعری پیدا ہوئی تھی۔ اگر اس دور میں نزار قابانی زندہ ہونے کی سزا کاٹتا تو وہ اپنی محبوب رفیق حیات بلقیس الراوی کے قتل پر لکھی ہوئی اس نظم سے کہیں زیادہ تلخ نظم تحریر کرتا جس نظم میں اس نے بتایا تھا کہ:

"جب ایک خوبصورت عورت مرتی ہے
تب دھرتی اپنا توازن کھو دیتی ہے!

چاند سو برس کے سوگ کا اعلان کرتا ہے
اور شاعری بے روزگار ہو جاتی ہے!!"

جب ایک حسین عورت کی موت کائنات میں اتنا تہلکہ مچا دیتی ہے تب ایک معصوم بچے کی موت کتنا بڑا سانحہ بن جاتی ہوگی! اس معصوم فرشتے کی لاش دیکھ کر نزار قابانی خاموش رہتا؟ نہیں ہرگز نہیں!! اس کا ہر لفظ ایک چیخ بن جاتا اور آنسوؤں کی دھار والے ردم کے ساتھ لکھتا کہ:

"اس رات پوری کائنات سوگ میں ڈوب گئی
جس رات نمکین لہروں پر ڈولتی ہوئی
ایلان کی لاش ترکی کے ساحل سے ٹکرائی
اور ناظم حکمت کی نظمیں رونے لگیں!
بھیگی ہوئی کتابوں کو
سخاوت کے اعلانات مت سکھاؤ!
ان کو رونے دو!!
اس علم اور ادب کو رونے دو
جو احساس پیدا کرنے کے لیے تخلیق ہوا
مگر احساس کہاں ہے؟
عرب ممالک کے عیاش حکمرانوں
اور بے حس شہزادوں کو بتاؤ
"اب معصومیت کبھی مسکرا نہیں پائے گی"
وہ معصومیت جو ایلان کے سرد گالوں پر
منجمد ہو گئی!!
ایلان! کاش ہم تمہاری شرٹ کو
احتجاج کا پرچم بنا سکتے
کاش! ہم ایک اور تحریر چوک سجا سکتے

کاش! ہم تمہارے کھلونوں کو ٹینکوں سے لڑا سکتے!!
عرب بہار تو ایک دھوکہ ثابت ہوئی
عرب خزاں میں جھڑنے والے پھول
الوداع!!
اب ہم تم کو بھولنے کی کامیاب کوشش کریں گے
مگر تم ہمیں جب بھی یاد آؤ گے
ہمیں ہمارے گناہ یاد آئیں گے!!"

کراچی کبوتر

بے خوابی کی بیماری میں مبتلا یہ شہر گذشتہ تین دہائیوں سے نہیں سو سکا۔

”ایسے جیسے پردیسی پرندہ
میں تو اپنے گاؤں میں بھی سوتا ہوں
مسافر کی طرح“

وہ شہر جس کے مقدر میں اس جاپانی ہائیکو جیسی نیند بھی نہیں۔

برٹش دور کی زبوں حال عمارت کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پاس جنگلی کبوتر کی طرح دو پل کے لیے آنکھیں موند کر پھر جاگ جانے والا یہ شہر اب کچھ دیر کے لیے سو سکتا ہے۔ لیکن اس معصوم پرندے کے چھوٹے سے دل میں بدامنی کی بلی کا خوف ابھی تک موجود ہے۔

ہٹلر کا قریبی ساتھی گوئرنگ کہا کرتا تھا کہ ”آرٹ کا نام سن کر میرا ہاتھ پستول کی طرف بڑھ جاتا ہے“ اور گولی کی آواز سن کر اس شہر کے ہر دوکاندار کا ہاتھ اب بھی شٹر کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ بغیر دیکھے۔۔۔ بغیر پوچھے۔۔۔۔ اور بغیر سوچے!!

سعادت حسین منٹو کے افسانے کے برعکس اس شہر کے لاشعور میں ”بند کر دو“ کی بازگشت ابھی تک گونج رہی ہے۔ حالانکہ حالات بدل رہے ہیں۔ اب نئی گاڑی خریدنے والے شخص کے پاس بھتے کی وہ پرچی نہیں آتی جس آخر میں ”ورنہ“ کے نیچے اسکوائش ٹیپ سے ٹی ٹی کی گولی چپکی ہوتی تھی۔ اب لوگ مہنگے موبائل فون سرعام استعمال کرنے لگے ہیں اور دوکانوں کے دروازوں پر پرائیوائیٹ گارڈز کسی حد تک

پر سکون نظر آتے ہیں۔

اب یہ شہر کسی لمحے deja vu جیسا جھٹکا بھی کھاتا ہے۔ اس کو ایسا بھی لگتا ہے کہ اگست کی نرم ہواؤں میں اس دور کی خوشبو رچتی جا رہی ہے جو بے خوفی کا دور تھا۔ وہ پولیس افسران جو چھٹی والے دن آئینے میں دیکھ کر سوچتے ہیں کہ بالوں کو رنگ کریں یا نہیں؟ انہیں اپنے طالب علمی کے وہ دن یاد ہیں جب آدھی رات کو دوست کے گھر سے پیدل آتے تھے اور سڑک پر کوئی سایہ دیکھ کر گھبرانے کے بجائے خوش ہوا کرتے تھے کہ ''بادل، چاند اور میرے علاوہ سنسان راستے پر ایک مسافر اور بھی ہے'' مگر وہ دور بارود اور جلتے ہوئے ٹائر کی بو میں دفن ہو گیا۔

''میرے بچے! رت جگے اور بے خوابی میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے'' اپنے نوجوان بیٹے کو امن اور بدامنی کا فرق سمجھانے والا وہ شخص امن کا انتظار کرتے ہوئے بوڑھا ہو گیا۔ مگر اب بھی وہ یہ بول گنگناتے ہوئے مسکراتا ہے کہ:

''دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے پھر بھی آئے تو
آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا ویسے ہم گھبرائے تو''

لیکن وہ گھبراہٹ اب تک ان دماغوں کے دروازوں پر دستک دے رہی ہے۔ جب بھی شہر میں گولی چلتی ہے اور ایمبولنس کے سائرن سے پہلے سارے چینلز کے رپوٹرز اپنے سینئر اینکرز کی نقالی کرتے ہوئے اس طرح چیختے ہیں جس طرح کسی دور میں ہاکی کے میچ کے دوراں کمینٹری کرنے والے اس وقت بے قابو ہو جایا کرتے تھے جب کوئی کھلاڑی گیند کے ساتھ ''ڈی'' میں داخل ہو جاتا تھا۔

یہ شہر اب بھی بدلے ہوئے حالات کو حقیقت ماننے سے ڈرتا ہے۔ اس کو لگتا ہے یہ امن اس کا وہم ہے۔ پھر یہ شہر جنگل میں بدل جائے گا اور بدامنی کے بھیڑیے نامعلوم سمتوں سے نکل آئیں گے اور پھر سے شہر تشدد والی سائنس فکشن مووی بن جائے گا اور ٹارگیٹ کلرز سڑکوں سے نمودار ہونے لگیں گے اور ٹی وی اسکرین وڈیو گیم کی طرح گولیوں کی بارش میں بھیگ جائے گی۔

جب سیاست کے ہاتھ میں مائک تھا تب کس قدر سکون تھا۔ راہ چلتے ہوئے لوگ

چھوٹے جلوسوں پر فقرے کستے ہوئے نئے نعرے بناتے تھے اور جب سیاست کے ہاتھ میں بندوق آگئی تب ماحول تعفن سے بھر گیا اور زندگی سانس لینے میں دشواری محسوس کرنے لگی۔ اور آہستہ آہستہ امن اس شہر سے رخصت کرنے لگا جس شہر میں رہنا ایک موج اور مستی تھی۔ اس شہر میں خوف کے سائے بڑھتے گئے اور امن سکڑنے لگا۔

اس سلسلے میں خوبصورت خواتین بھی بتا سکتی ہیں کہ ان کو کب محسوس ہوا کہ دوبارہ دیکھنے والوں کی نظر ان کے حسن پر نہیں بلکہ ہاتھوں میں جھولتے ہوئے پرس اور کانوں میں جھومتے ہوئے جھمکوں پر تھیں۔ یہ شہر امن کے بعد ایک طویل بدامنی میں داخل ہوا اور معصوم محبت والی فلموں کی جگہ ''بھائی گیری'' والی فلموں کی ڈمانڈ بڑھ گئی۔ جب بدامنی اپنا مارکیٹ بنالیتی ہے تب جرم کی جڑیں بہت گہری ہو جاتی ہیں۔ وہ شہر جس کی سڑکوں پر سرخ پھولوں کی پتیاں اڑا کرتی تھیں اس شہر کی نالیوں میں خون نظر آنے لگا اور لوگوں کے درمیاں اعتماد کا رشتہ ختم ہونے لگا۔ اجنبیت بڑھتی گئی۔ فاصلوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ محبت ایک مفاد بن گئی اور دوستی کاروبار! نیکی دکھاوے سے زیادہ ایک جال کی صورت اختیار کرنے لگی اور ایمبولنسوں میں ہتھیار منتقل ہونے لگے۔ وقت اپنی بے بسی پر ماتم کرتا رہا۔ لوگ چلاتے رہے اور بچے چیختے رہے۔ امن۔۔۔امن۔۔۔۔امن!! مگر امن کہیں بھی نہیں تھا۔ سیاسی سوداگر پریس کانفرنسوں میں امن کے جھوٹے وعدے کرتے رہے اور تعلیم تباہ ہوتی گئی۔ تہذیب نے دم توڑ دیا اور کتابیں ان ردی کے ڈھیروں پر آگئیں جن میں ہاتھ ڈالنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ اس شہر میں قانون تو ایک مذاق بن گیا تھا۔ جب لوگ قاتلوں کے آگے پیچھے پروٹوکول والی گاڑیاں دیکھتے تو ان کا دل شدت سے کہتا کہ ''آ اب لوٹ چلیں'' اس گاؤں میں جہاں آج ہر موسم امن کا موسم ہوا کرتا ہے۔ جہاں آدھی رات کو چاند کا ہر منظر دیکھنے کے لیے انسان دور دور تک نکل جاتا ہے! مگر جرم نے ہوس کو بڑھایا اور ریئل اسٹیٹ کا بزنس ترقی کرتا گیا اور لوگ جان ہتھیلی پر رکھ پر بھی اس کراچی کا رخ کرنے لگے جہاں اندھیرا مسلسل بڑھ رہا تھا اور اچانک چوراہوں پر کبوتر کلچر فروغ پانے لگا۔ لوگ نیکی کرنے کے لیے چوراہوں پر دانہ ڈالنے لگے اور اس شہر

میں کبوتر بڑھتے گئے اور ان مقامات پر بھی جہاں بدامنی تھی۔ ناانصافی تھی۔ کرپشن اور اقربا پروری تھی۔ جو مقامات میرٹ کا مقتل تھے وہاں پر بھی کبوتر اڑتے نظر آتے۔ مگر میڈیا میں یرغمال ہو جانے والے اہل قلم حضرات کے پاس نہ وقت تھا کہ وہ لکھتے کہ:

"کراچی ایک مظلوم کبوتر ہے
وہ مظلوم کبوتر جو بدامنی کی بلی کے ڈر سے
برسوں سے جاگ رہا ہے!"

وہ مظلوم کبوتر جس کو نام نہاد امن ریلیوں میں اڑایا جاتا ہے۔ وہ مظلوم کبوتر جس کو دانے کے لالچ میں چوراہوں کی اوپن ایئر جیلوں میں قید کیا جاتا ہے۔ جس کو نئی مصوری سیکھنے والے آرٹ کے طالب علم اپنے کینوس پر اس تیر کے ساتھ پینٹ کرتے ہیں جو ان کے مختصر اور معصوم وجودوں میں پیوست ہوتے ہیں۔

یہ ایک عظیم المیہ تھا کہ بدامنی کے بلے کبوتروں کو اپنی عالمی علامت بنا کر پیش کرتے رہے اور بم دھماکوں کے دوراں ان کبوتروں کی کندھوں پر نمائش کی جاتی۔ وہ کبوتر جنہیں امن کے نام پر ڈالر بٹورنے والی این جی اوز کے ملازمین ایمپریس مارکیٹ سے خرید کر لے آتے اور پریس کلب کے سامنے اسے اڑنے پر مجبور کر دیتے۔ وہ کبوتر کہیں نہیں جاتے اور آس پاس کے درختوں پر بیٹھ جاتے۔ اور انتظار کرتے کسی بلے کا یا کسی شکاری کا!!!

اخبارات کے بزنس پیجز پر یہ الفاظ بار بار شایع کیے جاتے رہے کہ "جب گولی چلتی ہے تب سب سے پہلے سرمائے کا پرندہ اڑ جاتا ہے" کیا امن صرف کاروباری لوگوں کی ضرورت ہے؟ امن تو زندگی کی بنیاد ہے۔ امن تو حیات کا حسن ہے۔ امن تو انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ صرف مسکرانے کے لیے اور دل لگانے کے لیے نہیں بلکہ جینے کے لیے بھی!!

وہ امن اس شہر میں کبوتر بن گیا، جس کی گول آنکھوں میں کبھی نیند نے ڈیرے نہیں ڈالے۔ جو کبھی نہیں سو پایا۔ جو جھپکیاں لیتا اور جاگتا رہا۔ جو سوچتا رہا کہ ایسا وقت کب آئے گا جب وہ سکون سے سو پائے گا۔ اب جیسا تیسا ہی سہی امن تو آیا ہے۔ اگر

امن مکمل طور پر اپنی موجودگی کی گواہی دینے سے قاصر ہے تو کم از کم اس کی ابتدا تو ہوئی ہے۔ امن کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ شہروں کو بدامنی کے بہت بڑے جھٹکوں سے بچالیتا ہے۔ اگر اس شہر میں امن نہ ہوتا تو کیا گذشتہ روز بہادرآباد میں ہونے والی فائرنگ کے بعد یہ شہر شام اور رات تک شمشان گھاٹ کا منظر نہ پیش کرتا۔ مگر امن تھا اس لیے بدامنی کی سازش نے دم توڑ دیا اور جسم کے اوپر والے حصے میں پانچ گولیاں کھانے کے باوجود ایک سیاسی رہنما بچ گیا اور طارق روڈ کی مارکیٹ خوف سے زیادہ افسوس کی وجہ سے بند ہو گئیں مگر یہ شہر کھلا رہا۔ یہ خوف ہی تھا جس کی وجہ سے میڈیا کا مرکز خوش قسمتی سے بچ جانے والا رشید گوڈیل ہی رہا اور کسی کو یاد نہیں رہا وہ غریب ڈرائیور جو دم توڑ گیا۔ جو محنت کش تھا۔ معصوم تھا۔ مسافر تھا!!

وہ عبدالمتین جو بٹ گرام سے آیا اور بٹ گرام واپس چلا گیا۔ اس کے آخری سفر کبوتر جیسا کراچی اپنی گول آنکھوں سے دیکھتا رہا!!

وادیاں اور اداس شہزادیاں

''بونی''تو بچ گئی ہے۔ مگر ''دورش''کیسی ہے؟
اور ''سنوگر''کا کیا حال ہے؟
کیا''رمبور''اب تک رو رہی ہے؟
اچھا! مجھے ''ریشن'' کے بارے میں بتاؤ
''آیون''تو ٹھیک ہے نا؟
''دروغل''اور''آوی''کا کیا ہوا؟

ایسے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نام ہیں جنہیں سن کر ذہن میں حسین لڑکیوں کے تصورات ابھرنے لگتے ہیں۔ مگر یہ نام ان وادیوں کے ہیں جو کوہ قاف کی شہزادیوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ جہاں دھوپ کی سنہری کرنیں پہاڑی نالوں کی چنچل لہروں پر رقص کرتی ہیں۔ جہاں تھوڑی سی ہوا چلے تو گھر کے آنگن پھولوں سے بھر جاتے ہیں۔ جہاں بچے بھیڑ کے ممونوں سے کھیلتے ہیں۔ جہاں جھگڑے نہیں ہوتے۔ اگر کسی کو ناقابل برداشت غصہ آجائے تو وہ مخالف کا خون نہیں بہاتا بلکہ اس پر پانی کے چند چھینٹے پھینکتا ہے۔

''میں نے چترال سے زیادہ پرامن لوگ پوری دنیا میں نہیں دیکھے''اگر انگریز ادیب وی ایس نیپال اپنے سفرنامے میں یہ الفاظ نہ بھی لکھتا تب بھی وہاں سے گذرنے والا ہوا کا جھونکا بھی یہ گواہی دیتا کہ ''چترال ناقابل بیان حد تک معصوم ہے'' مگر وہ

معصومیت اس وقت زخموں سے چور ہے۔ وہاں کے انسان نما پرندے کس اذیت سے گزر رہے ہیں؟ اگر اہلیان چترال کی حالت زار کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرنا ہے تو آپ کو آنے والی بہار کا انتظار کرنا پڑے گا۔ جب مارچ کی سرد ہوائیں گزر جائیں گی اور اپریل کی آغوش میں اچھا موسم کروٹ لے گا۔ تب وہاں جانا۔ تب تک وہ پُل کسی حد تک تعمیر ہو جائیں گے جن کے بہہ جانے کے باعث اب اہلیان چترال بیس منٹ کا فاصلہ چار گھنٹوں میں طے کرتے ہیں۔ مگر وہ پھر بھی شکایت نہیں کرتے۔ بارشوں کے باعث آنے والے سیلاب نے جنت کو جہنم بنا دیا ہے مگر چترال کے منہ سے کوئی چیخ تو کیا ایک آہ تک نہیں نکلی۔ کیوں کہ تاریخ کے بدترین سیلاب نے ان کے صبر کے بند نہیں بہائے۔ وہ پرندوں کے مانند بکھرے ہوئے تنکے پھر سے جمع کر رہے ہیں اور صرف اپنے ہی نہیں بلکہ اپنے پڑوسیوں کے آشیانے پھر سے تعمیر کر رہے ہیں۔ اس لیے جب وہ لکڑی کے چھوٹے سے مکانات پھر سے تعمیر ہو جائیں اور جاپان کی امداد سے بنے ہوئے چھوٹے سے بجلی گھر پھر سے کام کرنے لگیں اور سفید سیور کی روشنی میں گلابی گالوں والے لوگ پھر سے مسکراتے نظر آئیں، پھر آپ جائیں ان وادیوں میں جہاں لوگ گھروں کے دروازے صرف اس لیے بند کرتے ہیں کہیں کوئی جانور نہ آجائے۔

جب زخموں سے چور چترال اپنے پیروں پر پھر سے کھڑا ہو جائے اور بازاروں میں خریداری پھر سے شروع ہو جائے تب آپ یہ جان کر حیران ہونے کا حق حاصل کریں کہ کسی دوکان پر کوئی تالا کیوں نہیں ملتا؟ اگر آپ وہاں تالے کا تقاضا کریں گے تو لوگ پریشان ہو کر پوچھیں گے کہ "کیوں خیریت ہے؟ آپ کو تالے کی ضرورت کس لیے پیش آئی؟" وہاں تو چوری ہوتی نہیں۔ جہاں تھانے ویران ہیں اور پولیس والوں کے پاس برسوں تک کوئی فریاد لیکر نہیں آتا۔ اگر کسی افسر کا سینٹرل پنجاب سے ہو جائے تو سارا دن برٹش دور کے فائیلوں کو پڑھتا رہتا ہے اور تھک ہار کر کھڑکی پر خیریت پوچھنے والے پرندے کو دیکھتا ہے۔ اور اتفاق سے اس کے پاس کوئی مہمان آجائے تو وہ اس کو جانے نہیں دیتا اور اس کو بتاتا رہتا ہے کہ "یار! عجیب بستی ہے۔ جہاں اب تک جرم داخل نہیں ہوا"

اور عین ممکن ہے کہ موجودہ حکومت کی طرف سے سیلاب کی تباہ کاریوں کی رپورٹ مرتب کرنے والا کوئی افسر اگر مقرر ہوا ہو تو وہ تمام تر تفصیل کے بعد اپنی رپورٹ اس اہم نوٹ پر پوری کرے گا کہ "سیلاب کے بعد یہاں حالات بہت سنگین ہیں۔ حیرت ہے لوگ کس طرح زندہ ہیں۔ اور راقم الحروف حکومت وقت سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ تمام سرکاری مصروفیات کو ملتوی کر کے اہلیان چترال کی بھرپور مدد کا بندوبست کیا جائے۔ اور حکومت کو یہ بات ذہن نشین کر دینی چاہیئے کہ یہاں کے لوگ کسی صورت میں احتجاج نہیں کریں گے۔"

وہ لوگ جو ہر جبر کا مقابلہ صبر سے کرتے ہیں۔ اور جنہیں احتجاج کرنا آتا بھی نہیں۔ ان کے لیے حکومت نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ تھوڑے بہت امدادی سامان کی سخاوت ہوئی ہے مگر یہ لینے والے نہیں دینے والے لوگ ہیں۔ اس لیے انہیں امداد لیتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ وہ بہت غیور اور انا پرست ہیں۔ مگر ان کا غرور اور ان کی انا معصومیت سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ وہ درد کے دوران بھی دھیرے سے مسکراتے ہیں اور حال پوچھنے والے کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

یہ وقت ایسا نہیں کہ ہم ان فرشتہ صفت انسانوں کی تاریخ جاننے کی کوشش کریں۔ حالانکہ یہ بیحد حیران کن بات ہے اس دور میں بھی اتنے معصوم مزاج والے لوگ ہندوکش کی آغوش میں کہاں سے آئے؟ وہ ایران سے سینٹرل ایشیا میں داخل ہوئے یا نہیں!؟ ماضی کے ان افسانوں کی اس وقت کیا حیثیت جب ان کا حال بے حال ہو اور مستقبل پر ایک سوالیانشان ابھر آئے۔ مانا کہ وہ بہت محنتی اور جفاکش ہیں مگر ان پر آنے والی آفت بھی معمولی نہیں اور دوسری بات یہ کہ وہ بہت دور بستے ہیں۔ ان کو میڈیا کوریج نہیں ملتی۔ وہ سیاسی اشو نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی مدد کے لیے امدادی کیمپس کا اہتمام نہیں ہوگا۔ ان کے لیے پرنس کریم آغاخان پاکستان نہیں آئیں گے۔ وہ وزیراعظم سے نہیں ملیں گے۔ ابھی تک حکومت وقت نے ان کے لیے کسی قسم کا فنڈ قائم کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اور اس بات کو بھی ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کے لیے قومی اسیمبلی میں کوئی نہیں چیخے گا۔ اہلیان

چترال کے لیے سینیٹ کا رویہ سرد رہے گا اور صوبائی اسیمبلیاں ان کے بارے میں کوئی قرارداد پاس نہیں کریں گی۔ یہ ایک ایسا درد ہے جو کسی در پر دستک نہیں دے گا۔ یہ خاموش رہے گا۔ حالانکہ اس درد کو معلوم ہے کہ بہت جلد وہاں سردی آنے والی ہے۔ موسم سرما تو اس وادی میں ویسے بھی بیان کی مٹھی میں نہ سمانے والی اذیت ہوا کرتی ہے۔ جب کئی دنوں تک لواری ٹاپ برف کے باعث بند ہو جاتا ہے اور پشاور سے اشیائے خورد و نوشت کی آمد ختم ہو جاتی ہے تب چترال کے لوگ سوکھے پھل کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ اس لیے چترال کے لیے جو کچھ بھی کرنا ہے وہ سردیوں سے پہلے کیا جائے۔ سردی کے بعد تو سرکار وہاں داخل نہیں ہو پائے گی۔ موسم سرما کے دوراں تو یہ وادی ہم سے کٹ جائے گی۔ اور حکومت کو کچھ نہ کرنے کا بہانہ بھی مل جائے گا۔ حکومت برف باری کے بہانے کا انتظار کرنے کا جرم نہ کرے اور وہ ان چترالیوں کے لیے امدادی کام ہنگامی بنیادوں پر شروع کرے جو صبر کے کلچر کا عکس بن کر جیتے ہیں۔ جن لوگوں نے حکومت سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ وہ اب بھی خاموش ہیں اور تماشہ اہل کرم دیکھ رہے ہیں۔

اور ان بے درد بیانبازوں میں صرف حکمران ہی نہیں بلکہ وہ سیاستدان بھی شامل ہیں جو امداد نہیں دے سکتے مگر ہر فورم پر چترال کے لوگوں کے لیے آواز تو بلند کر سکتے ہیں۔ انہیں فریاد کرنے کا فن آتا ہے۔ پھر ان کے ہونٹوں پر چترال کا نام کیوں نہیں آتا؟ وہ چترال جا نہیں سکتے مگر کراچی سے لاہور اور اسلام آباد سے پشاور تک ملک کے اہم شہروں میں چترال میں آنے والی تباہی کے بارے میں تو عام و خاص کو بتا سکتے ہیں۔

مگر ایک چپ ہے۔ ایک خاموشی ہے۔ چترال سے آنکھیں چرانے کا جرم بڑی ہوشیاری سے ہو رہا ہے۔ کیوں کہ سب یہی سمجھتے ہیں کہ چترال کے لیے کچھ کرنے سے انہیں نیکی کے علاوہ اور کیا حاصل ہو گا؟ اور نیکی کا سیاست سے کیا تعلق؟؟ ان کی پچھلی بات درست ہے مگر انہیں معلوم نہیں کہ یہ معصوم لوگ کسی کا احسان فراموش نہیں کرتے۔ اگر ان کے لیے کوئی کچھ بھی کرے گا تو یہ کیا؟ ان کی آنے والی نسلیں بھی اس اچھائی کو یاد رکھیں گی۔

مگر اس سلسلے میں صرف ایک بات کا خیال رکھا جائے اور وہ بات یہ کہ اہلیان چترال کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے وہ محبت اور اپنائیت سے کیا جائے۔ کیوں کہ یہ معصوم لوگ محبت کی زبان بولتے ہیں اور محبت کی زباں سمجھتے ہیں۔ ان سے اگر کسی نے سیاسی زباں میں بات کرنے کی کوشش کی تو شاید سمجھ کے مسائل پیدا ہو جائیں۔ کیوں کہ وہ لوگ مفادات سے بہت دور بستے ہیں۔ ان کے لیے سب سے اہم بات خلوص ہے۔ وہ خلوص جو آبشار کی صورت ان کے دلوں میں بہت رہتا ہے۔ مگر اس وقت وہ دکھی ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے اپنوں کی لاشیں اٹھائی ہیں اور ان کے دل کی دھرتی نے غم کے آکاش اٹھائے ہیں۔

اور اس وقت غم صرف اہلیان چترال کی خوبصورت آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ وہ ان حسین وادیوں کے ہر منظر میں موجود ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو سیلابی ریلوں سے بچ جانے والے درختوں اور ان پر محفوظ رہنے والے پرندوں کو دیکھو!

اور اگر اس درد کی گہرائی ناپنی ہے تو
ان کی آنکھوں میں دیکھو جو ہر شام
دریائے چترال سے
پانی پینے کے بہانے
آنسو بہانے آتے ہیں۔
اس وقت چترال کی ہر وادی کے مترنم نام کی بازگشت میں وہ درد دمک رہا ہے!
ہر کرن میں وہ درد چمک رہا ہے!
ان اداس وادیوں میں جو گیلی ہوا لگ رہی ہے
اس ہوا میں پوری وادی سلگ رہی ہے!
اس درد سے جو بھولے سے بھٹک کر
اہلیان چترال کے ہونٹوں پر آئے
تو ہر سرخ ہونٹ شدت درد سے
یک لخت سیاہ ہو جائے!!

ٹین کے چھتوں پر پڑنے والی بارش کیا کہتی ہے؟

پابلو نرودا نے لکھا تھا
"میں نہیں جانتا کہ مدفون شہروں پر بارش کس زبان میں برستی ہے"
مگر اس شہر کے غریب لوگ جانتے ہیں کہ "ٹین کی چھتوں پر پڑنے والی رم جھم کیا کہتی ہے؟"

آر سی سی چھتوں کے نیچے رہنے والے آدھی رات کو پرنالوں کے شور سے بارش کی شدت ناپتے ہیں مگر جو لوگ المیونیم کی چھت اوڑھ کر سوتے ہیں ان سے بادل سے گرنے والی پہلی بوند نہایت نرم لہجے میں بولتی ہے:

"ہیلو!
میں نے تمہارے ساتھ تنہائی کاٹی ہے
اور پسینے میں بھیگے ہوئے خوابوں میں
میں نے تم سے محبت کی ہے!
ہزاروں بار میں تمہارے ہونٹوں پر گری ہوں
اور بارہا تمہارے دروازے کے باہر برسی ہوں!
ہیلو!
کیا تم میرے منتظر تھے؟
میں تمہاری آنکھوں میں اس سوال کا جواب جان چکی ہوں
میں تمہاری موہوم سی مسکراہٹ میں خود کو پہچان چکی ہوں!!

میں صرف تمہارے لیے آئی ہو
اپنی مختصر اور بھیگی ہوئی بانہیں کھول کر
تم جانتے ہوں میں کہنے والی ہوں
میں جانتی ہوں تم کیا سننا چاہتے ہو
ہاں! میں تم سے پیار کرتی ہوں
ہاں! میں تم سے پیار کرتی ہوں"

لیونل رچی کا مشہور گیت اگر ایک بوند میں سما جائے تو وہ بوند بادل کے کان سے گرتے ہوئے بندے کی طرح یہی کچھ کہتے ہوئے توے کی طرح تپے ہوئی ٹین کی چھت پر محبت سے بہے ہوئے آنسو کی طرح سما جائے گی اور آدھی رات کو ایک مزدور کی محبت کو بتائے گی کہ:

"اسے وہ سارے دہکتے ہوئے دن یاد ہیں
جب سورج کی کمان سے ہر کرن ایک تیر کی طرح نکلتی تھی
اور پیوست ہو جایا کرتی تھی پسینے سے شرابور بدن میں!
وہ کس طرح بھلا سکتی ہے؟
ان راتوں کو جب شاور سے ابلا ہوا پانی آتا تھا
جب بجلی کا پنکھا ہیٹر کی طرح چلتا تھا
جب چائے کا کپ ٹھنڈا ہونے کا نام تک نہیں لیتا تھا
جب گال بھی گرم ہوا کرتے تھے اور آنسو بھی!
جب محبت محنت محسوس ہوا کرتی تھی
اور صبح کی ہوا میں جلتے ہوئے ٹائر کی بو بس جایا کرتی تھی!
جب شام کا سمندر بے بس نظر آتا تھا
اور سورج ایک جلتا ہوا انگارہ!!"

انسان اس قدر احسان فراموش کیوں ہوتا ہے؟ وہ ہر سکھ میں سمایا ہوا دکھ کیوں بھلا دیتا ہے؟ وہ سردیوں کو گرمیوں کی یاد کی تپش کیوں نہیں دیتا؟ وہ گرمیوں کی دل سرد یادوں سے منجمد کیوں نہیں کرتا؟ وہ بچے کی طرح ایک ہی پل میں کیوں جیتا ہے؟

وہ خوشیاں کیوں کھاتا ہے؟ وہ آنسو کیوں پیتا ہے؟ کیوں چیختا ہے؟ کیوں چلاتا ہے؟ اپنے آپ سے احتجاج کیوں کرتا ہے؟ وہ موسموں سے کیوں روٹھا رہتا ہے؟ جب گرمیوں کے گود میں وہ پانی کی طرح ابلتا ہے! تم اسے بوندوں کے باریک اور سرد بان یاد کیوں نہیں آتے؟ انسان عورت کے دل جیسا کیوں ہے؟ وہ چیز کو شکایت کی نظر سے کیوں دیکھتا ہے؟ وہ راضی کیوں نہیں ہوتا؟ ایک جھوٹے جادو کی طرح جینے میں کیا رکھا ہے؟

نظر کا فریب!

دل کا دھوکہ!

شکستہ خواب!

اور ایک ناقابل بیان پریشانی!!

نمکین ساگر میں سمائی ہوئی بوند!

ایک پیار کا پچھتاوا

ایک پچھتاوے سے پیار!

کب تک؟

ٹین کی چھت پر برستی ہوئی بارش کو کبھی غصہ آجاتا ہے۔ اور وہ شیر کی طرح دھاڑنے لگتی ہے۔ مگر چند لمحوں میں بارش پھر ہلکی ہو جاتی ہے اور موسم کی موسیقی بدل جاتی ہے۔ پھر بوندوں کے ہلکے ہلکے سر سننے والوں سے کہتے ہیں:

"کیا تم نے کبھی بھول کی وجہ سے

بند نہ ہونے والے دروازے سے

داخل ہونے والی

بھیگی اور بھوکی بلی کی آنکھوں میں دیکھا ہے؟

کیا تم نے کبھی زخمی کبوتر کو پیار سے سہلایا ہے؟

کیا تم جانتے ہو کہ محبت کا رنگ کیسا ہوتا ہے!؟"

ٹین کی چھت پر برسنے والی بوندیں بہت سی بے ربط باتیں کرتی ہیں۔ ان سارے الفاظ سے الجھی ہوئی باتیں جو گرامر کی گود میں سونے سے صاف انکار کر دیتی ہیں۔ جو کہتی ہیں کہ:

''اس شہر سے
تو اس عورت کا گاؤں اچھا ہے
جہاں بارش لوک گیت گاتی ہے
وہ عورت جو ماسی بن کر بار بار وہی فرش صاف کرتی ہے
جو قدرت کی طرح پانچ فوٹ کے قد سے بڑے بچوں کو
ماماتا بھری مسکراہٹ سے معاف کرتی ہے''

وہ عورت۔۔۔۔اس کا میدانی گاؤں۔۔۔۔اور چینل پر چلتے ہوئے فوٹیج میں تنکوں کی طرح بہتے ہوئے انسانوں میں اپنوں کو تلاش کرتی ہے!!

وہ عورت جس کا نام پھولوں جیسا ہے
مگر پھولوں کی وہ قسم بازار میں نہیں بکتی
وہ پھول کوہ سلیمان کی گیلی گود میں کھلتے ہیں
وہ پھول جو ہندو کش پہاڑ کی جھریوں میں جھومتے ہیں
وہ پھول جو سر فروش سپاہیوں کی طرح پہلے مرے!!
پھر بہے بچے پگھلے ہوئے گلیشئر سے پیدا ہونے والے سیلاب میں!!
الطاف کی دھاڑیں سننے والے انسانو!
چترال کی چیخ کیوں نہیں سنتے!!؟؟
بیہودہ پریس کانفرنسوں کی بے کار رپورٹنگ پڑھنے والے نادانو!
چپل کے درختوں پر باقی بچے پرندوں کی پکاریں کیوں پڑھتے؟
کیا تم جانتے ہو؟
گاؤں اجڑنا کسے کہتے ہیں؟
ایک بستی کا صفحہ ہستی سے مٹ جانا کیا ہوتا ہے؟
جب لکڑیوں سے بنے ہوئے گھر شکستہ کشتیوں کے تختے بن جاتے ہیں
جب ہاتھوں سے جڑے ہوئے ہاتھ ہمیشہ کے لیے پھسل جاتے ہیں!!
جب وقت میں اباسین کے پل تلے گرجتے ہوئے گذرتا ہے
جب میدانوں میں بہتے ہوئے دریا دہل جاتے ہیں

جب مٹی سے بنے ہوئے بند مٹنے لگتے ہیں!
جب باڑھ آجاتی ہے
تب امدادی کارکن مغرور فرشتوں کی طرح نظر آتے ہیں
اور زندگی "پی ٹی وی" کا یہ پرانا گیت بن جاتی ہے
"بولتی آنکھیں چپ دریا میں ڈوب گئیں
شہر کے سارے سازشی ور خاموش ہوئے"
مگر یہ کہانی اس شہر کی نہیں
جو صرف دنوں میں نہیں
راتوں میں بھی جاگا کرتا تھا
جو جگمگاتا رہتا تھا
غریب مچھیرے کی بیٹی کے گلے میں
جھولتے ہوئے سیپیوں کا ہار بن کر!!"

کرائم رپورٹرز کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے خودکشی کرلی۔ اسے جناح ہسپتال کی ایمرجنسی میں لایا گیا۔ اس کا اسٹمک بھی واش کیا گیا۔ اسے گلوکوز کی تھیلی بھی لگائی گئی۔ مگر اس نے جینے سے انکار کر دیا۔ اور آنکھوں میں نمکین آنسو بھر کر چلی گئی!

"خدا حافظ
اے ظالم شہر!
خدا حافظ"
اور ایک ایمبولنس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک روپوش ٹارگیٹ کلر!
اور شہر کی نیم مضافاتی فضاؤں میں سسکتا ہوا ایک فارم ہاؤس
اور ایک لیڈر کی بانہوں میں جھولتی ہوئی رقاصہ
اور آغا خان ہسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں
بھول کی دھول میں اڑتا ہوا ایک معمر مریض
جو نرم گالوں والی نرس سے
ایک کاغذ اور قلم کا تقاضہ کرتا ہے

اور لکھتا ہے:
"وقت چلتا ہے
کبھی چور کبھی چاند کی چال"
اس سے بھی تو آگے کچھ ہے۔۔۔۔!!
مگر وہ بھول جاتا ہے!!
بھول اور فقط بھول

سب سے بڑا المیہ ہے!
ٹین کی چھت کر گرنے والی بوند
بتاتی ہے اپنے محنت کش مکین کو!
وہ مکین جو اس شہر کی پائپ لائن میں
کسی کیڑے کی طرح پھنس گیا ہے!
وہ کوچ اس کے بغیر ہمیشہ جاتی رہتی ہے
جس پر کسی احمق پینٹر نے لکھ دیا ہے
"فخر وزیرستان"
مگر میں تم سے میدانی علاقوں میں
بسنے والے ان بچوں کی بات کرنے آئی ہوں
جو مچھروں سے نہیں لڑ سکتے!
جو غمگین راتوں میں روتے ہیں
جن کی ماؤں کی چھاتیوں سے
دودھ نہیں صرف درد بہتا ہے!
سرائکی لوریوں سے نہ سونے والے بچے
اور اپنی صداؤں میں
روہی کا سارا درد سمانے والی
وہ کافی کون گائے گا؟
اب تو کوئی ثریا ملتانی بھی نہیں

اب تو وہ فنکار بھی نہیں
جو سسکتے ہوئے سروں میں
گاتا تھا:
"اچیاں لمیاں لال کھجوراں
پتر جنیں دے ساوے
ننگے پنڈے میں نوں چھمکاں مارے
میرے روندے نی نین نمانے
جتنے میرے تن وچ لگیاں
تینوں اک لگے تے تو جانے"

کراچی کی غریب بستیوں میں بنی ہوئی ٹین کی چھتوں پر برسنے والی بوندوں کی انگلیاں اس طرح محو حرکت ہوا کرتی ہیں جس طرح ایک اداس لڑکی کے ہاتھوں کی انگلیاں ایک اداس پیانو کے غمگین "کی بورڈ" پر!

مگر صرف مون سون کی بھولی بسری بوندیں
کراچی کے ٹین کی چھتوں والے مکانوں کے مکینوں نے سے دھرتی کا سارا درد بیان نہیں کرتیں!

ان چھتوں تلے سونے والے محنت کش
آدھی رات کو اٹھ کر
نزدیکی کے درد سے اکتائے جسموں کے ساتھ
انہیں کہتی ہیں۔۔۔۔۔!!
"اے اکیلی آنے والی بوندو
لوٹ جاؤ!
اور اس وجود کو اپنے ساتھ لاؤ
جو گرمیوں میں ایک بادل تھا
جو اب ان بھیگتی ہوئی آنکھوں کا کاجل ہے۔

CANDLE IN THE WIND

وہ فاختہ جیسی عورت جو اپنے "پر امن آشیانے" سے نکلی اور گولیوں کا نشانہ بنی!
اس کے آرٹسٹ دوستوں کے وسیع حلقے میں اگر کوئی نزار قابانی جیسا شاعر بھی ہوتا تو وہ اس کے قتل والی رات ایک ایسی نظم لکھتا جس کا ہر لفظ "اشک، سیاہی اور مے" کے کاک ٹیل سے لہراتا رہتا!

اس شاعر کے تصور میں ایک اداس گٹارسٹ بھی ہوتا۔ جو ایک بوڑھے پیڑ کی گھنی چھاؤں میں اپنے دل کی ابھرتی اور ڈوبتی ہوئی دھڑکن کی لے پر لرزتی ہوئی تاروں سے ہواؤں کے ہونٹ زخمی کرتا رہتا۔ جو مخاطب ہوتا سبین محمود کے "نامعلوم قاتلوں " سے اور انہیں کہتا!

"تھینک یو
تھینک یو!
کہ تم نے ہماری سبین کو قتل کر دیا۔
اب جاؤ اور ڈفنس فیزون کے خاموش قبرستان میں
اپنی فتح کا جام نوش کرو!!
شاعری کو قتل کرنے کی ہمت
صرف تم لوگوں میں ہی ہو سکتی ہے!!

جاؤ اور جشن مناؤ
کہ تمہارے شارپ شوٹرس نے
اس کوئل کو قتل کر دیا
جو جنگل جیسے شہر میں
امن اور آزادی کے گیت گاتی تھی!
جو ایک پرندے جیسی تھی
جس نے "پیس نیش" کے نام سے
ایک آشیانہ بنایا تھا
اپنے لیے نہیں
ان سب پرندوں کے لیے
جو اداس بارش میں بھیگ کر
کتابوں میں پناہ لیتے تھے!
جاؤ اور جشن مناؤ
کہ تم نے اس عورت کو قتل کر دیا
جو موسیقی سے محبت کرتی تھی
جس کے سینے میں دل نامی
ایک ساز بجا کرتا تھا!!
اب وہ ساز خاموش ہے
اس سفاک سناٹے میں
اب کوئی کوئل کوک کر
اس شہر کی کتھا نہیں سناتی
جو شہر جنگل ہوتا تو جل جاتا!!
وہ سبین قتل ہو گئی
جو پیچ لگژری پر موجود

پام کے درختوں کی طرح
بلند قامت تھی!!
تم نے اسے گولیوں سے کاٹ ڈالا
اب وہ ایک تنکا بن کر
گیلی آنکھوں میں تیر رہی ہے!!
مفرور قیدیوں کی طرح
بھاگتا ہوا یہ شہر
چلنے کے اس انداز کو
کس طرح فراموش کر سکتا ہے
جس انداز سے کارونجھر پہاڑ پر
مور چلتے ہیں!!
انہوں نے ایک عورت کو نہیں
سمندر کی لہر کو قتل کر دیا
آبشار کی روانی رک گئی
المیونیم کی کھڑکیوں کے شیشے
گونگے انسانوں کی طرح
اشک بار ہیں!!
بادل اس دکھ کو کیسے بھلا پائیں گے؟
اب سبز رتوں کا کیا ہو گا؟
بیج دھرتی کا سینہ چیر کر
کیسے پھوٹیں گے؟
بہار کیسے آئے گی؟
اب اس شہر میں مون سون
صرف سین کی تعزیت کرنے آئے گی

کیوں کہ وہ قوس قزح تو قتل ہو گئی
جو مصنوعی پہاڑوں جیسے فلیٹوں پر
رنگین روبن کی طرح لہراتی تھی!
وہ بلبل بغیر کسی جرم کے قتل کی گئی
جو انگریزی دھن میں
لوک گیت گاتی تھی!!
اب اس لڑکی کے لیے
موم بتیوں کے کاروان جلتے رہیں گے
وہ جو خود ایک موم بتی تھی
اپنے پرامن آشیانے میں
آہستہ آہستہ جلتی تھی
جو منتظر رہتی تھی
ان بچوں کے لیے
جن کو بڑے ہونے کی جلدی تھی!
وہ انہیں کہانیاں سناتی تھی
اس شہر کی آرٹسٹ بیٹی
ایک ایسی ماں تھی
جو جگانے والی لوریاں
گاتی تھی!!
وہ ہنستی تھی
تو ایک بچی لگتی تھی
تم نے چالیس برس کی بچی کو قتل کر دیا!
وہ بچی جو بہادر تھی
جس کو معلوم تھا کہ خطرہ کیا ہوتا ہے؟

مگر بے خوف تھی!
وہ ایک ماڈل تھی
زندگی کے ریمپ پر
کیٹ واک کرنے کے بجائے
وہ جنگل میں شیرنی کی طرح
دھاڑتی تھی
وہ کمزور دل کلاس کے لوگوں کے لیے
رول ماڈل تھی!
کراچی شہر کو گھر کا آنگن بنانے کی حسرت
خوف سے لڑنے والی عورت
جو منتظر لمحوں میں
مسکراتی تھی!!
اب اداس ٹی ٹو ایف میں
بچے اس کا انتظار کرتے رہیں گے
اور اسے بلائیں گے
"سبین!
آجاؤ
کافی کے کپ میں
دروازے کی چابی میں
گیلری میں مہکتے ہوئے پھول میں
مہارت سے کٹے ہوئے کاغذات پر
لکھے ہوئے الفابیٹ میں!
مگر وہ شاید نہ آئے
اور منتظر بچے اپنا بیگ اٹھا کر

گھر چلے جائیں
اور رات کو "لٹل مرمیڈ" کی کہانی
سننے کے بجائے
اپنی ماؤں سے پوچھیں کہ
"مرنے والے کہاں چلے جاتے ہیں؟"
نیلے آسمان کے روشن اور سفید ستاروں میں
یا ان آبشاروں میں جو ان جنگلوں میں رواں رہتے ہیں
جہاں "گوگل" کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ جاتی ہے!
یا اس چاند سے پرے بھی ایک چاند ہے
سات رنگوں سے سجا ہوا چاند!!
کیا آسمان کی پر اسرار دنیا میں بھی
ایک سمندر ہے
جس کا ایک کنارہ ہے
جہاں ناریل کے درخت
خوشبو بھری ہوا میں لہراتے ہیں
جہاں کشتیوں کے بادبان
گیت گاتے ہیں
جہاں نہ دن ڈھلتا ہے
نہ رات ہوتی ہے!!
بس ایک سلونی سی شام
اپنے ماتھے پر
نیلے چاند کی بندی سجا کر
رقص کرتی ہے!!
جہاں کوئی دہشت نہیں

جہاں کوئی وحشت نہیں
جہاں صرف محبت ہے
اب سبین وہاں رہتی ہے
جہاں آشیانوں سے اڑنے والی
کوئل قتل نہیں ہوتی!!"

مگر ہم اس شہر میں ہیں، جہاں زندگی موت کی مفرور ملازمہ ہے۔ یہ شہر اس لڑکی کو بہت جلد فراموش کر دے گا۔ جس لڑکی نے آرٹ کی استانی بن کر انسانیت کا بھولا بسرا اسبق یاد دلایا تھا ان سب کو جواب صرف آبدیدہ ہیں۔

اب اجنبی لوگ اجنبی لوگوں سے اس گھر کا پتہ پوچھ رہے ہیں جس گھر کے بارے میں فیض احمد فیض نے لکھا تھا کہ:

"دیکھنے کی تو کسے تاب ہے لیکن اب بھی
اب بھی اس راہ سے گذرو تو کسی غم کی کسک
ٹوکتی ہے کہ وہ دروازہ کھلا ہے اب بھی!!"

وہ دروازہ تو کھلا رہے گا۔ وہ دروازہ بند نہیں ہو گا۔ مگر اس دروازے پر وہ ہاتھ دستک نہیں دیں گے جس کی دھن کو وہ ماں پہچان لیتی تھی جو ماں اپنی خوبصورت بیٹی کے قتل کے بعد یتیم ہو گئی ہے!!

ماں کے سامنے بیٹی کو قتل کرنے والے بہادروں کو آئینہ صرف وہ شاعر دکھا سکتا تھا جو اب اس دنیا میں ہے جس دنیا میں سبین چلی گئی ہے۔

وہ سبین جو ایک صبح کا خواب تھی۔ جو تاریک ہواؤں سے لڑنے والی مشعل تھی۔
کیا ہم نے ڈیفینس فیزون کے خاموش گوشے میں ایک عورت کو دفن کیا؟

نہیں ہم نے اس شام ایک مشعل کو دفن کیا!

اس امید کے ساتھ کہ اب یہ مشعل ہماری نمناک آنکھوں میں جلتی رہی گی۔

روح پشتون

ان پہاڑوں کے درمیاں پانی تو پہلے بھی گذرتا تھا۔ وہ پانی جس کا ردھم خٹک رقص کی طرح ہوا کرتا تھا۔ بل کھاتا۔ گول دائرہ بناتا۔ ایک ہاتھ میں رومال اور ایک ہاتھ میں تلوار لہراتا ہوا وہ سفر اختتام پذیر ہوا۔ اب دریائے سندھ اٹک پل سے اک نئی دھن میں گزرتا ہے۔ وہ دھن جس پر پہاڑوں پر کھڑے بلند پیڑ نہیں جھومتے۔

اب اس پانی کا بہاؤ ایسا ہے کہ بوڑھے پہاڑوں کو غصہ آجاتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ پتھر نرم کیوں ہوگئے ہیں؟ دریا کے جسم میں تو وہی تیزی ہے مگر اس کے روح کی تغیانی کم کیوں ہوگئی ہے؟ بادلوں کی وہ بغاوت کہاں گئی جس کی وجہ سے وہ شیروں کی مانند دھاڑتے تھے۔ اب کوندتی بجلی کے بعد ایک چیخ کیوں سنائی دیتی ہے؟

قرۃ العین حیدر کے کسی ناول کی انتہا جیسے یہ الفاظ کس قدر تلخ ہیں کہ "اب دنیا کس قدر بدل گئی ہے؟ اب یونان کے قدیم فلسفی ہیراکلیٹس کی یہ بات سچ ثابت ہوگئی ہے کہ آپ ایک ندی میں دوبار پیر نہیں ڈال سکتے"۔ مگر کبھی ایسا نہیں تھا۔ کبھی ان پہاڑوں کے درمیاں جو ندیاں بہتی تھیں، ان کے پانی میں آپ دوبار تو کیا دس بار بھی پاؤں ڈبوئیں تو آپ کو وہی پانی میسر ہوتا تھا۔ کبھی یہ پانی اسی روح اسی رفتار سے بہا کرتا تھا۔ وقت اور حالات اس پانی کو تبدیل نہیں کرپائے۔

مگر اب حالات مختلف ہیں۔ کبھی یہ پہاڑی دیس گمنام سپاہی جیسا تھا مگر اب اس کو نام بھی مل گیا لیکن اس کا کردار کس قدر تبدیل ہوگیا ہے؟ بات اس خوشحال خان

خٹک کی نہیں جس کی طرف سے وصیت رقم ہوئی، علامہ اقبال نے لکھا تھا کہ:

"قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم
کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہیں
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں
قہستاں کا یہ بچہ ارجمند
کہوں تم سے اے ہمنشیں دل کی بات
وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گردِ سمند"

اب تو اس دیس میں وہ شخص بھی نہیں جو اپنے مخصوص انداز کے ساتھ بغاوت کی پرامن تصویر بن کر ابھرا تھا قوس قزح کی طرح!

بلند قد اور بڑے دل والا وہ شخص جو چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ جو سادہ کھاتا تھا۔ سادہ پہنتا تھا۔ سادہ سی بات کرتا تھا۔ مگر جب تک وہ خیمہ افلاک کے نیچے سانس لیتا تھا تب تک پہاڑوں کو کوئی پروا نہیں تھی۔

کہاں ہے اب وہ باچا خان؟ جس نے پوری زندگی اس ولی خان کی سیاست کو سپورٹ نہیں کیا جو ولی خان جن کی مدفن پر فیض احمد فیض کا یہ شکایتی شعر کندہ کیا جانا چاہیئے کہ:

"ہم سہل پسند کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے؟"

مگر باچا خان کی بات اور تھی۔ وہ فرہاد تھے۔ ان کا تیشہ وہ لاٹھی تھی جس کو ہاتھ میں لیکر انہوں نے اپنے دیس کے سارے پہاڑ عبور کیے۔ اور اس دور میں جس دور میں میڈیا نہیں تھا۔ اس دور میں باچا خان نے ایک لاکھ سے زیادہ خدائی خدمت گار اکٹھے کیے۔ وہ

سرخ پوش لوگ جو جدید فکر کے ساتھ "پشتون ولی" کی قدیم راہ پر چلا کرتے تھے۔

اب وہ لوگ کہاں ہیں؟ وہ لوگ جن کی وجہ سے پہاڑ سر بلند تھے اور دریا مستی میں بہا کرتے تھے۔ ان لوگوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر احترام کے ساتھ! کیوں کہ وہ لوگ دھن کا نہیں بلکہ اپنے من کا پیچھا کرنے والے لوگ تھے۔ وہ لوگ جن کے بارے میں کازانت زاکس کے یہ الفاظ لکھے جا سکتے ہیں کہ "مجھے نہ ڈر ہے نہ لالچ، میں آزاد ہوں" ہم باچا خان سے اختلاف رکھ سکتے ہیں مگر اس اعتراف کے ساتھ کہ وہ ایسے شخص تھے جو مرزا غالب کے اس شعر کی عملی صورت تھے کہ:

"حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا"

باچا خان عجیب بھی تھے اور عظیم بھی تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا عرصہ قید میں اس لیے گزرا کیوں کہ وہ آزاد انسان تھے۔ وہ شخص جو زنجیروں میں بھی آزاد تھے، ان کا موازنہ ان لوگوں سے کیسے ہو سکتا ہے جو کرسیوں پر بیٹھ کر بھی قیدی نظر آتے ہیں۔ وہ شخص اب خیبر پختون خواہ میں نہیں جنہوں نے پوری ایک صدی قبل یعنی 1915 میں پہلی بار مسجد اسکول قائم کیے تھے۔ وہ مسجد اسکول جن پر برطانوی حکومت نے پابندی عائد کی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ قوموں کو دولت نہیں بلکہ دانائی اہم ہوا کرتی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر پشتونوں کو تعلیم حاصل ہوگئی تو خیبر پختون خواہ کا ہر پتھر پارس بن جائے گا۔ اس لیے انہوں نے نہ صرف لڑکوں بلکہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اس قبائلی معاشرے کو قائل کیا جس سے بات کرنا اپنا سر پتھر سے ٹکرانے کے برابر تھا۔ مگر باچا خان اپنا سر پتھروں سے ٹکراتے رہے اور پھر پتھروں سے علم اور عرفان کے آبشار پھوٹ کر نکلے۔

جب سقراط زہر کا پیالہ پی چکے تب اس کے شاگرد نے ان سے پوچھا تھا کہ "استاد محترم! آپ کی آخری رسومات کس طرح ادا کی جائیں؟" سقراط نے اپنی موندی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کچھ حیرت اور کچھ غصہ سے بولے "میری آخری رسومات۔۔۔۔!؟ کریٹو الفاظ کا غلط استعمال سب سے بڑا جرم ہے" سقراط کی یہ بات مجھے اس وقت شدت سے یاد آتی تھی اور یاد آتی ہے جب جدیدیت کے کچے رنگ میں رنگے ہوئے پشتون

سیاستدان اور دانشور کہتے ہیں کہ ”باچا خان کا نظریہ قابل عمل نہیں ہے“ ان کی اس بات سے صاف طور پر یہ مطلب نکلتا ہے کہ باچا خان کا نظریہ غلط ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اب پشتون رہنماؤں میں وہ محنت، وہ لگن اور وہ جذبہ باقی نہیں رہا جس کے بغیر اس نظریہ پر عمل نہیں ہو سکتا۔ کہاں ہے وہ سچائی؟ کہاں ہے وہ جستجو؟ جس سے تاریکی میں ڈوبے ہوئے پہاڑ روشن ہو سکتے ہیں!!

اور باچا خان کا نظریہ کیا ہے؟ باچا خان کا نظریہ ”خٹک رقص“ جیسا تھا۔ اس نظریہ کو ان سادہ اور سریلے الفاظ میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ:

”اک ہاتھ میں رومال ہے
اک ہاتھ میں تلوار
پشتون کا کردار
جو پیار کرے، پیار کرو
وار کرے وار
پشتوں کا کردار“

مگر اب پشتون سیاست اپنے تاریخی اور تہذیبی توازن کو فراموش کر چکی ہے۔ اب یا تو اس کے ہاتھ میں طالبان کی تلوار ہے یا تحریک انصاف کا رومال!!

اس تلوار اور اس رومال کے درمیاں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ اس لیے پشتونوالی کے تاریخی وجود کو تلوار والے بھی زخمی کر رہے ہیں اور ان ثقافتی سرحدوں کو رومال والے بھی روند رہے ہیں۔ ان دو انتہاؤں کے درمیاں ایک بہت بڑی اکثریت بیحد دکھی ہے۔ یہ باچا خان کی محنت تھی جس کی وجہ سے آج ہر پشتون کی نظر میں علم کا رتبہ بہت بلند ہے۔ اس لیے جب سیاسی مفادات کے لیے سفاکی کا راستہ اختیار کرنے والے درندہ صفت لوگ اسکول میں داخل ہو کر معصوم طالب علموں پر گولیاں چلاتے ہیں اور معلموں کو زندہ جلاتے ہیں تو پختون خوا کے پہاڑ ایک چیخ بن جاتے ہیں۔

اور جب قوم کے رہنما ڈی چوک پر ناچتے اور نچاتے ہیں تو وہ سنجیدگی سہم کر اداس ہو جاتی ہے جس کا ہاتھ غیرت کے ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا ہے اور پشتونوں کا ساتھ

اس تاریخ سے ٹوٹتا جارہاہے جس کے بارے میں رسول حمزاتوف نے اپنی مشہور کتاب "میرا داغستان" میں لکھا ہے "اگر تم تاریخ پر گولی چلاؤ گے تو مستقبل تم کو توپ سے اڑادے گا"

ہر قوم کی ایک روح ہوا کرتی ہے۔ پشتونوں کی بھی ایک روح ہے۔ جو کبھی سمجھ اور سنجیدگی کا سنگم تھی۔ جو محبت اور محنت کا مرکب تھی۔ جس نے یہ بات اپنی لمبی قمیص کے کونے سے تعویذ کی طرح باندھ لی تھی کہ "خدمت کے جذبے سے کی جانے والی سیاست عبادت ہوا کرتی ہے" مگر پشتون روح نے لباس بدلا تو وہ نصیحت والا رقعہ کہیں گم ہو گیا۔ اب پشتون سیاست کے پاس وہ نقشہ نہیں جو منزل کا پتہ دیتا ہے۔ آج پشتون ترقی کے راستوں پر بھٹک رہے ہیں۔ جب قوموں کا تاریخ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے تو وہ بھول کی دھول بن جاتی ہیں۔

کل روح پشتوں ایک عقاب تھی مگر آج پشتون روح اس معصوم پرندے جیسی ہے جو توپ کے نال میں اپنا آشیانہ بناتا ہے اور اس بات کو فراموش کر چکا ہے کہ اگر توپ چلی تو اس کے آشیانے کا کیا ہو گا؟

چند روز قبل جب چند لوگ باچا خان کی برسی منانے کے لیے جلال آباد جا رہے تھے تب تاریخ اپنی آنکھوں کی کمان سے اس طعنے کے تیر برسا رہی تھی کہ "منزل ہے کہاں تیری؟ اے لالہ صحرائی؟" اور جب سرخ پوش تحریک چلانے والے باچا خان کی مزار پر انہوں نے سرخ چادر ڈالی تب پہاڑی چوٹیوں کو یہ سوچ کر بہت افسوس ہوا کہ اس سرخی کی ضرورت تو اس روح پشتون کو ہے جس کا رخ زرد ہو چکا ہے۔ جو بھول گیا ہے کہ وہ جسم کی ترقی روح کی تنزلی کا باعث بنے تو یہ سودا مہنگا ہوا کرتا ہے۔

آج عوامی نیشنل پارٹی ایک لالٹین ہے جس میں تیل نہیں اور جس کا شیشہ ٹوٹ چکا ہے۔ اور یہ لالٹین اٹھا کر برفانی طوفان میں لوسی گرے جیسی روح پشتون سفر نہیں کر سکتی۔ باچا خان نے اس روح پشتون کے ہاتھ میں گرم سورج دیا تھا اور اے این پی نے اس سورج کو بیچ کر ایک ایسا لالٹین خریدا جو اس تاریکی کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو اقتدار کی رم جھم روشنیوں میں مایوسی کے ساتھ بجھ گیا ہے۔ اس لالٹین کی لو اب

کہیں نہیں۔ وہ پوسٹرز جن پر یہ لالٹین چھپا ہوتا تھا وہ بھی بارش میں بھیگ کر اتر گئے۔ اب دیواروں پر موسم سرما کے افسوس سے بھرے ہوئے آنسو ہیں۔

آج پشتون قوم سیاسی قبائل کا ایک منتشر ہجوم ہے۔ اس کا کوئی قائد نہیں۔ یہ ایک ایسا کارواں ہے جس کا کوئی میر نہیں۔ یہ بھول چکی ہے اس رہنما کو جس کی نگاہ بلند اور سخن دلنواز تھے۔ اب اس کے پاس وہ قائد نہیں جو شہباز تھا۔ جس کے پر سنگلاخ چٹانوں پر سایہ کرتے تھے۔ جو تماشہ دکھانے والا بنجارہ نہیں بلکہ آبشار کی طرح بلندی سے نیچے اتر کر صحراؤں کو سیراب کرتا تھا۔ جو ایک شیر تھا جس کی خاموشی بھی جنگل میں گونجا کرتی تھی۔

آج پشتونوں نے جس شخص کو اپنا لیڈر بنایا ہے وہ باچا خان کے شاعر اور آرٹسٹ بیٹے غنی خان کے الفاظ میں کوے کی چونچ اور سانپ کی زبان والا ہے۔ گشتی دل اور خچر کی ضد والے ایسے لیڈر تو کسی بھی کمہار کے ساتھ دوستی کر کے دن میں دس تیار کروائے جاسکتے ہیں۔

کیا یہ لیڈر پہاڑوں کے بیٹے بن سکتے ہیں؟

یہ سوال پوچھ رہی ہے وہ روح پشتون جو بلند پہاڑوں پر اڑتے ہوئے یونان کے عظیم ناول نگار کازانت زاکس کی اس تحریر کا عکس پیش کر رہی ہے کہ:

”شاہین اپنے آشیانے کی طرف لوٹ رہا ہے
کتنی دیر اس نے جلتے ہوئے پہاڑوں کو اپنے پروں کا سایہ فراہم کیا
کتنا وقت اس نے سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی نفرت کا اظہار کیا
اس نے اپنے پنجوں سے کتنے سانپوں کو چیر کر پھینک دیا
اس عرصے میں اسے یاد بھی نہیں تھا کہ اس کا کوئی آشیانہ بھی ہے
شاہین بوڑھے نہیں ہوتے اور نہ وہ تھکتے ہیں
یہ الگ بات ہے کہ اب شام ہو رہی ہے
اور شاہین اپنے آشیانے کی طرف لوٹ رہا ہے
ایک وحشی چیخ کے ساتھ!!“

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

وہ ہلال بھی نہیں تھے اور نہ ماہ تمام! وہ نہ چھوٹے بچے تھے اور نہ جوان مرد!! ان کی عمر اتنی تھی جتنی اس گلاب کی جو پوری طرح نہیں کھلتا!! مگر اس کی ہر پتی میں ایک ابھرتے ہوئے حسن کی بھرپور جھلک ہوا کرتی ہے۔ جس طرح مالی کو معلوم ہوتا ہے کہ کھلتے ہوئے پھول کی خوشبو کیسی ہوتی ہے؟ ویسے ماؤں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ بارہ سے پندرہ برس کے بچے میں کیسی مہک ہوا کرتی ہے۔ مگر وہ خوشبو اب صرف ان کپڑوں تک محدود رہ گئی ہے جو کپڑے ان بچوں کی الماریوں میں اپنے مالکوں کے لیے رو رہے ہیں جو بچے پشاور کے آرمی پبلک سکول میں دہشتگردی کی اس سنگین کارروائی میں قتل ہوئے جس پر یہ ملک اپنے ایٹم بم سمیت شرمندہ ہے۔ یہ ملک جس کو اپنی دفاعی صلاحیت پر ناز ہے۔ مگر وہ ناز آج سرنگوں پرچم کی طرح سرد ہوا سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ اسے ذرا اوپر نہ اٹھا دے۔ وہ بچے جنہیں ہم نے علامہ اقبال کی نظمیں سنا کر وطن سے محبت کرنے کا درس دیا۔ جنہیں ہم نے سمجھایا کہ ایک کامیاب انسان کی زندگی شمع کی صورت ہونی چاہیئے۔ وہ بچے جب صبح کو سکول کی اسیمبلی میں جمع ہوتے تب ان کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں سورج سے زیادہ روشن کرنیں جگمگاتی تھیں۔ وہ ہمارے ستارے نہیں، چاند بھی نہیں، وہ تو سورج تھے۔ ابھرتے ہوئے سورج جیسے سرخی مائل بچے! جو بدترین دہشتگردی کے دھوئیں میں دفن ہوگئے۔ پشاور کی وہ دھرتی جو اپنے سینے پر بہت بھاری پہاڑوں کا بوجھ برداشت کر سکتی ہے مگر اس دن وہ دھرتی کے لیے

ایک سو تیس بچوں کی لاشوں کا بوجھ اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس لیے بات صرف پشاور کی نہیں۔ اس دن پورے خیبر پختون خوا کی سنگ لاخ سرزمین موسم خزاں کے سبب سرخ بن جانے والے پتے کی طرح کائنات کی شاخ پر لرز رہی تھی۔ اس دن ہر چیز شرمندہ تھی۔ سارے شجر اور ان پر بیٹھے ہوئے پرندے شرمندہ تھے۔ سارے آبشار اور پہاڑی چشمے اپنا راستہ بھول رہے تھے۔ ہوائیں شرمندہ تھیں۔ گھٹائیں شرمندہ تھیں۔ اور بلند پہاڑوں کی چوٹیوں نے برف کی سفید چادروں میں اپنے چہرے چھپانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ وہ غم کا نہیں شرم کا دن تھا۔ کیوں کہ ہم لوگ جن کی ہڈیاں ہمارے بھاری جسموں کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں وہ لکڑی کی بیساکھیوں پر بھی چل رہے ہیں۔ ہم لوگ جو اپنے بالوں کی سفیدی پر رنگ لگا کر کنگی کرتے ہیں اور پلاسٹک کے دانت لگوا کر ہنستے ہیں۔ ہم سب چل رہے ہیں۔ کھا رہے ہیں۔ پی رہے ہیں۔ ہنس رہے ہیں۔ گا رہے ہیں۔ مگر وہ نوجوان جن کی رگوں میں سرکش خون جم گیا ہے۔ جن کے چہرے ایک اداس مصور کی تصویر بن گئے ہیں۔ جو بےحس و حرکت اپنے گھروں کے صحنوں میں پڑے ہیں اور خاموش زباں سے اپنی ماؤں کو کہہ رہے ہیں کہ ان کی روشن پیشانی پر ایک الوداعی بوسے کا ویزا ثبت کریں تو وہ جائیں آسمان کی اس نیلی دنیا میں جہاں کوئی دہشتگرد داخل نہیں ہو سکتا۔ جہاں ہر وحشت کا داخلہ ممنوع ہے۔ جہاں صرف معصوم مسکراہٹ تتلیوں کی طرح اڑتی ہے۔ مگر ماؤں میں یہ ہمت کہاں کہ وہ اپنے لاڈلوں کو چوم کر کہیں کہ: ”الوداع! میرے بڑھاپے کے سہارے الوداع! میری بجھتی ہوئی آنکھوں کے روشن ستارے الوداع! مجھے سوئی میں دھاگہ ڈال کر دینے والے الوداع! بڑے ہونے کے باوجود مجھ سے لپٹ کر سونے والے الوداع! اے خدا کے معصوم مہمان الوداع! مجھے ہر موسم میں تیری یاد آئے گی، مگر الوداع! تیری گرم سانسوں کے بغیر میں جاڑے کا موسم کیسے کاٹوں گی؟ تیرے بغیر میں آنے والی بہاروں کا سامنا کیسے کروں گی؟ میں موسم گرما میں بارش کو کیسے برداشت کروں گی؟ میں تیری عمر کی لڑکیوں میں اپنی بہو کیسے تلاش کروں گی؟ میں اپنے لڑکھڑاتے ہوئے دل کو کس بات کا سہارا دوں گی؟ میں تیرے دوستوں سے مل کر اپنے آنسو کیسے

روک پاؤں گی؟ میں تیرے بغیر یہ زندگی کا بوجھ کیسے اٹھاؤں گی؟ میں کیسے جی پاؤں گی؟ مگر مجھے جینا ہوگا؟ تمہارے بھائیوں اور بہنوں کے لیے ان کے ہاتھوں میں تمہارا لمس محسوس کرتے ہوئے مجھے جینا ہوگا اور زندگی کا زہر قطرہ قطرہ پینا ہوگا!!! الوداع!!! میرے خوابوں کی صحرائی ریت کے سرکش ہرن میرے غمگین آنکھوں والے غزال میرے لال الوداع!!" مگر یہ سب کچھ ان ماؤں کا کہنا ہے۔ کسی اور سے نہیں۔ اپنے اس دل سے جس کے سب سے خوبصورت اور زندہ حصے کو اس دھرتی میں دفن کیا گیا۔ وہ جو ہر روز سکول سے سیدھے گھر آتے تھے۔ اب وہ صرف خوابوں میں ہی آپائیں گے۔ وہ جو ہماری امیدوں اور ہماری آرزوؤں کے زندہ اور متحرک وجود تھے۔ وہ جو پہلے ہلکی پھلکی کتابیں پڑھا کرتے تھے اور پھر ان کی کتابوں کا وزن آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ وہ جو اب ماؤں کے لیے کام کا بوجھ نہیں تھے۔ جو اپنی یونیفارم خود پریس کرتے تھے۔ اپنے جوتے خود پالش کرتے تھے۔ اپنی تسمیں خود باندھا کرتے تھے۔ اور دوڑتے ہوئے اسکول وین میں چڑھ جاتے تھے۔ اب وہ نہ آئیں گے اور نہ جائیں گے! اب وہ خاموش دنیا میں ایک چھوٹی سی قبر میں رہیں گے! اور جب شام کا سورج پہاڑوں کی چوٹیوں کو شرم سے سرخ کرتے ہوئے غروب ہوگا اور ایک غمزدہ باپ اپنی شریک حیات کو سہارا دیکر اٹھانے کی کوشش کرے گا تب وہ مٹی سے لپٹ کر اپنے بیٹے سے کہیں گی کہ "تیرا باپ مجھے زبردستی تم سے الگ کر رہا ہے۔ میرے لال! تمہیں اندھیرے میں ڈر تو نہیں لگے گا؟ میرے لال کیا تو اب تنہا سو جائے گا؟" ایسی باتیں تو تب تک ہوتی رہیں گی جب تک وہ مائیں زندہ ہیں۔ جن کے لیے اب زندگی رحمت نہیں زحمت ہے۔ مگر یہ رحمت زحمت کیسے بنی؟ یہ زندگی جو خوشیوں کا میلہ ہے اس کے دل میں تنہائی کا خنجر کس طرح پیوست ہوا؟ والدین اپنے نوجوان بچوں کی وجہ سے ایک بار پھر یتیم کیسے ہوئے؟ ایک مکتب مقتل میں کیسے تبدیل ہوا؟ امتحانی پرچے طالب علموں کے خون سے کیسے سرخ ہوئے؟ یونیفارمز کفن کیسے بنیں؟ معصومیت کے آستاں میں وحشت کس طرح داخل ہوئی؟ بچوں کی نظمیں بڑوں کے لیے نوحے کیوں کر بنیں؟ ایک سجتی سنورتی زندگی کیسے لٹ گئی؟ قوم کا سر غم اور شرم سے کیوں جھک گیا؟

کیا بتا پائیں گے یہ حکمران جو دھرنوں میں ناچتے ہیں؟ جنہیں اپنی کرسی چھن جانے کے خوف سے نیند نہیں آتی! جو "قوم قوم" کی رٹ لگانے والے کوے ہیں!! جو کہتے ہیں کہ ہمیں ہر حال میں نظام کو بچانا ہے!! وہ بچوں کو نہیں بچا پائے مگر جمہوریت کو بچائیں گے!! وہ نواز شریف ہو یا عمران خان گھنے اور چھدرے بالوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ جو ہاتھ میں مائک پکڑ کر ہر روز کہتے ہیں کہ "پوری قوم جاگ گئی ہے" انہیں بتاؤ کہ ایک سو بیس بچے کبھی نہ اٹھنے کے لیے سو چکے ہیں!! بلکہ انہیں سلایا گیا ہے۔ دوائی والی گولیوں سے نہیں بلکہ بارود والی گولیوں سے!! اب کوئی خوشحالی کا پرچم لہرائے یا تبدیلی کا گیت گائے یہ بچے کبھی نہیں اٹھیں گے!! یہ بچے انسانیت کے قاتلوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جنہیں بغیر کسی جرم کے موت کی اس وادی میں بھیج دیا گیا جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ یہ بات درست نہیں کہ پشاور اداس ہے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں کہ پورا ملک اداس ہے۔ اس بات سے بھی اتفاق نہیں کہ پوری دنیا میں درد کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ہم سب شرمندہ ہیں۔ ہر شہر شرمسار ہے۔ ہر ملک کے ماتھے پر عرق ندامت ہے۔ اور یہ دنیا بھی ویسی نہیں جیسی نظر آتی تھی۔ اگر اس دنیا کو دیکھا جائے اس ماں کی آنکھوں سے جسے اپنا شہید بچہ بند ہونٹوں کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ: "موری رخصت راکوہ حم درحخہ" یعنی: اے میری ماں مجھے الوداع کہو میں جا رہا ہوں!! وہ سارے بچے جو سفید رنگ کے الوداعی یونیفارمز میں ملبوس ہیں۔ وہ جو اصحاب طبل علم کے دروں پر کتاب اور قلم کا تقاضا لیے ہاتھ پھیلائے پہنچے مگر لوٹ کر گھر نہ آئے وہ معصوم جو بھولپن میں وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن لے کے پہنچے جہاں جہاں بٹ رہے تھے گھٹا ٹوپ بے انت راتوں کے سائے۔۔۔!! ایسا کچھ منظر ہے اس مکتب کا جو مقتل بن گیا۔ اس شہر کا جو شمشان گھاٹ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ اس دنیا کا جس کے بارے میں فردوسی نے لکھا تھا "نقارہ آواز آں است کہ دنیا دوں است کہ دنیا دوں است" یعنی: بادشاہ کے نغارے سے آواز آرہی ہے کہ دنیا گند سے بھری ہوئی ہے کہ دنیا گند سے بھری ہوئی ہے!!

پشتو شاعری کا پس منظر

ابھی پہاڑوں کے سروں پر سفید آنچل نہیں لہرائے مگر بارش کے دوران ان وادیوں کی فضا رنگوں سے بھر جاتی ہے۔ جہاں برف گرتی ہے۔ان خوبصورت اور خوشبو سے بھری پہاڑی وادیوں میں جب برف گرتی ہے تب ساری آوازیں سفید لحاف اوڑھ کر سو جاتی ہیں بس کبھی کبھار کوئی بھٹکا ہوا پرندہ شور کرتا سنائی دیتا ہے مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس خاموشی میں برف میں چھپے ہوئے مکانوں سے دھواں کسی سرگوشی کی صورت نکلتا ہے اور بادلوں سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔

قہوے کی خوشبو اور انگارے کا رنگ کس قدر اچھا لگتا ہے۔

وہاں جہاں برف گرتی ہے!!

مگر ابھی برف پڑنے میں کچھ وقت ہے۔

ابھی تو مسلسل بارشیں ہو رہی ہیں اور پہاڑی وادیاں کسی ساز کی طرح بج رہی ہیں۔ وہ ٹین کی چھتیں جن پر کبھی "ٹپ ٹپ" کی موسیقی پیدا ہوتی ہے ور کبھی موسلا دھار بارش سے وہ بتھوون کی سمفنی سنانے لگتی ہیں۔ گھر کی کھڑکی کھولنے سے صرف سرد بوندیں بالوں میں جگنو بن کر نہیں چمکتی بلکہ کچھ فاصلے پر پہاڑوں سے گرتے ہوئے آبشاروں کی صدائیں اور نالوں میں بہتے پانی کا شور اور وہ بارش تھم جانے کے بعد ذرا دور کسی مکان سے بجتے ہوئے رباب کی آواز میں محبت کے سارے شکوے سما جاتے ہیں اور کوئی دکھی دل سے گانے لگتا ہے وہ بھولے بسرے ٹپے جن میں محبوب سے

زیادہ مقدر سے شکایت ہوا کرتی ہے۔

"جس میں جدائی نہ ہو
وہ پشتو شاعری نہیں ہو سکتی"

یہ بات صرف ایک دیہاتی استاد اپنے ادبی شاگرد سے نہیں کہتا بلکہ ایمسٹرڈم کی رات میں ایک پشتون لڑکی اپنی روم میٹ سے کہتے ہوئے گنگنانے لگتی ہے:

"داستاد دوؤستر کودپارہ
داکلی جنگ دمور خبری تیرومہ"

اور اپنی دوست کو بتانے لگتی ہے کہ لڑکی کہتی ہے:

"صرف تمہاری وجہ سے میں نے پورے گاؤں کی مخالفت مول لی ہے
بدنامی اور ملامت سن رہی ہوں اپنی ماں سے!!"

اور اس کی یورپی سہیلی اپنی نیلی آنکھوں میں حیرت بھر کر پوچھتی ہے کہ "کیا تمہارے ملک میں محبت ایک جرم ہے؟"

اور پہاڑوں کی بیٹی اسے فخریہ آواز میں کہتی ہے "جرم نہیں جنگ"

پھر وہ کچھ سوچ کر کہنے لگتی ہے کہ "ہم لیو ٹالسٹائی کی طرح امن اور جنگ کے درمیاں نہیں بلکہ محبت اور جنگ کے درمیاں جیتے ہیں۔ یا تو ہم لڑتے ہیں یا لو کرتے ہیں۔ ہمارے دل سے تیسرا راستہ نہیں نکلتا" مگر یہ سوچ کر کہ وہ سمجھ نہیں پائے گی۔ پشتون لڑکی اپنی بات روک دیتی ہے اور دھندھلے شیشے سے دیکھنے لگتی ہے سڑک پر برستی ہوئی بارش اور گنگنانے لگتی ہے جوانی میں موت کو گلے لگانے والی وہ گلوکارہ جس نے دل کے ہونٹوں سے گایا تھا یہ گیت کہ:

"لیکن میرا دل
میرا دل رو رہا ہے"

اور اسے یاد آتا ہے اپنا وہ گاؤں جو کبھی بچے، کبھی بوڑھے اور کبھی جوان کی طرح نظر آتا تھا۔

اور صرف سات سمندر دور نہیں بلکہ جرم کے جزیرے جیسے اس شہر میں بھی

سبزی منڈی کا کوئی مزدور اپنے آباؤ اجداد کی طرح اپنی محنت کش اور میلی انگلیوں سے اپنے دل میں آئے ہوئے اس ٹپہ کو رومن پشتو میں ٹائپ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ:

"بدلتے موسم کے راستے پر بھٹکا ہوا
ہوا کا ایک جھونکا چھو گیا
تمہارے آنچل کی ٹھنڈی ہوا کی طرح"

وہ لوگ جو پردیسی ہیں اور اس شہر میں بسنے کی سزا بھگتتے ہیں انہیں بہت یاد آتی ہیں وہ وادیاں جہاں برف گرتی ہے۔ مگر ابھی تک وہاں برف نہیں پڑی۔ جہاں سرد رخساروں پر بہتے ہوئے گرم آنسو ایک پیغام بن کر نہیں پہنچ پاتے ان لوگوں تک جو پہاڑوں کے اس پار بستے ہیں۔

جہاں کی لڑکیاں حیا نہیں کرتی۔ وہ بے پردہ اور بے باک عورتیں جو دوپٹے کو بھی بوجھ سمجھتی ہیں۔ وہ اسے اچھی تو لگتی ہونگیں!؟ یہ سوچ کس قدر اداس کر دیتی ہے اس پہاڑی دوشیزہ کو جس کا محبوب سڑکوں کا ملاح ہے۔ جو دریا جیسے راستے پر کشتی جیسی گاڑی چلاتا ہے اور ایک مستقل مسافر کی طرح جیتا ہے!!

"اے میرے دوست بارش میں بھیگتے ہوئے آؤ
اس سے پہلے کہ راستے برف کے باعث بند ہو جائیں"

مگر کوئی نہیں آتا۔ کوئی کالی چھتری نمودار نہیں ہوتی اس پگڈنڈی پر جو گاؤں کے اجڑے ہوئے کھیت سے اس گھر کی طرف آتی جس گھر میں انتظار نئے چوکیدار کی طرح ہر آہٹ پر چونک جاتا ہے۔

اور بات صرف مخالف جنس کی محبت تک محدود نہیں۔ لکڑیوں سے بنے ہوئے ان چھوٹے گھروں میں اپنی کاپی پر "جھیل، کشتی اور درخت" کی تصویر بنانے والا بچہ اپنے ماں کی اداسی کو دیکھ کر خط لکھنے لگتا ہے پردیس میں بسنے والے اپنے والد کو کہ:

"پیارے بابا!
جب شام ہو جاتی ہے تب ماں بہت اداس ہو جاتی ہے۔ تم کب آؤ گے------"

اگلے موسم کے وعدے پر جینے والے وہ لوگ اس موسم کے لیے خود کو تیار کر رہے ہیں جو ابھی آیا نہیں۔ صرف اس نے بادل بھیجے ہیں یہ اطلاع دینے کے لیے کہ برف باری دور نہیں۔ جب کڑکتی ہوئی بجلی پاگل عورت کی طرح اپنا سر پہاڑ سے ٹکراتی ہے تب سینے میں سسکتا ہوا دل جدائی کا ایک بے رحم موسم بتانے کے لیے خود کو تیار کرتا ہے۔ اس کے بعد دھیمی ہو جانے والی بارش پھر شدت کے ساتھ برسنے لگتی ہے اور بارش کی بوندیں رقص کرتے ہوئے پوچھنے لگتی ہے کہ:

"سہیلی! کیا تمہارے گھر میں مٹی کا تیل ہے؟
کیا ہم نے لکڑیاں اکٹھی کی ہیں؟
کیا تمہارے گھر میں آٹا ہے؟
نمک ہے؟ شکر ہے؟"

اور کوئی خاموشی سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے زیر لب کہتا ہے کہ:

"سب ہے
صرف وہ نہیں!!"

وہ جو محبت کے لیے ہر دن ایک جنگ کرتا ہے۔ کپڑا بیچتا ہے۔ چائے بناتا ہے۔ نان پکاتا ہے۔ پرانے جوتے فروخت کرتا ہے۔ اور چھریاں تیز کرتا ہے اور ان کی چنگاریوں کو دیکھ کر اسے اپنا وہ گاؤں بہت یاد آتا ہے جہاں سرد موسموں میں صرف آگ ہی نہیں بلکہ دل بھی جلتے ہیں!!

"محکمہ موسمیات کو کچھ پتہ نہیں" ان لوگوں کا پختہ یقین ہے۔ جن سے پہاڑوں کی ہوائیں باتیں کرتی ہیں۔ وہ جو بادلوں کی بولیاں سمجھتے ہیں۔ جو فطرت کے ہر اشارے کو ڈی کوڈ کر سکتے ہیں۔ جنہیں چشمے کے پانی کی ٹھنڈک بھی بتا سکتی ہے کہ برف باری ابھی کتنی دور نہیں؟

"برف باری ابھی زیادہ دور نہیں۔ صرف چند دنوں تک بارش ہوتی رہے گی اور پھر ایک رات کے کوکھ سے ایک ایسی صبح پھوٹے گی جو سفید ہوگی" ایک بوڑھا دادا اپنی پوتی کو پیار سے بتاتا ہے۔ ان وادیوں میں جہاں ابھی بارش ہو رہی ہے۔

جہاں جدائی کے موسم کا درد ابھی اشکوں کی طرح رواں ہے۔ جہاں ابھی برف نہیں گری۔ جہاں ابھی تک نوجوان گرم کپڑے پہننے سے انکار کر رہے ہیں۔ جہاں ابھی تک دل اور دیس کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ جہاں ابھی تک انتظار معجزے کا منتظر ہے۔

"ایسی صبح کیوں نہیں آتی؟
کہ میں دروازہ کھولوں
اور تم مسکراتے نظر آؤ"

طویل راتوں اور کٹھن دنوں والا موسم ابھی دور نہیں۔ بارش کے روپ میں وہ موسم دستک دے رہا صرف وادیوں کے راستوں پر ہی نہیں بلکہ ان دلوں کے دروازوں پر بھی جو بند نہیں ہوتے۔ جو تلوار جیسی یخ بستہ ہواؤں میں بھی کھلے رہتے ہیں۔

"یہ سرد ہوا دیکھو
ہاں آگ تو جلتی ہے
پر پیار جدا دیکھو"

برف باری کی کٹھن موسم پر ایک فیچر لکھنے والا صحافی صرف کابل میں نہیں بلکہ ڈھاکہ میں بھی حکومت سے یہ مطالبہ کرنے کے لیے مناسب الفاظ کو تلاش کر رہا ہے کہ "برف باری کے موسم سے پہلے حکومت مٹی کا تیل سستا کیوں نہیں کرتی؟"

ان وادیوں میں ایک کتاب لکھنے کے لیے کسی گمنام ہوٹل کے کمرے میں قیام کرنے والے سیاح سفید برف والے سرمئی دنوں میں اپنے لیپ ٹاپ پر یہ الفاظ ٹائپ کرتے ہیں کہ:

"اب اس وادی میں زندگی سو سی گئی ہے" مگر وہ نہیں جانتا کہ جب برف گرتی ہے تب انتظار اداسی کے شانے پر سر رکھ کر سوچنے لگتا ہے کہ:

"وعدے والے دنوں میں تو سب آتے ہیں
تم اب کیوں نہیں آتے؟

اب جب برف باری ہو رہی ہے
ہر کوئی اپنے کمبل کا قیدی بن گیا ہے
یہی تو موسم ہے زیادہ دیر تک ملنے کا؟"

مگر ان پہاڑوں میں بسنے والی پاگل لڑکیوں کو کون بتائے کہ محبت صرف اس غزل کا مکھڑا نہیں کہ:

"تنہا تنہا رونے کا
موسم ہے پاگل ہونے کا"

محبت صرف میلاپ نہیں۔ محبت وہ جدائی بھی ہے جو کونے میں رکھے ہوئے لالٹین کی طرح ساری رات جلتی رہتی ہے۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ کیوں کہ محبت ایک خوبصورت خاموشی بھی ہے!!

"محبت کیا ہے؟"
شہر کی لڑکی شاعر مزاج دوست سے ایس ایم ایس پر پوچھتی ہے۔

اور وہ جواب لکھنا بھول جاتا ہے۔ اسے یاد آنے لگتے ہیں وہ دن جب گھر سے نکل کر بہت دور تک جانے کے باوجود کوئی نہیں ملتا۔ سارے راستے برف سے بند ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھار نکلنے والا سورج برف پوش وادیوں کے کینوس پر وہ تصاویر بنانے لگتا ہے جو ہر لمحے تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ دن دور ہوتے ہوئے بھی زیادہ دور نہیں۔ ابھی تو بارش کی راتیں اور بارش کے دن ہیں۔ ابھی تو سیب کے درخت پر ایک بھیگا ہوا پرندہ پریشان بیٹھا ہے۔ ابھی تو انجیر کی شاخ کے سارے پتے ٹوٹ کر نہیں گرے۔ ابھی تو انار اس پشتو ٹپے کی یاد دلاتے ہیں کہ:

"میرے ہونٹ تیرے بوسوں کی وجہ سے سرخ ہو گئے ہیں
اب میں ماں سے کہوں گی کہ میں نے انار کھائے ہیں"

ابھی برف باری نہیں ہو رہی۔ ابھی بارش کا موسم ہے۔ بارش کے اس موسم میں بھیگنے والوں کو کیا پتہ کہ گرم موسم اور نرم مٹی والے سندھ دیس کے لوک گیتوں میں جب بارش ہوتی ہے اور محبت ایک بہانہ تراش کر روتی ہے تب کوئی دور دل جلا دور سے

گاتا ہے:

"آؤ بادل!
میں بھی روؤں
تو بھی رو
میں بھی دل کے داغ دھوؤں
تو بھی دھو۔۔۔۔!!"

سسی

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر شاہ لطیف اپنی شاعری جھیل میں نہ پھینکتے اور اس کو خود شایع کرواتے تو اپنے مجموعہ کلام کا نام کیا رکھتے؟

بڑا المیہ یہ نہیں کہ لطیف نے ایک اداس کیفیت میں آکر اپنی شاعری تعویذ کی طرح سندھ کے گلے میں ڈالنے کے بجائے پانی میں پانی کر دی۔

بڑا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کا کوئی نام نہیں رکھا۔ کیوں کہ ان کا کلام تو ہر اس فقیر کے دل میں گردش خون کی طرح موجزن تھا، جن کو لطیف "دوست" کہا کرتے تھے۔ اور یہ بہت بڑی بغاوت تھی۔ صرف اس وادی سندھ میں جہاں شاہ لطیف ایک مرشد دوست بن کر ابھرا۔ سندھ کی سید برادری میں تو ایک کہرام مچ گیا۔ ساری مسندیں ہل گئی۔ وہ مرشد جو خود کو "خاکی" نہیں بلکہ "نور" کا ظہور قرار دیا کرتا تھا۔ اس کلچر میں لطیف خاک نشینوں کے ساتھ دھرتی پر بیٹھ کر ایک پرامن بغاوت کے سر چھیڑا کرتا تھا۔

البرٹ کامو نے یہ بات اب کی ہے کہ:

Dont walk in front of me. I may not follow
Dont walk behind me. I may not lead.
Just walk beside me and be my friend.

یعنی: میرے آگے مت چلو۔ میں شاید تمہاری پیروی نہ کروں۔
میرے پیچھے مت آؤ۔ میں شاید تمہاری قیادت نہ کروں۔

میرے دوست بن کر شانہ بہ شانہ میرے ساتھ چلو۔

مگر لطیف نے یہ بات اس وقت کی جب مرشد اور مرید میں بڑا فاصلہ ہوا کرتا تھا اور یہ فاصلہ ابن العربی کے دمشق سے لیکر رومی کے قونیا تک قائم رہا مگر یہ سمٹا تو اس سندھ میں جہاں لطیف کے سر ایک نئے دور کی آمد کا سنکھ بن کر بجے۔ لطیف نے مرشد کے آگے سجدوں میں پڑے ہوئے سندھ کے سادہ لوح کسانوں اور مزدوروں سے کہا "اے خاک نشینوں اٹھ بیٹھو" یہ ایک بڑی بغاوت تھی۔ بہت بڑی بغاوت۔ جب وہ بدین کے ایک غریب چرواہے کی نوزائیدہ بچی کو اپنے لمبے اور پتلے ہاتھوں میں اٹھا کر اس کی بند آنکھوں کو دیر تک دیکھتے ہوئے اس کے باپ سے کہتے کہ "دوست! اس کا نام "وندر" رکھو" اور پھر اسے بڑی محبت کے ساتھ بتاتے کہ "کیا تم جانتے ہو کہ وندر کیا ہے؟ وندر اس راستے کا نام ہے جو کیچ کی طرف جاتا ہے۔ سسی اس راستے کی مسافر تھی۔ وندر محبت کا سنگ میل ہے۔ اس لیے اس کا نام وندر رکھو" پھر اسی گاؤں میں وہ برسوں کے بعد آتے اور پوچھتے "وندر کہاں ہے؟" اور سبز رنگ پر زرد رنگ کے پھول والی فراک پہنے ہوئی ایک پانچ برس کی بچی اپنے مرشد کے ساتھ لپٹ جاتی اور اس کا مرشد اس کی مقدس پیشانی کو چوم کر اس کی "رن" جیسی خاموش اور خوبصورت آنکھوں میں دیکھ کر کہتا "وندر! ہم دوست ہیں" اور پھر اپنی نم آنکھوں کی پلکیں جھپکا کر اس سے پیار کے ساتھ پوچھتا "ہیں نا!!؟" اس طرح ایک "جٹ" کی بیٹی لطیف کی دوست بن جاتی۔

لطیف کا مشن کیا تھا؟ سوائے سندھ میں دوستی کا نیٹ ورک بنانے کے!!

تو کیا لطیف سائیں اپنے مجموعہ کلام کا نام "دوستی" رکھتا؟

اگر لطیف عربی، فارسی اور سندھی کے لاکھوں الفاظ میں "دوستی" لفظ کا انتخاب کرتا تو یہ انتخاب بھی بہت خوبصورت ہوتا۔ یہی تو وہ بات تھی جس کی وجہ سے لطیف نے اپنے سارے سر وادی سندھ کی ان لوک کہانیوں کے حوالے سے تخلیق کیے جن میں مرکزی کردار ہمیشہ عورت ہی رہی ہے۔ کیوں کہ لطیف کو معلوم تھا کہ سوشل نیٹ ورکنگ صرف عورت کا آرٹ ہے۔ وفا کے دھاگوں سے بننے والے پیار کے اس

پیراہن کو صرف عورت ہی بن سکتی ہے۔ وہ عورت جو مومل بن کر اپنے محبوب کا انتظار اس طرح کرتی ہے کہ اس کا شبستاں شعلوں میں لپٹی ہوئی ایک چتا بن جائے۔ وہ عورت سروں پر سر دینے والے راجا کی رانی ہے۔ وہ عورت ایک خطا کا ازالہ بننے کے لیے آگ کا ایندھن بن جاتی ہے۔ وہ عورت جو اپنے محبوب کے لیے محل میں منتظر مورت بن جاتی ہے۔ وہ عورت جو بادشاہ کو غیر سمجھ کر اس کے زیوارت کو زنجیر قرار دیتی ہے۔ اور کہتی ہے "میں وہاں سے ہوں جہاں لڑکیوں کی کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں نہیں بلکہ کالے رنگ کے دھاگے لٹکتے ہیں" وہ ماروی۔ جس سے ایک وطن دوستی کی عظیم علامت وجود میں آئی۔ بہت حسین ہے شاید اس سوہنی سے بھی جو عشق میں بغاوت کرتے ہوئے سیاہ رات کا سرد دریا عبور کرتی ہے۔ مگر جو خوبصورتی اور خیال کا حسن شاہ لطیف نے سسی کے کردار میں بھرا ہے وہ اور کسی کردار کے حصے میں نہیں آیا۔ اس لیے لطیف نے تو اپنی ساری سورما عورتوں کو تو صرف ایک ایک سر دیا مگر انہوں نے سسی پر اپنے پانچ سر نچھاور کر دیے۔ لطیف نے اپنے اس کردار کے جتنے رخ، جتنے روپ اور جتنے رچاؤ بیان کیے ہیں وہ کسی اور عورت کے حوالے سے نہیں۔

شاید اس کا ایک سبب یہ تھا کہ سسی کے کردار میں وہ وسعت موجود تھی جو اور کسی کردار میں نہیں تھی۔ اور کردار بھی سرکش تھے مگر سسی صرف سرکش نہیں تھی۔ وہ حسین بھی تھی۔ مگر لطیف نے سسی کا وہ حسن نہیں بیان کیا جو سندھ کے وہ لوک شعراء بیان کرتے ہیں، جنہیں "سگھڑ" کہا جاتا ہے۔ سسی میں وہ حسن نہیں تھا جو سرخی اور پاؤڈر سے پیدا ہوتا ہے۔ سسی کے چہرے پر تو وہ حسن ابھرا جو سنگ لاخ پہاڑوں کے قریب جلتے ہوئے سورج کے سبب سورج مکھی کے پھول پر کھلتا ہے۔ اس لیے لطیف نے سسی کے حوالے سے لکھا تھا کہ:

"جو جلتی لو میں جھلس رہی ہے
سیج چڑھے گی وہ ہی سسی"

وہ سسی جو پنہوں کو صرف اپنا شریک حیات ہی نہیں بلکہ اپنا دوست بھی سمجھتی تھی۔ تبھی تو وہ ویرانوں میں روتے ہوئے گاتی رہی کہ:

"میرے دل کا دوست نہ چھینو مجھ سے"

اپنے حق کے لیے پر خطر جدوجہد میں تو شاہ لطیف کے سارے کردار کودتے ہیں مگر دوسرے کردار شروع سے سخت جاں تھے۔ جب کہ سسی نرم و نازک تھی۔ اسے کیچ مکران کا راستہ بھی معلوم نہ تھا۔ اس کو سب نے سمجھایا۔ سب نے ڈرایا۔ سب نے کہا کہ "تم ویرانے میں بھٹک جاؤ گی" مگر اس نے جواب دیا "کیچ کا راستہ مجھے درخت بھی بتائیں گے" جب اسے ڈراتے ہوئے کہا گیا کہ "اس سنسان بیابان میں تمہیں جانور کھا جائیں گے" تب سسی نے جواب دیا "اگر میرے جسم کا گوشت جانور کھائیں گے تو میری ہڈیاں بھی میرے محبوب کی طرف سفر کریں گی" اتنا عزم اتنا پختہ ارداہ اور اس قدر اعتماد لطیف کے کسی دوسرے کردار میں نہیں۔ اور وہ آہنی ارادہ سسی میں تب پیدا ہوا جب اسے پنہوں جیسا "دوست" ملا۔

ماہر نفسیات آج کہہ رہے ہیں۔ مگر لطیف نے یہ بات تین سو برس پہلے کہی۔ اس وقت جب سیکیاٹری ایک شعبہ نہیں بلکہ ایک شعبدہ سمجھی جاتی تھی۔ اس دور میں لطیف نے اپنے لوگوں کو بتایا کہ "عورت ہر مرد میں اپنا دوست تلاش کرتی ہے" یہ بات نٹشے نے بہت بعد میں کی۔ یورپ کے ذہین ترین فلسفی نے لکھا تھا کہ

"It is not a lack of love, but a lack of friendship that makes unhappy marriages." -

یعنی: شادیاں ناکام اس لیے نہیں ہوتیں کہ میاں بیوی میں محبت کی کمی ہوتی ہے۔ شادیاں اس لیے ناکام ہوتی ہیں کیوں کہ ان دونوں کے درمیاں دوستی نہیں ہوتی"

وہ سسی کا کردار موجودہ حالات میں کھو سا گیا ہے۔ عورت مرد بننے کی کوشش میں بے وفا بنتی جا رہی ہے۔ لطیف کی ساری شاعری اور کچھ بھی نہیں صرف وفا کی وکالت ہے۔ اور لطیف نے یہ بھی سمجھایا کہ وفا مرد کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایسا مرتبہ ہے جیسے مرد نہیں پا سکتا۔ صرف اس وجہ سے معاشرے بنے۔ معاشرے کی تعمیر سرمائے سے نہیں بنتی۔ معاشرہ دسیمنٹ اور کنکر سے نہیں بنتا۔ یہ اعتبار اور اس کی سب

سے اونچی منزل وفا سے بنتا ہے۔ وہ نیا شعور یہی ہے کہ عورت سسی کی طرح وفا کی علامت بنے۔ وہی بات جو اقبال نے کہی تھی:

"شعور تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا"

وہ تازہ شعور یہی ہے کہ "عورت مرد نہ بنے" وہ عورت ہی رہے۔ وفا کی مورت بن کر وہ جگمگاتی رہے۔ وہ جلتی رہے ایک قندیل کے مانند۔ اس کی لو ہواؤں سے لڑتی رہے۔ یہ وہی بات ہے جسے ایلٹن جان نے سروں سے سجاتے ہوئے عورت کی عظیم منزل کو آشکار کرتے ہوئے، ایک گیت گایا تھا، اور انہیں بتایا تھا کہ "جو عورت تیز آندھی میں جلتا ہوا چراغ ہوا کرتی ہے وہی ہیروئن ہوا کرتی ہے"

وہ ہیروئن کہاں ہے؟ یہ سماج اپنی سسی کو تلاش کر رہا ہے۔ اس کی سسی وہ نہیں جو اپنے نیم برہنہ فیشن پر اسٹینڈ لیتی ہے۔ وہ سسی دپیکا نہیں جس نے بھارتی میڈیا کو اس جملے سے ہلا کر رکھ دیا ہے کہ:

YES!I am a Woman.I have breasts AND a cleavage! You got a problem!!??

وہ سسی کینجھر کی لہروں سے کہتی ہے کہ میری پایل بنو۔ میں ہوا کے ساتھ رقص کرنا چاہتی ہوں۔ میں مکلی میں مدفون سارے شہداء سے عقیدت بھری محبت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔

سندھ کیا سوچ رہا ہے؟ کیا یہ بات کوئی حکومت سمجھ سکتی ہے؟ جو کبھی نہیں جان پائے گی سمندر کے کنارے بسنے والی لڑکیوں کا وہ محبوب گیت کے:

"اے دودا!! اتنی دیر؟ تمہاری دلہن انتظار کی آگ میں جل رہی ہے"

یہ گیت جس کے دل کو نہیں دھڑکاتا وہ نہیں جان سکتا کہ سسی کون تھی؟

سسی کل بھی تلاش کی علامت تھی اور آج بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کل سسی خود متلاشی تھی جب کہ آج سندھ اس سسی کو تلاش کر رہی ہے جو دھرتی کی غیرت ہے۔ جو اپنے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ وہ سسی جو رقص نہیں بلکہ

رزمگاہ زندگی میں ایک مستقل جنگ ہے۔ ایک مثالی عورت ہی مثالی معاشرے کو وجود میں لاسکتی ہے۔ مگر اس مثالی معاشرے کی تخلیق اور تعمیر کے لیے ہم اس سسی کو کہاں تلاش کریں؟

اسلام آباد کے ڈی چوک سے لیکر آزاد ماحول والے تعلیمی اداروں تک اور معمولی اجرت والے کراچی کے کارخانوں سے لیکر ان کھیتوں تک جن میں ان کسان عورتوں اور ان کے خاندانوں کے لیے صرف بھوک اگا کرتی ہے۔ گھروں میں غلاموں کی طرح دن رات کام کرنے اور تشدد برداشت کرنے کے باوجود مسکرا کر جینے والی ان عورتوں کے وسیع ترین وجود میں کہیں کھوئی ہوئی ہے شاہ لطیف کی وہ ہیروئن جو جب بھی ابھر آئے گی۔ اس دیس کی تقدیر بدل جائے گی۔ اور بوند بوند کو ترستی ہوئی یہ دھرتی ''ساون بھادوں'' کا سریلا گیت بن جائے گی!!

سونے جیسا دریائے سندھ

پنجاب کے ہزاروں گاؤں بہانے کے بعد سیلابی ریلہ اس دریائے سندھ میں داخل ہو گیا ہے جس کے لیے قدیم ہندی شاعر کالی داس نے اپنے مشہور اور منظوم ڈرامے ''میگھ دوت'' میں لکھا تھا کہ:

''پہاڑوں سے اونچا اڑنے کے بعد
تم تھک تو ضرور گئے ہو گے
اس لیے اے میگھ!
اپنے سرمئی پنکھ پھیلاؤ
اس وادی میں اتر جاؤ
جس کا نام سندھ ہے!
اس نیند میں ڈوبی حسینہ
کے گلے میں تمہیں
نظر آئے گی اک
موتیوں کی لڑی
ہے نام جس کا سندھو ندی!''

وہ موتیوں کی لڑی اگر باڑھ میں بکھر نہ جائے تو اس کا سیلابی حسن ''ٹی ایس ایلیٹ'' کی نظم سے زیادہ دلکش دکھائی دیتا ہے۔

وہ ندی جو ہمالیہ کی بیٹی ہے۔ جو پہاڑوں پر جمی ہوئی برف کے بطن سے جنم لیتی ہے اور سمندر کی طرف سفر کرتی ہے۔ پنجاب کی دھرتی پر تیزی سے بہتی ہوئی یہ ندی جب سرائیکی دیس میں داخل ہوتی ہے تو سرائیکی زبان کی طرح اس کی چال مدھم ہوتی جاتی ہے۔ پھر اس کی رفتار خواجہ فرید کے سروں میں ڈھل جاتی ہے۔ ثریا ملتانیکر کی کافی بن کر کسی کو صدائیں دیتی آگے چلتی ہے۔ پنجند پر پتوار چلاتے ہوئے ملاح ڈولتی ہوئی کشتی میں بیٹھے ڈوبتے ہوئے سورج کے رنگین سائے تلے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف جاتے ہوئے گاتے ہیں:

''ڈاچی والیا موڑ مہاڑ وے''

ملاح کے لہجے میں دریائے سندھ کی روانی آجاتی ہے یا دریائے سندھ اس کافی کے سروں پر رقص کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب ابھی تک کسی کو نہیں مل پایا۔ مگر بات سوال اور جواب کی نہیں۔ عشق کے امتحان میں ایسے سوالات کے جوابات نہیں دیے جاتے۔ بس سنا جاتا ہے۔ سن کر خاموشی سے مسکرایا جاتا ہے اور اس مسکراہٹ میں بھی کچھ وہ درد و الم ہوا کرتا ہے جو اس سرائیکی زبان میں ہے، جس کے بولنے والے کسی کونے میں چھپ کر نہیں بلکہ چنڑے پدھر پر دل لٹوانے کے لیے چلے آتے ہیں۔ وہ روہی کی راتیں جن کی آنکھوں میں صرف ریت بھری ہوتی ہے ان تک بھی مہک آتی ہے اس محبت کی جو دریائے سندھ میں نامعلوم منزل کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ وہ لہریں جن پر کونج کرلاتی ہے۔ ان میں صرف تبت کے پہاڑوں کی ہی نہیں بلکہ کشمیر کی دوشیزاؤں اور پنجاب کی مٹیارنوں کی مہک ہوا کرتی ہے۔ اپنے سینے میں تاریخ کا درد سما کر جب دریائے سندھ اس وادی میں داخل ہوتا ہے تو اس کی چنچلتا ختم ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس ندی کا روپ ایسا نظر آتا ہے جیسے سسی تھک کر کسی کیکٹس کے سائے میں بیٹھ گئی ہو یا سوہنی گھڑا توڑ کر دل پر تیرنے کے بارے میں سوچ رہی ہو!! اس وقت نیلے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے ان دونوں سے کہتے ہیں کہ ''کہاں ہے پنہوں؟ کیسا مہیوال؟ محبت اپنی ذات میں تلاش مسلسل ہے'' یہ دھرتی جو تاریخ میں کبھی غلطی سے کبھی نہیں مسکرائی اس کے سینے پر بہتا ہوا دریائے سندھ تصوف کی موسیقی سے بھر جاتا

ہے مگر وہ تصوف رہبانیت کی راہ پر نہیں چلتا۔ وہ تصوف اپنے ملاحوں کے بچوں کے سانولے رخساروں پر مسرت کی میٹھی روشنی جلا کر ان کسانوں کی کٹیاؤں کا پتہ پوچھتا ہے جن میں رہنے والے ابر کو تکتے ہوئے تھک جاتے ہیں۔ دریائے سندھ ان کے کھیتوں کو سیر اب کرنے کے لیے آتا ہے اور ان کے درد اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے اس ساگر کی اور جو کائنات کے آنسوؤں سے وجود میں آیا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نمکین اور نیلا سمندر اپنی پر اسرار گہرائیوں میں انسانوں کے سارے درد دفن کرلیتا ہے۔ اس طرح ایک ندی کی یاترا اپنے سفر کو مکمل سمجھتی ہے اور اس کی فنا بقا میں بدل جاتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ تب ہوتا ہے جب دریا میں سیلابی ریلہ بندوں کو نہیں توڑتا۔ موسم کی جوانی اس کے ہر انگ میں جلتی ہے اور اس کی ہر لہر مچلتی ہے مگر وہ مٹی کے بندوں کی بانہوں کا گھیرا نہیں توڑتا۔ وہ اپنی سرکشی سے انسانی تہذیب کے عظیم اصولوں کو ملیامیٹ کرنے سے باز رہتا ہے۔ جب دریا نسانوں کے لیے عذاب کا روپ نہیں اپناتا تب اس کا وجود اس محبت کی علامت بنا رہتا ہے جو تہذیب کو ماں کی آغوش میسر کرتی ہے۔ ایسے دریا کے لیے تو اس کے کنارے بسنے والی دیہاتی دوشیزائیں لوک گیت گاتی ہیں۔ اسے اپنے سروں میں سماتی ہیں۔ کبھی کبھی اپنے پیار کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے اس کی قسم بھی اٹھاتی ہیں۔ مگر اس وقت وہ محبت سے بھری ہوئی عقیدت دہشت میں تبدیل ہو جاتی ہے جب دانا انسان جیسا دریا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ بندوں کو توڑتا ہے۔ جب وہ انسانی بسیتوں کو بنیادوں سے اکھاڑ کر تنکوں کی طرح بہا دیتا ہے۔ اس وقت دریا غضبناک ہو کر شور و غل مچاتا ہے۔ دریا کی یہ صورت دیکھ کر ان انسانوں کے دل دہل جاتے ہیں جو اس راز سے آشکار ہوا کرتے ہیں کہ فطرت کی طاقت کے سامنے انسان بے بس ہے۔

دریا کے اس بھیانک روپ سے ڈر کر اس دیس میں بسنے والوں نے دریائے سندھ کا ایک الگ نام بھی رکھا ہے۔ وہ اسے ''مہران'' کہتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے ''مہر لانے والا'' کیوں کہ ان لوگوں کو نسل در نسل دریا کے قہر کا علم ہے۔ جب دریا قہر کا روپ، اختیار کرتا ہے تو زندگی کے لیے زہر بن جاتا ہے۔ انسان دریا کے قہر سے بچنے کے لیے

اس کے بند مضبوط کرتے ہیں مگر جب دریا دیوانگی کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے تب وہ ہر چیز کو طوفانی طاقت سے تباہ کر دیتا ہے۔ ماضی میں یہ دریا تو کشتیوں کو ٹکڑے کر دیتا تھا مگر موجودہ دور میں اس کی خوفناک لہروں میں فولادی گاڑیوں اور بھاری بھر کم بلڈوزروں کو بھی گھاس پھونس کی طرح ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھا گیا ہے۔ اس لیے وادی سندھ کے لوگ زمانہ قدیم سے اپنی دھرتی پر بہتے ہوئے دریا کو "مہران" بلاتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ یہ سیلاب کے موسم میں کوئی بڑا نقصان کیے بغیر گذر جائے۔

اس حقیقت کو اس دیس کے لوگ صدیوں سے جانتے ہیں کہ اگر دریائے سندھ سیلاب کے موسم میں تباہی کا سبب نہ بنے تو پھر وہ سیلابی ریلہ اس دھرتی کو اتنا زرخیز بنا دیتا ہے کہ موسم گرما کے آخری موڑ پر ویران وادیاں لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ غربت کی تصویر بنے ہوئے گاؤں گیہوں کی مہک سے بھر جاتے ہیں۔ دور سے اپنے ننھے چراغوں کی معرفت محبت کے مسکن کا پتہ دینے والے وہ دیہات اجنبی مسافروں کو خاموشی سے بلاتے ہیں۔ دیہاتی شامیں اجرک کی طرح لہراتے ہوئے انہیں اپنے پاس بلاتی ہیں اور انہیں منت کرتی ہیں کہ "بارش میں بھیگی ہوئی یہ رات یہاں بسر کریں۔ دیکھیں چولہے میں آگ جل اٹھی ہے اور توے پر گرم روٹی پکنے والی ہے" جب رات کی بارش رک جاتی اور دھلا ہوا چاند صاف و شفاف آسمان پر دلہن کے ٹیکہ کی طرح چمکنے لگتا ہے تب بانسری کی سریلی تانوں پر عوامی محبت سے بھری ہوئی موسیقی انسانی دکھ میں پنہاں سکھ کے چہرے سے گھونگھٹ اتارتی ہے اور ایک دیہاتی فنکار ان پرندوں کی منظوم کہانی گانے لگتا ہے جو ایک دوسرے سے بچھڑ گئے مگر پھر موسم کی ہواؤں پر وہ آپس میں مل گئے۔ محبت صرف جدائی کی جلتی ہوئی آگ نہیں۔ یہ ملاقات کے دوراں آنکھوں سے برسنے والی مسرت بھری گھٹا بھی ہے۔ اور یہ دریا صرف وادی سندھ میں مہمانوں کے استقبال کا باعث نہیں بنتے بلکہ جب دریا کے سیلابی ریلے سلامتی سے سمندر کی طرف لے جاتے ہیں اور اپنے کناروں پر بسنے والے انسانوں کو خوشیوں کی سوغاتیں دے جاتے ہیں تب نئے رشتے وجود میں آتے ہیں۔

بڑے ہو جانے والے بچوں کی ہتھیلیاں مہندی سے مہک جاتی ہیں۔ اس طرح زندگی کا سفر نئے مسافروں کو نئی منزلوں سے آشنا کرتا ہے۔ موسم گرما میں آنے والا سیلابی ریلہ موسم سرما کے دوران خوشحالی کے انبار دے جاتا ہے۔ سیلابی ریلے میں بہہ کر آنے والی لکڑیوں کو سردیوں میں ہونے والی شادیوں کی محفلوں میں جلایا جاتا ہے۔ ان شادیوں میں صرف نئے رشتے وجود میں نہیں آتے بلکہ پرانے پیار بھی فراق کی مٹی کو آنسوؤں سے دھونے کے بعد انہیں پھر سے نیا بنا دیتے ہیں۔ اور روٹھے ہوئے رشتہ داروں کے انتظار میں رات ڈھلے اپنوں کی راہ دیکھنے والی لڑکی دبے سروں میں گاتی ہے:

”محبت کی اس مقتول کو
اپنے ہاتھوں سے دفن کرو
میرے پیارو!!“

مگر اس دکھ میں بھی ایک سکھ ہوتا ہے۔ کیوں کہ کم از کم محبت اظہار تو کرتی ہے اور یہ سب کچھ دریائے سندھ کی لہروں میں آنے والی خوشحالی کے باعث ہوتا ہے جو جب بھی سیلابی موسم میں بہتا ہے تب دل خوف اور امید کے درمیاں کبھی آہستہ اور کبھی تیز دھڑکتے ہیں اور دعاؤں کی صورت کہتے ہیں کہ ”اے دریائے سندھ ہمارے لیے امن اور سلامتی کا سبب بن“ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دریا ان کی زبان جانتا ہے۔ دریا سے اپنی مادری زباں میں محو گفتگو رہنے والے یہ لوگ آج پانی کے منتظر بھی ہیں اور خوف کا شکار بھی۔ اگر اس بار بھی دریا ان کے لیے چار برس قبل والا قہر کا پیغام لایا تو پھر یہ دوسرا زخم سہنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ کیوں کہ چار برس قبل آنے والے سیلاب کا پانی تو ایک برس میں سوکھ گیا مگر سیلاب کی وجہ سے بچھڑنے والوں کی یاد میں بہتے ہوئے آنسوؤں کا پانی ان آنکھوں میں اب تک موجود ہے جن آنکھوں نے اپنا سب کچھ اس طرح ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا جس طرح اس بار اہلیان پنجاب نے دیکھا ہے۔

وادی سندھ کے دیہی علاقوں میں بسنے والے لوگ اپنی قدیم روایات کا حوالہ دیتے ہوئے ایک دوسرے سے کہہ تو رہے ہیں کہ ”دریا ایک موسم میں صرف ایک دیس پر لہروں کے وار کرتا ہے۔ اب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہو گا اور وہ اس بار ہماری دھرتی

پر اپنے مہر والا مسافر بن کر گذر جائے گا مگر دریا دیوانہ بھی تو ہے اور ہمارے حکمرانوں کی نااہلی مزید ثبوتوں کی محتاج نہیں ہے۔ اس لیے اس بار وہ حکمرانوں کے بجائے اس دریائے سندھ سے مخاطب ہیں جو اپنی لہروں میں پہاڑوں کی پوری طاقت سما کر اس دھرتی میں داخل ہونے والا ہے جس دھرتی سے اس دریا کا عشق تہذیب کی عظیم پریم کہانی کے۔ دریا کے کنارے پر جنم لینے والی یہ تہذیب بھی اس ملاح کی بیٹی کی طرح ہے جس کے بارے میں سندھی زبان کی عوامی کہاوت ہے کہ "نمکین پانی اور مچھیرن کے دل کی گہرائی ناپی نہیں جا سکتی" وہ تہذیب جس کے لیے دریائے سندھ شیر مادر جیسی لہروں کو لاتا رہا ہے مگر کبھی کبھی یہ دریا ایسا اژدھا بھی بن جاتا ہے جو اپنے بچے خود نگل جاتا ہے۔ اس لیے اپنی پوری محبت اور دریا کی تمام تر دہشت کو ایک ساتھ سینے میں سمانے والا سندھ دریا کی تعریف میں تخلیق ہونے والے گیت بھی گا رہا ہے اور دعائیں بھی مانگ رہا ہے وہ یہ سیلابی ریلہ سلامتی سے گذر جائے۔ اور یہ دریا ان انسانوں کی صدائیں سن رہا ہے جو پگھلے ہوئے سونے کی طرح ابلتا اور مچلتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر یہ دریائے سندھ کمزور بانہوں جیسے بندوں کے درمیاں ہی رہا تو پھر سیاہ دھاگوں والے کانوں میں سونے کی بالیاں لہرائیں گی اور اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر سندھ سوہنی کی آخری صدا بن جائے گا!!

ایک تھی انیتا

"اب او جھا میں کون آئے گا؟ ہمارا وارڈ ایک عظیم نفسیاتی معالج سے محروم ہو گیا۔ کون دیکھتا ہے ٹی بی کے مریضوں کو!!!؟"

یہ الفاظ تھے اس ڈاکٹر سیف کے جو ڈاؤ انٹر نیشنل میڈیکل یونیورسٹی کے چیسٹ وارڈ کا نفیس اور نہایت محنت کش ڈاکٹر ہے۔

وہ ڈاکٹر سیف جو انیتا کا آخری معالج تھا۔ جس کو معلوم تھا کہ یتیم بچے جیسی انسانیت کے ساتھ ماں جیسی محبت کرنے والی ڈاکٹر انیتا کا دل دھڑک نہیں رہا مگر کسی بسمل پرندے کی مانند تڑپ رہا ہے۔ مگر وہ پھر بھی اپنے مریضوں کو آخری دن تک دیکھتی رہی۔ ان سے پوچھتی رہی کہ "آپ کی پریشانی اب کیسی ہے؟ اب نیند کیسی آتی ہے؟۔۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے۔ اب میں نیند کی گولی ذرا کم کر دیتی ہوں۔ اب آپ رات کو سونے سے قبل اچھی سی واک کر لیا کریں" اس طرح کی باتیں کیا کرتی تھی وہ انیتا جو آخری دنوں کے دوران تو سہارے کے سوا چل نہیں پاتی تھی۔ جو اس سرزمین کی طرح بڑی تکلیف کے ساتھ سانس لیا کرتی تھی اور اسے ساری رات نیند نہیں آیا کرتی تھی۔ مگر صبح کو پھر وہی ایک سلائیس ایک چائے کا کپ اور وہی مریض!!

وہ مریضوں کو دیکھتے ہوئے مر گئی۔ اس نے ایک دن کے لیے میڈیکل لیو نہیں لی۔ اس نے اپنے پرنسپل کو یہ تک نہیں بتایا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے! کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ ایک شفیق انسان ہیں۔ وہ اسے کام کرنے نہیں دینگے۔ جب کہ وہ کام کرتے ہوئے

اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتی تھی۔ اور کام کرتے ہوئے اس دنیا سے چلی گئی!

وہ عورت اب دنیا میں موجود نہیں جو چوالیس برس میں بھی ایک لڑکی کی طرح نظر آتی تھی۔ جس کے پرس میں میک اپ تو کیا لپ اسٹک تک نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس کا پرس اب بھی میرے سامنے موجود ہے جس میں ایک ہیئر برش اور ایک موبائل فون کے علاوہ پیناڈول کے خالی پتے اور میڈیکل کے کاغذات بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ ساری زندگی بخار اور تھکاوٹ کی گولیاں کھاتی اور کام کرتی رہی۔ مگر کیا انیتا صرف مسلسل محنت اور میڈیکل میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کا نام تھی؟ وہ سادہ سی لڑکی جس نے کبھی فرمائشی کھانے نہیں بنوائے۔ جس نے برینڈز کے لباس نہیں خریدے۔ جس کو جیولری کا شوق نہ تھا۔ جس کو یہ شوق نہ تھا کہ وہ دبئی جائے اور وہاں کے مشہور شاپنگ مالز میں تصاویر بنوائے اور انہیں فیس بک پر اپ لوڈ کرے۔ اس نے پوری زندگی سوشل میڈیا پر اپنی کوئی تصویر نہیں رکھی۔ وہ اپنے فیس بک کو بھی صرف رابطوں کے لیے استعمال کرتی تھی اور جب ملک میں دہشتگردی کی کوئی بڑا سانحہ ہو جاتا تو وہ ایک سرخ گلاب کی تصویر کو اپنی پروفائل پک بنا لیتی!!

مگر کیا انیتا صرف یہی کچھ تھی؟

دو ہفتے قبل ڈھلتے ہوئے سورج کے وقت طبہ ہارٹ ہاسپیٹل میں اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے جن دو آنکھوں کو بند کیا تھا ان آنکھوں میں میں نے ایک عورت کو نہیں بلکہ ایک دیس، ایک دنیا، ایک کائنات کو دیکھا تھا۔ وہ دو آنکھیں جن میں اس نے کبھی کاجل نہیں لگایا مگر وہ عرب صحراؤں میں وحشی غزال جیسی سیاہ آنکھیں تھی۔ ان آنکھوں میں صرف بھٹ شاہ پر طلوع آفتاب کے خوبصورت منظر نہ تھا بلکہ جامشورو کی حسین شاموں کے سارے خوبصورت اور غمگین شفق ان آنکھوں میں سمٹ آتے تھے۔ وہ آنکھیں جن میں کبھی دریا کنارے سنسناتی ہوئی سیاہ رات کے عکس لہراتے تھے تو کبھی مون سون کے گرجتے اور برستے بادل ایک دوسرے کے قریب آ کر اگست کے صبحوں کو گہری شام کا روپ دیا کرتے تھے۔ وہ آنکھیں کبھی ستاروں کی مانند تو کبھی چراغوں کی طرح امید اور حوصلے کا پیغام دیا کرتی تھیں۔ خاموش ہوتے ہوئے بھی وہ دو بولتی ہوئی آنکھیں اس شام خاموش ہو گئیں، جس شام انیتا ایک

انسان سے ایک ستارہ بن گئی۔ موہوم مسکراہٹ والا وہ ستارہ جس کو میں اب اداسی سے بھری نظروں سے دیکھا کروں گا۔

ہم نے ایک زندگی ایک ساتھ گزاری۔ جب وہ مجھ سے ملی تھی تب اس کی عمر چودہ برس تھی۔ مگر اس عمر میں خوبصورت آنکھوں والی وہ لڑکی سندھی اور اردو کا منتخب اور معیاری ادب کا مطالعہ کر چکی تھی۔ جن دنوں ہماری ملاقات ہوئی ان دنوں وہ روسی ادب پڑھ رہی تھی اور میکسم گورکی سے زیادہ اسے دوستووسکی کی تحریریں پسند تھیں۔ وہ چیخوف کے افسانوں کو شوق سے پڑھا کرتی مگر اسے پشکن کی شاعری زیادہ اچھی لگتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ ”شاعری صرف بے قابو جذبات کا بہاؤ نہیں ہونی چاہیئے۔ شاعری تو ایک کشتی ہے۔ اس کی ایک منزل ہونی چاہیئے۔ وہ علم اور داناہی کے بادبانوں کے ساتھ اپنے رخ اور رفتار کا تعین کرے تو اچھا ہے“ میں اس سے پوچھا کرتا کہ ایسا کون سا شاعر ہے جس میں یہ دونوں باتیں ہوں؟ تو وہ مسکرا کر کہتی ”اقبال اور فیض“ اور یہ جواب دینے کے بعد ہنس کر کہتی کہ ”یہ دونوں بہت سینسیبل شاعر ہیں مگر ان میں وہ شوخی نہیں جو غالب میں ہے“ وہ غالب کی بڑی مداح تھی۔ وہ اپنی خوبصورت آواز اور مخصوص انداز میں غالب کا یہ شعر پڑھتی کہ:

”ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں“

مگر اس کو شاہ لطیف سے بہت محبت تھی۔ لطیف کا ”سمندری داستان“ تو اس کا فیورٹ تھا۔ زندگی کو پراسرا اور گہرا سمندر سمجھنے والی لڑکی بذات خود ایک سمندر تھی۔ وہ سمندر جو اچانک مجھے سطح مریخ بنا گیا۔ اور میں اب تک حیران ہوں کہ انیتا کہاں گئی؟ تیس برس کے دوراں ہم اتنے دن کبھی دور نہیں ہوئے۔ اس وقت بھی گھر کی ہر چیز وہیں پر ہے جہاں انیتا چھوڑ گئی تھی مگر پھر بھی یوں لگتا ہے کہ اب اس گھر کی دیواریں سانس نہیں لے رہیں۔

وہ اپنی خوبصورت اور باذوق ماں کی طرح موسیقی کی رسیا تھی۔ اس کی آواز بہت میٹھی تھی۔ وہ خود بھی بہت اچھا گاتی تھی۔ وہ مجھے اپنے مدھر آواز میں سندھی اور پنجابی لوک گیت سناتی تھی۔ اس کو انگریزی گانے بھی اچھے لگتے تھے۔ وہ نوے کی ابتدا میں

وہ یہ انگریزی گانا بار بار سنا کرتی تھی کہ "ہیلو! کیا تم مجھے تلاش کر رہے ہو" آج وہ گیت میری سماعتوں میں گونج رہا ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ میری زندگی میں صرف اس لیے آئی تاکہ میں میں اسے مسلسل تلاش کرتا رہوں۔

اس کا والد ایک دانشور سیاستدان اور اس کی ماں سندھی زبان کی مشہور افسانہ نگار اور اس کی نانی سندھی ادب کی پہلی ناول نگار خاتون اور اس کا ماموں کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر تھا۔ مگر وہ خاندانی تعارف کو ناپسند کیا کرتی تھی۔ اس نے ڈاکٹر بننے کے بعد اپنے نام سے میرے نام کو جوڑا تو وہ بھی صرف محبت کی وجہ سے! حالانکہ وہ ایک ذہین فیمینسٹ تھی۔ مگر اسے ان خواتین سے مل کر افسوس ہوتا جو فیمینزم کو فیشن کی طرح اپناتی ہیں۔

جب وہ مجھ سے ملی تھی تب بھی اس کو سانس لینے میں تکلیف ہوا کرتی تھی۔ ہماری شادی 1987 میں ہوئی اور تین برس کے بعد اس کے دل کا آپریشن ہوا۔ اس وقت ہمارا پہلا بیٹا سارنگ صرف دو برس کا تھا۔ جب انیتا آپریشن کے لیے این آئی سی وی ڈی میں داخل تھی اس وقت وہاں پر سندھی زبان کا عظیم شاعر شیخ ایاز زیر علاج تھا۔ آپریشن سے ایک دن قبل میں اسے ویل چیئر پر بٹھا کر شیخ ایاز کے پاس لے گیا۔ اور میں نے ان سے کہا کہ "آج میں ایک شاعر کے پاس نہیں بلکہ اپنے بزرگ کے پاس آیا ہوں۔ کل انیتا کا آپریشن ہو رہا ہے۔ میں یہاں بالکل تنہا ہوں۔ آپ اسے دعا دیں" میری بات سن کر شیخ ایاز کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور پھر انیتا کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہنے لگے "بیٹا تم بے فکر ہو کر آپریشن کراؤ۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا" جب ہم جانے لگے تب انہوں نے مجھے پیچھے سے آواز دی میں رک گیا اور انہوں نے کہا کہ جب آپریشن ہو جائے تب مجھ سے ضرور ملنے آنا۔ میں نے کہا ضرور! اور پھر کامیاب آپریشن کے چار دن بعد جب انیتا کو میں ویل چیئر پر بٹھا کر شیخ ایاز کے پاس لے گیا تب انیتا بہت خوش تھی۔ اس نے شیخ ایاز سے کہا کہ "میں آپ کی دعا سے ٹھیک ہو گئی ہوں" شیخ ایاز کی آنکھوں میں جذباتی نمی چمک رہی تھی۔ انہوں نے کہا "بیٹا! میں نے اپنی پوری زندگی میں خدا سے کبھی دعا نہیں مانگی۔ یہ میری پہلی دعا تھی۔ اس دعا کی قبول نہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا" پھر انہوں نے یہ پورا قصہ اپنی کتاب

میں لکھا تھا۔ اس بار جب انیتا زندگی اور موت کے درمیاں ڈول رہی تھی تب میں ان ہاتھوں کو تلاش کر رہا تھا جو خدا کی بار گاہ میں پہلی بار بلند ہوں!!

وہ ہاتھ میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئے جو بہت نرم اور ملایم تھے۔ جن میں بہت کم طاقت تھی۔ مگر ان ہاتھوں نے زندگی کا پورا بوجھ اٹھایا۔ ان ہاتھوں نے صرف میڈیکل کی بھاری کتابیں نہیں کھولیں۔ وہ ہاتھ پورے گھر کی صفائی کرتے۔ جب باورچی نہیں آتا تو کچن میں ہفتے کا سب سے لذیذ کھانا پکاتے۔ وہ ہاتھ صرف ٹی وی کا ریموٹ پکڑ کر ''گیم آف تھرونز'' نہیں چلاتے۔ بلکہ وہ ہاتھ میرے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹتے۔ میری کتابوں اور نوٹس کو سیٹ کرتے۔ ان ہاتھوں سے اس نے صرف اپنے کانوں میں چاندی کی بالیاں نہیں پہنیں۔ ان ہاتھوں نے اپنی بیمار ماں کی خدمت کی۔ مجھ جیسے اینٹی سوشل شخص کو سارے خاندان سے جوڑ کر رکھا۔ ان ہاتھوں نے صرف لیپ ٹاپ پر اسائمنٹس اور پریزنٹیشنس نہیں بنائیں۔ ان ہاتھوں نے اپنے دو بیٹوں کو پال پوس کر بڑا کیا اور چند روز قبل جب وہ کراچی میں میرے چھوٹے بھائی کے گھر گئی تب اس کے چھوٹے بیٹے نے اسے بانہوں میں اٹھا کر اوپر تک پہنچایا۔ تب اس نے مجھے مسکرا کر کہا کہ ''اعجاز دیکھو میں نے تمہارے چھوٹے بیٹے کو بھی اب اتنا بڑا کر دیا ہے کہ اب وہ مجھے گود میں اٹھا کر اوپر لے آیا ہے۔ اب تو مجھے اجازت دو میں جاؤں۔ اس آدھے سانس سے زندگی کا اتنا لمبا سفر کرتے ہوئے میں تھک گئی ہوں'' ابھی چند دنوں کی بات ہے جب میں اس کی نبض دیکھ رہا تھا تب اس نے مجھے کہا تھا کہ ''کتنا مشکل ہے دل کا چلنا اور کتنا آسان ہے اس کا رک جانا۔ یہ میرا دل رک کیوں نہیں جاتا؟'' اور وہ دل 23 مارچ کی دوپہر کو رک گیا جس دل میں نیکی اور محبت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اس کے ہوتے ہوئے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ ہماری ساری مسکراہٹیں اور خوشیاں اس کے دم سے ہیں۔ میں اسے کہا کرتا تھا کہ تم لڑکی نہیں محبت کی مچھلی ہو۔ تم پیار کے پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ انیتا محبت کی مچھلی نہیں بلکہ محبت کی ندی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے جانے کے بعد جدائی کی ریت پر میرا دل جل بن مچھلی کی طرح کیوں تڑپتا؟



اعجاز منگی کی باتیں......

★ سندھ ایک سسکی ہے۔

★ سندھ وہ سانحہ ہے جس کا سوگ بھی نہیں منایا جاتا۔

★ عورت اور آنسو ایک سکے کے دو رُخ ہیں۔

★ خوشبو ایک خاموش گفتگو کا نام ہے۔

★ جب عقل لاحاصل عشق بن جاتی ہے تب عقیدے کا جنم ہوا کرتا ہے۔

★ زندگی صرف ایک رومانوی داستان نہیں، حیات کے تقاضے بہت تلخ ہیں۔

★ وقت ایک کاکروچ کی طرح یاداشت کی رنگین تصویر کو کترتا رہتا ہے۔

★ اَدب تو دل کی دستاویز ہوا کرتا ہے۔

★ زخم روح کی شاخ پر مہکتے ہوئے پھول ہیں۔

★ جس میں جدائی نہ ہو وہ پشتو شاعری نہیں ہو سکتی۔

★ اب تو شامیں بریکنگ نیوز بن گئی ہیں اور راتیں ٹاک شوز۔

★ غم اور خوشی وہ دو پَر ہیں جن کے سہارے پرندۂ حیات دیر تر اُڑ سکتا ہے اور دور تک جا سکتا ہے۔

امبر پبلیکیشنز کراچی
AMBER PUBLICATIONS